اردو شرح

انوار الباری
صحیح البخاری

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)
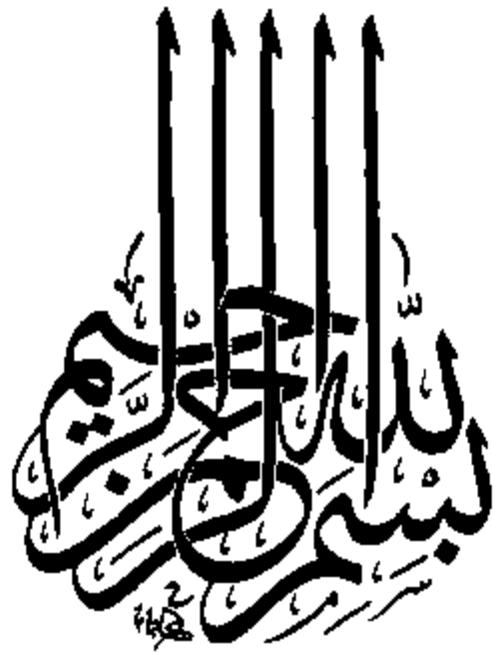
انوار الباری ۱۲

اردو شرح

صحیح البخاری

پیش لفظ

باسمہ تعالیٰ جل ذکرہٗ:۔گزارش ہے کہ انوارالباری کی بارھویں قسط ہدیہ ناظرین ہے،جس طرح سابق جلد میں حدیثِ بخاری معراج نبوی کے تحت ''معراج اعظم'' کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان ہوئے تھے،اس جلد میں حدیثِ بخاری ''وافقت ربی فی ثلاث'' کے تحت محدّثِ امتِ محمدیہ ''فاروق اعظم'' سیدنا حضرت عمرؓ کے علمی،دینی وسیاسی کارناموں کا تعارف کسی قدر تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

دین وسیاست کا اٹوٹ رشتہ

جس طرح دین کو سیاست سے الگ کردیں تو وہ چنگیزیت وفسطائیت ہوجاتی ہے،اسی طرح اگر سیاست کو دین سے جدا کردیں تو رہبانیت بن جاتی ہے،اس لئے زعماءِ ملت وعلماءِ امت کا اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ نہ صرف دونوں کے مستحکم رشتہ کو شکست وریخت سے بچائیں بلکہ اس کے استحکام کے لئے اپنی پوری جدوجہد صرف کریں۔تمام انبیاء علیہم السلام اور خاص طور سے سرورِ انبیاء محمد ﷺ اور آپ کے متبعین برگزیدہ زعماء وعلماءِ اور خیارِ امت،نے ادائیگی عبادات وطاعات کے ساتھ اعلاءِ کلمۃ اللہ کا فرض بھی پوری طرح ادا کیا ہے،اور یہ فرض قیام قیامت تک باقی رہے گا،افرادِ امتِ محمدیہ میں سے کوئی فرد بھی کسی وقت اور کسی جگہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا،،

''دیارِ اسلام'' میں چونکہ مسلمانوں کو قوتِ وشوکت حاصل ہوتی ہے اور وہاں ان کے اموال وانفس کے لئے شرعاً ذبل عصمت مقومہ ومؤثمہ کا امتیاز مل جاتا ہے،اس لئے ان کی ذمہ داری بھی زیادہ ضرور ہے مگر ''دیارِ حرب'' کے بسنے والے مسلمانوں کو بھی حق تعالیٰ نے عصمت مؤثمہ سے ضرور نوازا ہے،اس لئے اصلِ فرض سے غفلت وہ بھی نہیں برت سکتے۔

''اسلام'' حقوق انسانیت کا نگہبانِ اعظم ہے،وہ ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھتا ہے کہ وہ دنیا میں باعزت زندگی گزارے،اور اپنے معاشی،سماجی،وسیاسی حقوق حاصل کرے اور اپنے دینی ومذہبی نظریات وافکار میں پوری طرح آزاد ہو،اگر کسی ایک انسان کے بھی حقوقِ انسانیت پر زد پڑتی ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس ظلم کو دور کریں اور کرائیں،جب یہ فرض عام انسانوں کے لئے ہے تو مسلمانوں پر بسبب فرضیت اعلاءِ کلمۃ اللہ اور بھی ضروری ہے کہ وہ اس فریضہ کی طرف زیادہ توجہ کریں۔

پوری اسلامی تاریخ پر نظر کرلیجئے کہ سرورِ دوعالم محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی مکی زندگی سے لے کر آخر تک یہی نظریہ کارفرما رہا کہ اپنے لئے بھی آزادی وعزت کی زندگی میسر ہو،اور دوسروں کے لئے بھی،وہ خود بھی سربلند ہوئے،اسلام کو بھی عزت کا مقام دلایا،دوسری مظلوم قوموں کی بھی بھرپور امداد کی اور ساری دنیا کو عدل وانصاف رواداری ومساوات سے بھر دیا،اور جب سے مسلمانوں میں کمزوری آئی،دولِ یورپ وامریکہ رُوس نے کمزوروں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنالیا ہے۔

درحقیقت مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ دورِ اقتدار ساری دنیا کے لئے امن وسلامتی اور عدل وانصاف کی ضمانت بنا ہوا تھا،اس کے بعد سے لادینی سیاست اور ظلم وستم کا دور دورہ ہے،ایک طرف سے اشتراکیت،کمیونزم اور لامذہبیت کا سیلاب بڑھ رہا ہے تو دوسری طرف سے سرمایہ پرستی اور دوسرے انسانیت کش حربوں سے یورش ہورہی ہے ان حالات میں مسلمان امراء،زعماء وعلماءِ کا فرضِ اولین ہے کہ دنیا کی رہ نمائی کریں،اور منظم ومتحد ہوکر ہر انسانیت دشمن تحریک کا مقابلہ کریں۔

واضح ہو کہ اسلامی سیاست،جارحیت سے یکسر پاک،اور جذبہ خدمتِ خلق سے معمور ہے جیسا کہ ہم نے حضرت عمرؓ کی خلافت کے حالات سے ثبوت پیش کیا ہے،اس جذبہ سے اگر اب بھی کام کیا جائے تو انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوسکتی ہے۔اور زعمائے ملت وعلمائے امت کا فرض ہے کہ اس زندگی کو اپنائیں اور عوام کو بھی اس راہ پر لگائیں،ان کے اندر سیاسی شعور پیدا کریں جو قومی وملی زندگی کا جزو اعظم ہے۔

اس موقع پر ہم مضمون بالا کی تائید میں حضرت علامہ کشمیریؒ کے خطبہ صدارت اجلاس ششم جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ ۲،۳،۴،۱۴ دسمبر

۱۹۲۷ء (بمقام پشاور) سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، جو اہلِ علم وعوام کے لئے مفید ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔
سب سے پہلے آپ نے ضرورتِ نظام ملی و تقسیم عمل پر تبصرہ فرمایا اور بتلایا کہ جس طرح عالم صغیر یعنی وجودِ انسانی کا نظم قلب و دماغ اور جوارح کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ تمام ملکات واخلاق کا عامل و منبع قلب ہے، اور معارف وعلوم کا حامل دماغ ہے اور تمام اعمال وافعال کے مظاہر جوارح ہیں، اسی طرح عالم کبیر یعنی مجموعہ عالم کے لئے بھی قلب ہے جس کو اصطلاحِ شریعت میں اولی الامر یا اصحابِ حل وعقد سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کا دماغ حکماءِ وعلماءِ شریعتِ غراء ہیں، اور اس کے اعضاء وجوارح عامہ افرادِ خلق اور عوام ہیں، پس اگر علمائے امت وظیفہ دماغ کو باحسن وجوہ انجام دیتے رہیں، یعنی علوم ومعارف کا صحیح طور سے نشر وابلاغ کرتے رہیں اور مہماتِ عمومیہ وخصوصیہ میں صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہیں تو افرادِ خلق یعنی عوام بھی اعمال صحیحہ بجالانے میں دست وپا کا کام دیتی ہیں اور نظام عالم نہایت منظم اور صحیح طور پر قائم رہتا ہے۔ (ص۴)
یہ بھی واضح رہے کہ تمام مجموعہ عالم کا چونکہ فاعل وخالق ایک ہی ذاتِ اقدس وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے، اس لئے تمام رجحانات کا مرجع اسی کی طرف ہونا چاہیے، یعنی تمام امور اسی ایک ذاتِ واحد کے لئے ہیں اور اسی کی طرف سب لوٹ کر جانے والے ہیں اور تمام افرادِ عالم بمنزلہ ایک کشتی کے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود کی طرف جارہی ہو (ص۵)
اس مجموعہ عالم یا شخص اکبر کی حیات کلمۃ اللہ اور خدائے عزوجل کا نام پاک ہے، جب تک اس ذاتِ اقدس کا نام عالم میں باقی ہے قیامت جو کہ اس شخصِ اکبر کی موت ہی نہیں آسکتی، اور جب نام حق اس میں باقی نہیں رہے گا، مجموعہ عالم پر موت طاری ہو جائے گی، جس کا نام قیامتِ کبریٰ ہے (کمافی روایت مسلم)
جس طرح مجموعہ عالم محتاج نظام ہے، ہماری حیاتِ ملی اور اس کی بقاء بھی بغیر کسی نظام کے باقی نہیں رہ سکتی، منتشر افراد اور پراگندہ اشیاء کا وجود بے معنی اور لاحاصل ہے، اس لئے ان کا فائدہ اور حسن ہمیشہ صحیح ہیئت ترکیبی ہی پر موقوف ہے، اور نظام کی روح یہ ہے کہ اجزاءِ عمل کو صحیح طور پر تقسیم کیا جائے، جو شخص جس جزو کا اہل ہو وہی اس کے سپرد کیا جائے، اور وہ اپنے مفوضہ خدمت کو پیشِ نظر رکھ کر نتیجہ واحدہ اور مقصد وحید کی طرف گامزن ہو، اور ہمیشہ "یداللہ علی الجماعہ" پر نظر رکھے، یعنی اس امر پر کہ خدا کی نصرت، تائید وحمایت جماعت کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

بایدت از درسِ تکوین ایں سبق آموختن دستِ قدرت باجماعت ہست وحق باخلقِ خویش

شریعتِ غراء اور ملت بیضاء نے ایک نظام میں مسلک رہنے کی عظیم اہمیت کا احساس دلانے کے لئے اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ اگر دو تین آدمی بھی ساتھ مل کر سفر کریں تو ان کو بھی چاہیے کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں۔ (ص۶)
بہر حال! بغیر نظام کے شہر، ملک، اقلیم اور ملت واقوام کی بقاء وحیات تو کجا ایک گھر بلکہ شخص واحد کی بقا بھی نہیں رہ سکتی پس اگر اہل اِسلام کو اپنی زندگی وحیات، بقاء وارتقاءِ درکار ہے تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بغیر نظام درست وصحیح تقسیم کار کے کسی طرح ممکن نہیں، اور ظن غالب ہے کہ ہمارا موجودہ تشتت وافتراق ہمارے وجود کو سراسر فنا کے حوالہ کردے گا (ص۷)
آگے آپ نے آیتِ قرآنی **واولی الامر منکم** کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:۔ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ اس عالم کا قلب جماعت **اِولی الامر** ہے اور شرعی نقطہ نظر میں اولیٰ الامر سے مراد ولاتِ امور، حکام اسلام، علماء وجملہ اربابِ حل وعقد ہیں جن کی رائے پر تمام امور کا انتظام انجام پاتا ہو، پھر دوسری آیت میں علم واستنباط کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ اولی الامر سے مراد علماء ومجتہدین ہیں اور صحیح مسلم میں اس آیت کی شان نزول وہ واقعہ بتایا گیا ہے جس میں حضرت فاروق اعظمؓ نے دربارۂ تخییر وایلاءِ حضور اکرم ﷺ استنباط فرمایا تھا۔
بہر حال! دورِ جاہلیت میں تو اولی الامر کا منصب سرداران قبائل واشراف کے لئے مخصوص تھا، لیکن اسلام نے قومی عصبیت وتفاخر بالآباء کو فنا کر کے یہ منصب عظمیٰ اہل حل وعقد اور اہل اجتہاد واستنباط اور علماء و داعیانِ امت کے سپرد کردیا، اور ظاہر ہے کہ جب ولاتِ امور

موجود نہ ہوں تو علماء اور اعیانِ امت ہی ان کی قائم مقامی کے مستحق ہیں۔ (ص ۸)

حضرتؒ نے عبارتِ مذکورہ میں خاص طور سے ہندوستان جیسے ممالک کے لئے رہنمائی فرمائی ہے، جہاں ولاۃ وحکامِ اسلام نہیں کہ وہاں صرف علماءِ دین اور غیر علماءِ میں سے اعیانِ ملت وقائدین وزعما اہل اسلام وعوام کی رہنمائی کریں گے۔

حضرتؒ نے ۱۶ میں مجاہدین علمائے ہند کو علماءِ صادقین اور مجاہدین قائدین ملت کو زعمائے ہند کے لقب سے یاد کیا ہے، اور مذہبی وقومی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں دونوں کے باہمی اشتراک عمل کو بھی سراہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دیارِ اسلام میں حکام، زعماء وعلماءِ تینوں کو مذہبی، قومی وملکی معاملات میں سر جوڑ کر اتحاد ویکجہتی کے ساتھ اشتراکِ عمل وتعاون کرنا چاہیے، الگ الگ راستوں پر نہ چلنا چاہیے، جس سے ان کے پیرو عوام وجمہور پریشان خیالی وانتشار کا شکار ہوں، اسی طرح دیارِ حرب میں جہاں ولاۃ وحکام اسلام نہیں ہوتے، علماء وزعماء کو متحدہ مساعی جاری رکھنی چاہیں، ان کے گروہ بندی وافتراق میں مبتلا ہونے سے مذہب وملک وقوم سب کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچیں گے اور اس کا بارہا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ''استحسانِ معاہدۂ مسلمین یا غیر مسلمین'' کا جلی عنوان قائم کر کے اس امر پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو وطنی وقومی مفاد کے لئے غیر مسلموں سے معاہدہ بھی کرنا چاہیے اور یہودِ مدینہ کے ساتھ معاہدۂ نبوی کو سامنے رکھ کر شرائطِ معاہدہ طے کر کے مکمل یکجہتی کے ساتھ باہمی تعاون کرنا چاہیے، لیکن ایسے معاہدہ کے لئے شرطِ اول یہ ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام سے ایک انچ بھی ہٹ کر کوئی معاہدہ نہ کریں، کیونکہ جس معاہدہ کی بنیاد لوگوں کی رضا جوئی اور خالق کی ناراضی پر ہو وہ کسی طرح درست اور پائدار نہیں ہو سکتا، اور مسلمانوں کو مذہبی حقوق اور وطنی مفاد دونوں کو یکساں لازمی طور سے خیال کرنا ہوگا۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں قومیں ایک منصفانہ معاہدہ کرلیں جس میں ملکی وقومی مفادات کے ساتھ جانبین کے مذہبی حقوق اور جان ومال کی حفاظت وسلامتی کی ضمانت بھی دی گئی ہو، اس طرح اگر مسلمان مذکورہ بالا معاہدہ کے تحت اپنے ہمسایہ غیر مسلم بھائیوں کی طرف سے مطمئن ہوں گے۔ اور ان کے ظلم وتعدی کا شکار نہ ہوں گے، تو ان کا رویہ کسی بیرونی حملہ کے وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کے گھر پر بیرونی حملہ کے وقت ہوا کرتا ہے، اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہی ہو، دوسرے یہ کہ جب مسلمانانِ ہند اپنے معاہدہ مذکورہ کی وجہ سے پابند ہوں گے اور غیر مسلم اقوام ہند سے ان کا معاہدانہ برتاؤ لازمی وضروری ہوگا، تو ایسی حالت میں کسی مسلمان بادشاہ کو مذہباً اس کی اجازت بھی نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے معاہدہ کو توڑے اور ہندوستان پر حملہ آور ہو بلکہ شریعتِ اسلام کی رو سے اس پر واجب ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کے اس معاہدہ کا پورا پورا احترام کرے۔

لقولہ علیہ السلام ''ذمة المسلمين واحدة يسعىٰ بها ادنا هم'' (سارے مسلمانوں کا عہد وذمہ داری ایک ہے، ان میں سے ادنی ورنہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرلے تو دوسروں پر اس کا احترام کرنا واجب ولازم ہو جاتا ہے)

لہٰذا میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کرلیں اور اس معاہدہ کو وہ دیانتداری وخلوص کے ساتھ پورا کریں، سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار ومخلص ہمسایہ پائیں گے، کیونکہ مسلمان بحیثیت مذہب کے قرآن مجید کے حکم کے بموجب معاہدہ کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں (۲۱)!

۲۲و۲۳ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کے دارالاسلام نہ ہونے کی بھی وضاحت کی ہے، اور معاہدۂ نبوی مذکورہ کی تفصیلات سے بھی روشناس کرایا ہے، جس سے تمام مسلمانوں خصوصاً علماءِ کرام کو ضرور واقف ہونا چاہیے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے خطبہ میں جمعیۃ علماءِ ہند کی سات آٹھ سالہ قومی وملی خدمات کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے علماءِ وصلحائے امت صرف درس وتدریس وعظ وتلقین وامامتِ مساجد تک ہی اپنی خدمات کو موقوف ومنحصر نہ کر دیتے تھے بلکہ ملک وملت کی دوسری خدمات انجام دینا بھی اپنا ملی فریضہ سمجھتے تھے، وہ خدمات مختصراً یہ ہیں:۔

(۱) یورپین غیر مسلم سلطنتوں نے اسلامی ممالک پر ہجوم کیا تو مسلمانانِ ہند پر اپنی مذہبی بھائیوں کی امداد واعانت مذہبی فرض کے طور پر عائد ہوگی، مگر مسلمانانِ ہند اپنی بے بسی و بے چارگی کے باعث کسی قسم کی مادی امداد سے عاجز تھے اس لئے زعماءِ قوم نے ترکِ تعاون کا طریقہ اختیار کیا اور جمعیۃ علماءِ نے بھی اس حربہ کو مفید سمجھ کر ترکِ تعاون کا مشہور فتوی صادر کیا۔ لاکھوں کی تعداد میں اس کی شائع کیا، برٹش گورنمنٹ نے مزاحمت کی مگر مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی، اس لئے وہ گورنمنٹ کی سخت گیر پالیسی اور داروگیر وغیرہ کسی چیز سے بھی مرعوب نہیں ہوئے جس سے دوررس سیاسی نتائج ومفادات حاصل ہوئے۔

(۲) جمعیۃ علمائے ہند نے اس امر سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم کی اعانت ونصرت کے لئے مسلمانوں سے لڑنا حرام ہے، کیونکہ اس کا بدیہی نتیجہ اعلاءِ کلمۃ الکفر ہے اور پرستارانِ توحید پر حرام ہے کہ وہ اعلاءِ کلمۃ الکفر میں شریک ہوں یا اس کے ذرائع ووسائل کو مضبوط کریں۔

(۳) جمعیۃ العلماء نے جزیرۃ العرب کو تسلطِ غیر مسلم سے محفوظ رکھنے کی فرضیت کا اعلان کیا اور تخلیہ جزیرۃ العرب کے متعلق نصوصِ شرعیہ پیش کر کے اس مسئلہ کو انتہائی روشنی میں پہنچا دیا۔

(۴) خلافتِ اسلامیہ کے تحفظ وبقاء واستحکام کے مسئلہ میں جمعیۃ علماءِ نے جمعیۃ خلافت مرکزیہ کے ساتھ مکمل ہمنوائی کی اور اس سے متعلق تمام احکام شرعیہ ونصوصِ مذہبیہ پیش کر کے مسلمانوں کو سرگرم عمل کر دیا۔

(۵) مسلمانوں کو باہمی تناصر وتعاون اور دولِ مسلمہ کی حمایت ونصرت کا سبق یاد کرایا اور مشرق ومغرب کے مسلمانوں کو باہمی الفت ومودت، تعاضد وتناصر کی ضرورت اور وجوب سے آگاہ کیا۔

(۶) جمعیۃ علماءِ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے قلوب میں روحِ ملی تازہ کر دی اور ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور حقوق مذہبیہ وقومیہ کے حصول کے لئے تحمل مصائب ومشاق کا خوگر بنایا، یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دورِ ابتلاء میں علمائے صادقین، زعمائے ہند اور عامہ مسلمین سب نے ہی قید وبند کی مصیبتیں برداشت کیں۔

(۷) جمعیۃ علماءِ نے مظلوم موپلاؤں کی امداد واعانت میں بھی پوری سعی کی اور مظلومین سہارنپور کی امداد میں بھی کافی حصہ لیا۔

(۸) شدھی کا شور بلند ہونے پر جمعیۃ علماءِ ہند نے ناواقف وسادہ لوح مسلمانوں کو ارتداد کے جال سے بچانے کے لئے بروقت توجہ کی اور پوری ہمت واخلاص کے ساتھ ارتداد کے سیلاب کو روکا۔

(۹) سب سے زیادہ روشن کارنامہ جمعیۃ علماءِ ہند کا یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں باہمی مصالحت ورواداری پیدا کی اور علماءِ اسلام کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں نمایاں کام کیا، ایسے اصول وضع کئے جن سے علماءِ اسلام باوجود اپنے اپنے مذہبی خیالات ومعتقدات پر قائم رہنے کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلمانوں کی مشترکہ ضروریات پر غور کریں! اور مشترکہ مفاد کی تحصیل میں کنفس واحدۃ شریک عمل ہوں۔ (۱۵، ۱۶، ۱۷)

حضرت شاہ صاحبؒ کے خطبہ صدارت کے اسی صفحات کے لاآبی قیمہ میں سے قلتِ گنجائش کی وجہ سے صرف چند شہ پارے علماءِ امت کی توجہ کے لئے پیش کر دیے گئے ہیں۔

والعاقل تکفیہ الاشارہ والله الموفق لکل خیر وسعادہ

وانا الاحقر

سیّد احمد رضا عفا اللہ عنہ

بجنور ۱۵ر رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ ۱۶ نومبر ۱۹۷۰ء یوم الاثنین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الصلوٰة على الحصير و صلى جابد بن عبدالله وابو سعيد فى اسفينة قائما وقال الحسن تصلى قائما ما لم تشق على اصحابك تدور معها والافقاعدًا

(چٹائی پر نماز پڑھنے کا بیان، اور جابر بن عبداللہ، اور ابوسعید (خدری) نے کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی، حسن (بصری) نے کہا ہے کہ کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہو تاوقتیکہ تمہارے ساتھیوں پر شاق نہ ہو، کشتی کے ساتھ گھومتے جاؤ، ورنہ بیٹھ کر (پڑھو)

(۳۷۰) حدثنا عبدالله بن يوسف قال انا مالك عن اسحاق بن عبدالله بن ابى طلحة عن انس بن مالك ان جدته' مليكة دعت رسول الله صلى الله عليه وسلم لطعام صنعته له فاكل منه ثم قال قوموا فلا صلى لكم قال انس فقمت الىٰ حصير لنا قداسود من طول مالبس فنضحته' بمآء فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم وصففت انا واليتيم ورآء ه' والعجوز من ورآئنا فصلى لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ركعتين ثم انصرف

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ان کی دادی **ملیکہ** نے رسول اللہ محمد ﷺ کو کھانے کے لئے بلایا، جو خاص آپ کے لئے انہوں نے تیار کیا تھا، جب آپ نوش فرما چکے تو آپ نے فرمایا، اٹھو، میں تمہارے گھر میں نماز پڑھوں گا، حضرت انسؓ کہتے ہیں میں اپنی ایک چٹائی کی طرف متوجہ ہوا جو کثرت استعمال سے سیاہ ہوگئی تھی، میں نے اسے پانی سے دھویا، پھر رسول خدا محمد ﷺ اس پر کھڑے ہوگئے، میں نے اور ایک یتیم نے آپ کے پیچھے صف باندھ لی اور بڑی بی ہمارے پیچھے کھڑی ہوگئیں اور رسول خدا ﷺ نے ہم سب کے ہمراہ دو رکعت نماز ادا فرمائی اس کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ابن بطال کی رائے ہے کہ مصلّی اگر بقدر قامت انسان ہو تو وہ حصیر کہلاتا ہے، اس سے کم ہو تو خمرہ، امام بخاریؒ کی عادت ہے کہ وہ ان تمام افعال پر عنوانات قائم کرتے ہیں جو رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہوئے ہیں اسی لئے یہاں باب الصلوٰة على الحصير قائم کیا، اس کے بعد باب الصلوٰة على الخمرة، اور باب الصلوٰة على الفراش وغیرہ لائیں گے، اس باب کے ضمن میں امام بخاریؒ نے یہ بھی بیان کیا کہ حضرت جابر و ابوسعیدؓ نے کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے الخ حافظ نے لکھا کہ اس سے امام بخاریؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے خلاف کی طرف اشارہ کیا ہے اُن کے نزدیک بلا عذر کے یعنی قیام پر قدرت ہوتے ہوئے بھی کشتی میں بیٹھ کر نماز جائز ہے (فتح ۱/۳۴۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اس کے مقابلہ میں امام صاحبؒ کے لئے حضرت انسؓ کا اثر ہے کہ وہ بصرہ سے اپنی زمین پر جاتے تھے تو کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بظاہر کوئی عذر نہ تھا، امام ابو یوسف و امام محمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ بلا عذر کے کشتی میں بیٹھ کر نماز جائز نہیں اور احتیاطاً اسی پر عمل کرنا اولیٰ بھی ہے، پھر ہمارے مشائخ نے ریل کو تخت و چارپائی کی طرح اقرار دیا ہے اس لئے اس میں بھی صرف کھڑے ہو کر نماز کو جائز کہا ہے، دوسرے حضرات نے ریل کو کشتی کے مثل کہا، اور نماز کی کھڑے و بیٹھے دونوں طرح اجازت دی، میرے نزدیک بھی یہی مختار ہے صاحبِ بدائع نے بھی کشتی و بحری جہاز کی نماز پر عمدہ تفصیلی بحث کی ہے آپ نے لکھا:۔ اگر کشتی پانی یا زمین پر ٹھیری ہوئی ہو تو اس میں نماز صرف کھڑے ہو کر ہی درست ہے، اگر زمین پر ٹھیری ہوئی نہ ہو اور کنارے سے بندھی ہو تو اس سے باہر نکل کر کنارے پر نماز پڑھ سکے تو

اس کے اندر بیٹھ کر درست نہ ہوگی، باہر نکل کر زمین پڑھے گا، جس طرح گھوڑے اونٹ وغیرہ سے اتر کر نماز پڑھ سکتا ہو تو فرض نماز ان پر درست نہیں ہے، اور اگر کشتی دریا میں چل رہی ہو تب بھی کنارے پر آسکتا ہو تو بہتر کنارے پر ہی نماز پڑھنا ہے، کیونکہ کشتی میں سر چکرانے کا خطرہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنی پڑے گی لیکن اگر کنارے پر نہ آئے اور کشتی ہی میں کھڑے ہو کر پڑھے تب بھی نماز درست ہوگی، حضرت انسؓ سے اس طرح ثابت ہے۔ گھوڑے اونٹ پر کھڑے ہو کر نماز چونکہ پڑھی ہی نہیں جاسکتی اس لئے اس کا مسئلہ الگ رہا۔

امام اعظمؒ کے نزدیک اگر کشتی پر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہو یا کنارے پر اتر سکتا ہو تب بھی کشتی میں بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز فرض ادا کر سکتا ہے اگرچہ اس طرح کرنا بہتر نہیں اور خلافِ اولیٰ ہے۔

امام صاحبؒ کا استدلال حدیثِ انسؓ سے ہے، دوسرے حسن بن زیاد نے اپنی کتاب میں سوید بن غفلہ کی سند سے روایت کیا کہ میں نے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ سے کشتی میں نماز کے بارے میں سوال کیا تو دونوں نے فرمایا کہ کشتی چلتی ہو تو نماز بیٹھ کر پڑھے، ٹھیری ہوئی ہو تو کھڑے ہو کر۔ اس میں انہوں نے قیام پر قدرت وعدمِ قدرت کی کوئی شرط نہیں لگائی۔ تیسرے یہ کہ کشتی کے چلنے کی حالت میں دورانِ راس اکثر ہوتا ہے لہٰذا سبب کو مسبب کی جگہ سمجھ لیا گیا اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے خصوصاً جبکہ مسبب پر واقفیت دشوار ہو، یا وہ ایسا ہو کہ سبب کے ہوتے ہوئے اس کا موجود نہ ہونا بہت نادر ہو۔

جس طرح امام صاحب نے مباشرتِ فاحشہ کو خروجِ منی کا قائم مقام قرار دیا کہ عدم خروج نادر ہے ایسے ہی کشتی میں دوران راس نہ ہونا بھی نادر ہے، لہٰذا حکم اکثری حالت پر دیا گیا (یا جس طرح سفر کو قائم مقام مشقت کے قرار دیا گیا کہ ہر سفر میں قصر کا حکم ہو گیا یا جیسے نیند کو قائم مقام حدث کے کیا گیا، کمافی کلام ابن عابدین (الامع ۱۵۲/۱) صاحبین کی مستدل حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ استحباب پر محمول ہے وجوب پر نہیں (بدائع ۱۰۹/۱)

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ امام صاحبؒ کے نزدیک جو کشتی میں بہ عذر وبلا عذر ہر طرح بیٹھ کر نماز درست ہے، یہی قول محدث ابن ابی شیبہؒ نے حسن بن مالک ابوقلابہ اور طاؤس کا نقل کیا ہے اور مجاہد سے مروی ہے کہ جنادہ بن ابی امیہ نے نقل کیا کہ ہم ان کے ساتھ غزوات میں جاتے تھے تو کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے (عمدہ ۸۷/۲) عینی نے بنایا میں محیط سے نقل کیا کہ مجاہد نے کہا ہم نے جنادہ بن ابی امیہ کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھی اور ہم چاہتے تو کھڑے ہو کر بھی پڑھ سکتے تھے ۹۳۲/۱ (اعلاء السنن ۱۲۲/۷)

محقق عینیؒ نے کشتی کی نماز کو اس باب میں لانے کی وجہ مناسبت ابن المنیر سے نقل کی کہ بوریہ پر نماز اور کشتی میں نماز دونوں زمین کے علاوہ دوسری چیز پر ہیں، گویا بتلایا کہ صرف زمین ہی پر نماز کی ادائیگی ضروری نہیں، اور اس سے زیادہ قوی وجہ مناسبت یہ ہے کہ جس طرح مصلّی وجائے نماز زمین پر ہوتا ہے، اسی طرح کشتی پانی پر ہوتی ہے، لہٰذا دونوں پر نماز درست ہے۔

اعلاء السنن ۱۲۱/۷ میں باب الصلوٰۃ فی السفینۃ کے تحت حضرت ابن عباسؓ کا اثر نقل کیا کہ کشتی میں سوار ہونے والا اور ننگا آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے گا رواہ عبدالرزاق فی مصنفہ (زیلعی) اس روایت میں صرف ابراہیم بن محمد مختلف فیہ ہے، مگر امام شافعیؒ نے اسکی ثناء توثیق کی۔

قولہ وصففت انا والیتیم وراءہ والعجوز من ورائنا حافظ نے لکھا کہ اس سے جماعت کی نماز میں نابالغ لڑکے کا مردوں کے ساتھ صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا جواز معلوم ہوا، عورتوں کا مردوں کی صفوں سے پیچھے نماز ادا کرنے کا حکم نکلا، اور یہ بھی کہ عورت تنہا ہو تو وہ پیچھے الگ صف میں تنہا کھڑی ہو کر نماز پڑھے گی لیکن اس سے کسی تنہا مرد کے لئے الگ صف میں تنہا کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کا جواز نکلنا درست نہیں ہوگا۔ (فتح ۳۳۳/۱)

یہ آخری بات حافظ نے عجیب کہی، جبکہ خود امام شافعی کا مذہب اور امام مالک وامام ابوحنیفہ کا بھی جواز ہی ہے اگرچہ خلافِ اولیٰ ہوگا، البتہ امام احمد واصحابِ حدیث نے حدیث "لاصلوٰۃ للمنفرد خلف الصف" کی وجہ سے اس کی عدم جواز کا فیصلہ کیا ہے اور ہم اس کو نفی کمال پر محمول کرتے ہیں۔ (کمافی العمدہ ۸۲۴/۱)

مسئلہ محاذاۃ! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ لڑکا اگر تنہا ہو تو اس کو مردوں کی صف میں کھڑا کر لینا چاہیے، لیکن عورت اگر تنہا ہو تو بھی اس کو مردوں کی صف میں کھڑا نہیں کر سکتے، اس کو مؤخر کرنا ضروری ہے، یعنی لڑکوں کا تاخر استحباب کے درجہ میں اور عورتوں کا وُجوب کے درجہ میں ہے۔

اس سے امام صاحبؒ کے مسئلہ محاذاۃ کا استنباط بھی واضح ہوا، لہٰذا مولانا عبدالحئیؒ[1] صاحب لکھنویؒ کا اس حنفی مسئلہ کی تضعیف کرنا یا یہ کہنا کہ امام صاحب کے پاس اس مسئلہ کی کوئی دلیل نہیں ہے غلط ہوا، اور میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ قوی ہے کہ کیونکہ مسئلہ اجتہادی ہے اور مجتہد کو حق ہے کہ دقیق فروق کے پیش نظر وہ تاخیرہ بیان کو مرتبہ سنیت میں قرار دے اور تاخیرِ نسواں کو مرتبہ شرطیت و وجوب میں، مثلاً احادیث سے الگ صف میں تنہا کھڑے ہونے کی کراہت ثابت ہے یہاں تک کہ امام احمدؒ نے تو ایسی نماز کو باطل قرار دے دیا ہے، لیکن باوجود اس کے بھی حضور علیہ السلام نے اس واقعہ میں عورت کو پیچھے کی صف میں تنہا الگ کھڑا کرا دیا اور آپ نے کبھی ایک مرتبہ بھی کسی عورت کو مردوں کی صف میں کھڑا نہیں ہونے دیا، بخلاف لڑکوں کے کہ ان کی جگہ بھی اگرچہ صفوفِ رجال کے پیچھے ہے مگر تنہا لڑکے کو صفِ رجال میں تکمیل صف کے لئے کھڑا کرانے کا ثبوت موجود ہے۔

اس سے یہی بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظر شارع میں لڑکے کے لئے تو مردوں کی صف میں کھڑا ہونے کا تحمل بعض صورتوں میں ہو سکتا ہے لیکن عورتوں کے لئے اس کا تحمل کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں امام صاحبؒ کا محاذاۃِ نسواں کو مبطل صلوٰۃ قرار دینا شریعتِ غراء کی ترجمانی نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے صاحب ہدایہ پر بھی اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے حدیث "اخروھن من حیث اخرھن اللہ" کو خبرِ مشہور کہا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مراد اصولیین کی اصطلاح ہے، یعنی یہ حدیث متلقی بالقبول ہے پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ بہ لحاظ نظر شارع بہت سے امور میں عورتوں کا مرتبہ مردوں کی نسبت سے گھٹا ہوا ہے مثلاً ان میں جماعت نماز نہیں ہے اور اگر کریں بھی تو ان کی امام مرد کی طرح صف کے آگے کھڑی نہ ہوگی بلکہ صف کے درمیان میں کھڑی ہوگی، جس طرح ننگوں کی جماعت ہو سکتی ہے پھر امامتِ[2] صلوٰۃ کی طرح وہ شرف نبوت سے بھی محروم ہیں۔

بَابُ الصَّلٰوۃِ علی الخُمْرَۃِ

(خمرہ (بوریہ) پر نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۷۱) حدثنا ابو الولید قال نا شعبة قال نا سلیمان الشیبانی عن عبد اللہ بن شداد عن میمونة قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی علی الخمرة

ترجمہ! حضرت میمونہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا محمد ﷺ خمرہ پر نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ مولانا موصوفؒ نے بہت سے مسائل حنفیہ میں دوسروں سے بے جا تاثر لے کر اپنے قوی مسائل و دلائل کو ضعیف سمجھ لیا ہے یہ بھی ان ہی میں سے ہے جس کی طرف حضرتؒ نے اشارہ فرمایا ہے اور علامہ کوثریؒ نے بھی مولاناؒ کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے وفوق کل ذی علم علیم۔ "مؤلف"

[2] نماز کی امامتِ صغریٰ کی طرح امامتِ کبریٰ بھی اس کے لئے موزوں و پسندیدہ نہیں سمجھی گئی، چنانچہ بخاری ۶۳۷ "باب کتاب النبی صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الی کسریٰ وقیصر" اور ۱۰۵۲ کتاب الفتن میں نیز ترمذی باب الفتن کے آخر میں حضرت ابوبکرؓ کی حدیث آئے گی لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ (وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس کی عنانِ حکومت کسی عورت کے ہاتھ میں ہو) فتح الباری ۱۲/۹۰ اور عمدہ ۱۸/۵۹ میں ہے کہ جمہور نے عورت کے لئے امارت وقضا کے تمام عہدے ممنوع قرار دے دیئے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ نے صرف ان امور کی قضاء کا عہدہ جائز کہا جن میں عورتوں کی شہادت درست ہوتی ہے، لیکن امام مطلق، خلیفہ، یا خود مختار سلطان و بادشاہ کی جگہ دی جانے کا جواز کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے اور ترمذی شریف میں ہے کہ جب عورتوں کے اختیار و مشورہ سے امور کا فیصلہ ہونے لگے گا تو وہ مردوں کیلئے بدترین دور ہوگا۔ (تحفہ ۳/۲۳۶)

تشریح! یہاں خمرہ پر نماز پڑھنے کا جواز بتلایا، جوحصیر سے چھوٹا ہوتا ہے کہ صرف پیروں کے نیچے بچھالیا جائے یا سجدہ کی جگہ پر (کما حققہ الشیخ الگنگوہیؒ) یعنی حصیر والے ترجمۃ الباب سے بتلایا تھا کہ نماز غیر ارض پر بھی ہوسکتی ہے اور یہاں یہ کہ کچھ حصہ زمین کا خالی ہو اور کچھ فرش یا بوریہ ہو تب بھی نماز میں کچھ حرج نہیں، رہا یہ کہ ایک باب قبل میں بھی حضرت میمونہؓ ہی کی روایت سے حضور علیہ السلام کے خمرہ پر نماز پڑھنے کا ذکر آ چکا تھا، پھر یہاں مستقل عنوان قائم کر کے اسی قطعہ حدیث کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟ حافظؒ نے وجہ لکھی کہ یہاں اسی ٹکڑے پر مستقل عنوانِ ترجمہ اس لئے قائم کیا کہ امام بخاریؒ کے شیخ ابوالولیدؒ نے اس حدیث کو اتنا ہی مختصر روایت کیا ہے اور پہلی روایت مسدد سے مطوّل تھی (فتح ۱/۳۳۴) محقق عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ کا مقصد اختلاف سند استخراجِ احکام ومقصودِ شیخ کا بیان ہے کہ ہر شیخ کا مقصد الگ ہوتا ہے ایک وجہ[1] یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے یہ بات ضمناً معلوم ہوئی تھی، یہاں اہمیت کی وجہ سے اس کو مستقل عنوان کے تحت لائے، اور اسی لئے حدیث کی روایت بھی دوسرے شیخ سے کی جنھوں نے صرف اسی مسئلہ کی اہمیت کے تحت صرف اتنا ہی ٹکڑا روایت کیا ہے واللہ تعالیٰ اعلم!

حضرت گنگوہیؒ نے صرف ترجمتین کی توجیہ کی ہے کہ باب الصلوٰۃ علی الحصیر کے بعد باب الصلوٰۃ علی الخمرۃ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس طرف کوئی تعرض نہیں فرمایا کہ حضور علیہ السلام کی صلوٰۃ علی الخمرۃ کو یہاں مکرر کیوں لائے، اور اس پر مستقل ترجمہ کیوں قائم کیا اس کا جواب صرف حافظ عینیؒ نے دیا ہے، اس لئے اسکو حضرت گنگوہیؒ کے جواب سے مرجوع قرار دینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، جس کو حاشیہ لامع ۱/۱۵۲ میں "وما افادہ الشیخ قدس سرہ من الفرق بین الترجمتین الطف مما ذکرہ الحافظ" الخ سے بیان کیا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

باب الصلوٰۃ علی الفراش وصلی انس بن مالک علی فراشہ وقال انس کنا نصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیسجد احدنا علی ثوبہ

(فرش پر نماز پڑھنے کا بیان، اور حضرت انس بن مالکؓ نے بچھونے پر نماز پڑھی، اور کہا کہ ہم نبی کریم محمد ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے، تو ہم میں سے کوئی اپنے کپڑے پر بھی سجدہ کرلیا کرتا تھا)

(۳۷۲) حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن ابی النضر مولیٰ عمر بن عبیداللہ عن ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن عن عائشۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہا قالت کنت انام بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجلای فی قبلتہ فاذا سجد غمزنی فقبضت رجلی واذا قام بسطتہما قالت والبیوت یومئذلیس فیہا مصابیح

(۳۷۳) حدثنا یحییٰ بن بکیر قال نا اللیث عن عقیل عن ابی شہاب قال اخبرنی عروۃ ان عآئشۃ اخبرتہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی و ہی بینہ و بین القبلۃ علیٰ فراش اہلہ اعتراض الجنازۃ

(۳۷۴) حدثنا عبداللہ بن یوسف قال نا اللیث عن یزید عن عراک عن عروۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی وعائشۃ معترضۃ بینہ و بین القبلۃ علی الفراش الذی ینامان علیہ

ترجمہ! حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں رسولِ خدا ﷺ کے آگے لیٹی ہوتی تھی اور میرے دونوں پیر آپ کے قبلہ (کی جانب) میں ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تھے تو مجھے دبا دیتے تھے، میں اپنے پیر سکوڑ لیتی تھی، اور جب آپ کھڑے ہوجاتے تھے، میں انھیں پھیلا دیتی تھی، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس وقت تک گھروں میں چراغ نہ تھے۔

---

[1] اس طرح امام بخاریؒ نے دوسرے مواضع میں بھی کیا ہے مثلاً ۱۷۷ "باب الصلوٰۃ علی النفساء" میں حدیث سمرہ لائیں گے کہ حضور علیہ السلام نے نفاس والی عورت کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے وسط میں کھڑے ہوئے، اسی کے بعد متصلاً دوسرا باب "این یقوم من المراۃ والرجل" قائم کیا اور بقیہ یہی حدیث بہ سندآخر سمرہ سے روایت کی وسطِ جنازہ میں کھڑے ہونے کے ثبوت میں۔ "مؤلف"

ترجمہ! حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نماز پڑھتے ہوتے تھے، اور وہ آپ کے اور قبلہ کے درمیان آپ کے گھر کے فرش پر جنازہ کی مثل لیٹی ہوتی تھیں۔

ترجمہ! حضرت عروہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے ہوتے تھے، اور حضرت عائشہؓ آپ کے اور قبلہ کے درمیان میں اس فرش پر جس پر دونوں سوتے تھے سامنے لیٹی ہوتی تھیں۔

تشریح! امام بخاریؒ نے اس باب میں ثابت کیا کہ جس طرح نماز زمین یا اس کی جنس پر درست ہے غیر جنسِ ارض فرش وغیرہ پر بھی درست ہے اس سے امام مالکؒ کے مسلک کی مرجوحیت نکلی، دوسری بات یہ کہ پہنے ہوئے کپڑے کے کسی حصہ پر بھی سجدہ جائز ہے، جو حضرت انسؓ کے اثر سے ثابت ہوا، اس سے شافعیؒ کے مسلک کا مرجوح ہونا ثابت ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ فاذا سجد غمزنی الخ (حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب حضور علیہ السلام سجدہ کرتے تو مجھے دبا دیتے تھے، جس سے میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تھی، اور جب آپ سجدہ سے اُٹھ جاتے تو پھر پاؤں پھیلا لیا کرتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو (بغیر شہوت) چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اور ابوداؤد[1] میں یہ بھی تصریح ہے کہ حضور علیہ السلام کا ہاتھ میرے پاؤں پر پڑتا تھا، شافعیہ ناقضِ وضو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تاویل کرتے ہیں کہ پاؤں پر کپڑا ہوتا ہوگا، لیکن یہ تاویل بعید ہے البتہ استحباب وضو کا ہمارے یہاں بھی ہے تاہم درمختار میں اس کی وجہ خروج عن الخلاف قرار دی ہے، جو مجھے پسند نہیں، اور بہتر وجہ یہ ہے کہ صحیح احادیث دونوں طرف تھیں، اس لئے ہم نے مراتب اَحکام کی رعایت سے وجوب کی جگہ استحباب کو اختیار کر لیا، امام شافعیؒ کے اختلاف کی وجہ سے مسئلہ کا فیصلہ کرنا نبی کریم محمد ﷺ کی اقتداء نہ ہوئی، البتہ اختلاف ادلہ کے اصول کے تحت حضور علیہ السلام کے فعل کی اتباع ہوتی ہے، لہٰذا اسی اصول کو سامنے رکھنا چاہیے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ بعض الفاظِ حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی وہ نمازِ شبینہ سریر (پلنگ یا تخت) پر ہوتی تھی۔ (ملاحظہ ہو بخاری ۲/۷ باب الصلوٰۃ علی السریر)

قولہا اعتراض الجنازۃ، پر حضرتؒ نے فرمایا کہ اس سے مختارِ حنفیہ کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ امام عورت کے جنازہ پر اس کے وسط میں کھڑا ہو کر نماز پڑھائے، جو امام شافعیؒ کا بھی مسلک ہے (اور امام احمدؒ کا بھی)

افادۂ انور! اشارہ بھی عبارت سے بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ عبارت سے تو صرف ایک واقعہ جزئیہ کی صراحت ملتی ہے لیکن اشارہ سے زیادہ بات حاصل ہو جاتی ہے مثلاً یہاں حضرت عائشہؓ کی تشبیہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے سے ذہنوں میں یہ بات موجود ہے کہ جنازہ سامنے درمیان میں ہوا کرتا ہے کیونکہ مشبہ بہ کے طور پر وہی چیز بیان کی جاتی ہے جو پہلے سے سب کو معلوم ہو۔

تفصیل مذاہب! ہدایۃ المجتہد ۱/۲۰۱ میں امام ابوحنیفہ و ابن القاسم کا مذہب مرد و عورت دونوں کے سینہ کے مقابلہ میں کھڑا ہونا نقل کیا اور یہی امام صاحب کا مشہور مذہب بھی ہے جس کو ابن الہمام نے راجح بتلایا، دوسری روایت امام صاحب سے عورت کے لئے وسط میں کھڑے ہونے کی ہے جو ہدایہ[2] وغیرہ میں مذکور ہے اور امام طحاویؒ نے اسی کو آثار کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے۔

---

[1] ابوداؤد باب من قال لمراۃ لا تقطع الصلوٰۃ ۱/۱۰۲ میں ہے۔ غمز رجلی فضممتها اتی ثم سجد (آپ میرے پاؤں کو چھوتے تھے تو میں متنبہ ہو کر اپنے پاؤں سمیٹ لیتی تھی، پھر آپ سجدہ کرتے تھے) دوسری حدیث میں ضرب رجلی ہے کہ میرے پاؤں پر ہاتھ مارتے تھے، بخاری ۴/۷ باب ھل یغمز الرجل الخ میں بھی غمز رجلیّ فقبضتهما موجود ہے۔ ''مؤلف''

[2] الفتح الربانی ۷/۲۴۶ میں ہے:۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام مرد و عورت دونوں کے سینہ کے مقابل کھڑا ہو، اور ایک روایت امام صاحب و ابو یوسف سے یہ بھی ہے کہ مرد کے سر کے پاس اور عورت کے وسط میں کھڑا ہو، اسی کو امام طحاویؒ نے پسند کیا اور آثار سے قوی بتلایا۔ تحفۃ الاحوذی ۲/۱۴۶ میں لکھا:۔ جو قول امام احمد و اسحٰق کا ترمذی نے لکھا ہے وہی امام شافعیؒ کا بھی ہے اور وہی حق ہے اور وہی ایک روایت امام ابوحنیفہؒ سے بھی ہے، جس کو امام طحاویؒ نے امام صاحب کے قول مشہور پر راجح قرار دیا ہے، پھر یہ کہ نزاع وجوب و عدم وجوب کا نہیں ہے بلکہ صرف اولویت کا ہے، اور جو کچھ حضور علیہ السلام سے ثابت ہے اسی کو دوسروں کے مقابلہ میں اولیٰ و احسن سمجھنا چاہیے۔

علامہ ابن رشد نے لکھا کہ امام صاحب کے قول (مشہور) کی کوئی دلیل بجز اس کے جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے میرے علم میں نہیں آئی حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جب امام صاحب سے دوسری روایت موجود ہے تو وہ بھی ہمارا مذہب ہے اور احادیث میں تاویلات کرنے کی ضرورت نہیں۔ (انوار المحمود ۴۵۵/۲)

ہدایۃ المجتہد میں لکھا کہ امام مالک وشافعیؒ کے یہاں کوئی حد وتعیین نہیں ہے کتاب الفقہ ۴۰۸/۱ میں لکھا:۔ امام احمدؒ کے نزدیک مرد کے سینہ اور عورت کے وسط کے مقابل کھڑا ہو، امام شافعیؒ کے نزدیک مرد کے مقابلِ سر، عورت کے وسط میں، امام مالکؒ کے نزدیک مرد کے وسط، عورت کے مونڈھوں کے مقابل، امام اعظمؒ سے ایک روایت مثل امام شافعیؒ ہے۔

دوسری مرد وعورت دونوں کے لئے مقابلِ صدر وسینہ صاحب ہدایہ نے لکھا کہ سینہ چونکہ موضعِ قلب ہے، جس میں نورِ ایمان ہوتا ہے لہٰذا اس کے پاس کھڑا ہونا اس کے لئے شفاعتِ ایمان کی علامت ہے۔ واللہ تعالیٰ وعلمہ اتم واحکم!

باب السجود علی الثوب فی شدة الحر وقال الحسن کان القوم یسجدون علی العمامة و القلنسوة ویداه فی کمه

(سخت گرمی میں کپڑے پر سجدہ کرنے کا بیان، حسن بصری نے کہا ہے کہ لوگ عمامہ اور پگڑی پر سجدہ کرلیا کرتے تھے اور ہر ایک کے ہاتھ اس کی آستین میں ہوتے تھے)

(۳۷۵) حدثنا ابو الولید هشام بن عبدالملک قال نا بشر بن المفضل قال حدثنی غالب القطان عن بکر بن عبدالله عن انس بن مالک قال کنا نصلی مع النبی صلی الله علیه وسلم فیضع احدنا طرف الثوب من شدة الحر فی مکان السجود

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے تو ہم میں سے بعض لوگ گرمی کی شدت سے سجدہ کی جگہ کپڑے کا کنارہ بچھالیا کرتے تھے۔

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پہلے باب میں امام بخاریؒ نے اپنے کپڑے پر سجدہ کرنے کا جواز مطلقاً بتلایا تھا، اور یہاں سخت گرمی کے وقت کی قید لگا کر اس کا مسئلہ بھی الگ سے بیان کیا، کیونکہ آثار سے بھی دونوں طرح جواز ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ علم معانی میں یہ امر طے شدہ ہے کہ جب کسی مقید پر حکم کیا جاتا ہے تو قیود ہی ملحوظ ہوتی ہیں، جیسے جاءنی زید ، جاءنی زید راکبا اور جاءنی زید راکبا امس میں فرق ہے کہ قیود بڑھنے سے اُن کے فوائد بڑھ جاتے ہیں، لہٰذا اس باب کو سابق باب کی شرح و بیان قرار دینا مناسب نہ ہوگا، اور ثوب متصل ومنفصل کی بحث بھی پہلے باب کے تحت آچکی ہے، اس لئے اسکو بھی صرف اس باب سے متعلق نہیں کرسکتے، حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں کورِ عمامہ پر سجدہ مکروہ ہے (جیسا کہ درمختار وغیرہ میں ہے) لہٰذا علامہ قسطلانیؒ کا اس کی کراہت وممانعت کو بمقابلہ حنفیہ مالکیہ کا مذہب بتلانا نقلِ مذہب کی غلطی ہے، جس پر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی تراجم ابواب میں تنبیہ کی ہے۔

حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ قلنسوہ کو عمامہ کی ایک قسم کہا گیا ہے اور بعض نے دو کانوں والی ٹوپی قرار دیا ہے، جس کو ہم کنٹوپ کہتے ہیں۔

بَابُ الصَّلٰوةِ فِي النِّعَالِ

(چپلوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۷۶) حدثنا آدم بن ابی ایاس قال نا شعبة قال نا ابومسلمة سعید بن یزید الازدی قال سالت انس بن مالک اکان النبی صلی الله علیه وسلم یصلی فی نعلیه قال نعم

ترجمہ! حضرت سعید بن یزید ازدیؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ کیا رسول خدا ﷺ اپنے چپلوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، انہوں نے جواب دیا کہ ہاں!

تشریح! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس زمانہ کے نِعال (چپل) ہمارے زمانہ کے جوتوں سے مختلف تھے، اور غالب یہ ہے کہ اِن جوتوں میں نماز درست بھی نہ ہوگی، کیونکہ پاؤں ان کے اندر ہوتے ہوئے زمین پر نہیں لگتے بلکہ اوپر لٹکے رہتے ہیں، لہٰذا سجدہ کامل نہ ہوگا۔

اس کے بعد میری رائے ہے کہ چپلوں میں نماز پڑھنا زیادہ سے زیادہ مباح (بلا کراہت) کے درجہ میں ہے مستحب نہیں، لہٰذا شامی میں ایک جگہ اس کو مستحب لکھنا اور دوسری جگہ مکروہ تنزیہی خلاف تحقیق ہے میرے نزدیک حقیقتِ امر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر پہنچنے کے وقت نعلین اتارنے کے حکم سے یہود نے مطلقاً ممانعت سمجھی تھی، اسی لئے ان کے نزدیک کسی صورت میں بھی نعلین کے ساتھ نماز جائز نہیں ہے، اسی غلطی اور شدت کی شریعتِ محمدیہ نے اصلاح کی ہے اور مطلق جواز کو باقی رکھا، بعض روایات میں "خالفوا الیہود" آیا بھی ہے معلوم ہوا کہ جن روایات میں نعلین کے ساتھ نماز کا حکم آیا ہے، وہ بھی یہود کی مخالف کے لئے ہے اس لئے نہیں کہ وہ فی نفسہ مطلوبِ شرع ہے تاکہ مستحب سمجھ لیا جائے، موطأ امام مالکؒ میں کعب احبار سے یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نعلین مردہ گدھے کے چمڑے کے تھے اُس لیے اُن کو اتارنے کا حکم ہوا تھا، میں ظاہر قرآن مجید سے یہ سمجھا ہوں کہ نعلین اُتارنے کا حکم "تادباً" تھا اور اسی لئے اس سے پہلے "انی انا ربك" فرمایا ہے گویا وہ سببِ خلع کی طرف اشارہ ہے لہٰذا اس سے عدم جواز بھی ثابت نہ ہوگا، غرض کہ جواز کے ساتھ ادب کی تعلیم ملتی ہے خواہ امرِ خلع کو اُس وجہ سے سمجھا جائے جو کعب نے ذکر کی ہے یا اس وجہ سے ہو جس کی طرف الفاظِ قرآن رہنمائی کرتے ہیں، اور یہود کے عدم جواز والے حکم کی کوئی گنجائش نہیں ہے شریعتِ محمدیہ نے اسی طرح بہت سے دوسرے مواضع میں بھی مزاعم یہود کی تغلیظ واصلاح کی ہے یعنی جن امور میں بھی ان کو مغالطے لگے، اور وہ حق وحقیقت سے دور ہٹ گئے، ہماری شریعت نے حقیقت واضع کر کے ان کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔

قولہ قال نعم، پر حضرتؒ نے فرمایا:۔ اس سے یہ بات نہیں معلوم ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے جو نمازیں نعلین کے ساتھ پڑھی ہیں وہ مسجد میں تھیں یا دوسری جگہوں میں مسجد سے باہر، لہٰذا اس طرف بھی نظر ہونی چاہیے کیونکہ ادب کا لحاظ مقام کے اختلاف سے بھی مختلف ہوجاتا ہے) غالباً حضرتؒ نے یہ بات واقعہ کوہ طور سے "انك بالواد المقدس" کی روشنی میں اخذ کر کے فرمائی ہے کہ وہ وقت مکالمہ الٰہیہ کا اور مقام بھی معظم تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

فائدہ مہمہ تفسیریہ! انوارالباری ۲۱۴/۸ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ اہم تفسیری نکتہ گزر چکا ہے کہ قرآن مجید میں جو قصص وواقعات ذکر کئے گئے ہیں ان کے مکالمات میں بجائے الفاظ کے ان کے مدلولات ومفاہیم بیان ہوئے ہیں، یہاں بھی حضرتؒ نے کلام باری جل ذکرہ کی خاص شان وخصوصیت بیان کی کہ اس میں ایک ہی قصہ کو مختلف انداز سے ادا کیا گیا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حاضری کوہِ طور کے واقعہ میں ایک جگہ فرمایا:۔ "فلما اتھا نودیٰ یا موسیٰ انی انا ربك فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس طوی وانا اخترتك فاستمع لمایوحیٰ اننی انا الله لا اله الاانا فاعبدنی واقم الصلوٰۃ لذکری" (سورہ طہ) دوسری جگہ یاموسیٰ انه انا الله العزیز الحکیم والق عصاك الآیہ (نمل) تیسری جگہ یاموسیٰ انی انا الله رب العالمین وان الق عصاك (قصص)!

ہر جگہ اجمال وتفصیل اور تقدیم وتاخیر کا فرق ہے، کیونکہ قرآن مجید میں فنِ تاریخ کے طور پر واقعہ کے جزئیات کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنا مقصود نہیں، نہ وہ اسکا موضوع ہے، بلکہ اپنے اہم ترین مقصدِ ارشاد وہدایت کے تحت اور غیر معمولی اسرار وحکمتوں کے پیش نظر ایک ہی واقعہ کو مختلف طرزِ بیان میں ادا کیا گیا ہے، اسی لئے زیر بحث واقعہ طور میں یہ فیصلہ ہم نہیں کرسکتے کہ ندائے موسوی کے وقت مکالمہ الٰہیہ میں واقعی ترتیب کلمات کیا تھی؟! مثلاً یہ کہ ابتداءِ ندا میں انا ربک فرمایا تھا یا انا اللہ ارشاد ہوا تھا وغیرہ صرف اتنی بات یقینی ہے کہ واقعہ

مذکورہ کے سارے کلمات وارشادات ایک ہی وقت وواقعہ کے اندر صادر ہوئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

حضرت شاہ صاحبؒ درسِ بخاری شریف میں بہت سی آیاتِ قرآن مجید کی معتمد تفسیر اور مشکلات کا حل بیان فرمایا کرتے تھے، اسی لئے ہم حسبِ مناسبت مقام، مختلف مواقع میں زیادہ اعتناء کے ساتھ آپ کے گرانقدر اہم تفسیری افادات پیش کرتے ہیں۔

مشکلات القرآن! حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ "قرآن مجید کی حل طلب مشکلاتِ حدیث سے زیادہ ہیں اور ان کی طرف توجہ زیادہ درکار تھی مگر افسوس ہے کہ امتِ مرحومہ نے اس لحاظ سے قرآن مجید کی خدمت، خدمت حدیث کے برابر بھی نہیں کی، یہاں تک کہ کتبِ تفاسیر مطبوعہ میں کوئی کتاب فتح الباری شرح بخاری کے درجہ کی بھی موجود نہیں ہے۔ جس میں صحیح بخاری کی طرح قرآن مجید کے حقائق ودقائق پر پوری روشنی ڈالی گئی ہو اور حلِ مشکلات کی طرف توجہ دی گئی ہو۔ اس سلسلہ میں حضرتؒ کی کتاب مشکلات القرآن مع مقدمہ۔ تمیۃ البیان علامہ بنوری دام فیضہم کا مطالعہ بھی اہل علم کے لئے ضروری ہے، اس میں عدم تفسیر اور کتب تفسیر سے متعلق بہت اہم وضروری افادات پیش کئے گئے ہیں اور خاص طور سے مفید کتبِ تفسیر ومضر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، اور سابقہ کتب تفسیر کے علاوہ اُس وقت کی جدید تفسیر ترجمان القرآن کی غلطیاں بھی واضح طور سے ذکر کی ہیں، اور وہ سب تنقید مولانا آزاد کے مطالعہ سے بھی گزر گئی تھی، جس کا کوئی جواب ان کی طرف سے نہیں دیا گیا، اس کے بعد اب ہمارے زمانہ میں ایک نئی تفسیر تفہیم القرآن شائع ہو رہی ہے جس کے بعض مباحث پر نقد انوار لباری میں ضمناً آیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ علماءِ وقت تمام ایسے مواضع کا مطالعہ کر کے مکمل تحقیقی جائزہ لیں، تاکہ جہاں اس کے مفید اجزاء سے فائدہ اٹھایا جائے، اس کے مضر اجزاء خصوصاً خلاف جمہور سلف وخلف تفردات کے علمی ودینی نقصانات سے احتراز بھی ممکن ہو سکے، اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کا زریں اصول اختیار رہو۔ "والدین النصیحۃ"!

بَابُ الصَّلٰوۃِ فِی الخفاف

(موزے پہنے ہوئے نماز پڑھنے کا بیان)

(۳۷۷) حدثنا اٰدم قال نا شعبة عن الاعمش قال سمعت ابراهيم يحدث عن همام بن الحارث قال رأيت جرير بن عبدالله بال ثم توضأ و مسح علیٰ خفيه ثم قام فصلے فسئل فقال رايت النبی صلی الله عليه وسلم صنع مثل هٰذا قال ابراهيم فكان يعجبهم لان جريراً كان من اٰخر من اسلم.

(۳۷۸) حدثنا اسحاق بن نصر قال نا ابواسامة الاعمش عن مسلم عن مسروق عن المغيرة بن شعبة قال وضات النبی صلی الله عليه وسلم فمسح علیٰ خفيه و صلے

ترجمہ! ہمام بن حارث روایت کرتے ہیں کہ میں نے جریر بن عبداللہ کو دیکھا، انہوں نے پیشاب کیا، بعد اس کے وضو کیا اور اپنے موزوں پر مسح کیا، پھر نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے، تو ان سے پوچھا گیا، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے ابراہیم کہتے ہیں کہ لوگوں کو یہ حدیث بہت محبوب تھی، کیونکہ جریر آخر میں اسلام لانے والوں میں سے تھے۔

ترجمہ! حضرت مغیرہ بن شعبہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو وضو کرایا تو آپ نے موزوں پر مسح کیا اور نماز پڑھ لی۔

تشریح! دونوں حدیث سے موزوں پر مسح کرنے کا شرعی جواز ثابت ہوا، کیونکہ حضرت جریر بن عبداللہؓ آخر زمانہ نبوت میں اسلام لائے ہیں، لہٰذا ان کا وضوء میں موزوں پر مسح کرنا اور پھر یہ بتلانا کہ میں نے اسی طرح موزوں پر مسح کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو بھی دیکھا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ موزوں کے مسح پر آخر تک عمل رہا ہے۔

بحث ونظر! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا[1]:۔سورۂ مائدہ کی آیت وامسحوا برء وسکم وارجلکم الی الکعبین سے حضرات صحابہ کرامؓ نے وضوء میں پاؤں دھونے کی فرضیت ہی سمجھی تھی، اسی لئے حضرت جریرؓ کے فعل وروایت مذکورہ سے بہت خوش ہوئے تھے، کیونکہ اس آیت سے جو وہم مسح خفین کے منسوخ ہونے کا ہوسکتا تھا، وہ اُن کے فعل وروایت کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا، اور یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ مسحِ خفین کا حکم آیتِ مائدہ مذکورہ کے بعد بھی بدستور باقی ہے لیکن حضراتِ صحابہؓ کے علم وفہم کے برخلاف روافض نے یہ سمجھا کہ آیتِ مائدہ مذکورہ کے تحت وضو کے اندر ہر حالت میں اور بغیر موزوں کے بھی پاؤں پر مسح ہی کرنا چاہیے، دھونا فرض نہیں ہے اور خوارج وامامیہ (روافض) کے نزدیک موزوں پر مسح درست نہیں ہے، وہ اسی آیتِ مائدہ سے یہ سمجھے ہیں کہ مسح کا حکم صرف پاؤں کے لئے ہے، لہٰذا موزے پہننے کی حالت میں ان پر مسح جائز نہ ہوگا، ان دونوں فرقوں کے علاوہ تمام ائمہ مجتہدین اور سارے علمائے سلف وخلف کا مذہب یہی ہے کہ بغیر موزوں کے وضو میں پاؤں دھونا فرض ہے اور موزوں کی حالت میں ان پر مسح جائز ہے اور صحابہ کرام میں سے صرف حضرت عائشہؓ ابن عباس وابو ہریرہؓ کی طرف عدم جواز مسح خفین کا قول منسوب کیا گیا ہے، اوّل تو یہ نسبت ضعیف ہے۔ دوسرے اِن حضرات سے بھی ثبوتِ جواز کے لئے قوی روایات موجود ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ خیال ہوا اور پھر اس سے رجوع کرلیا ہو واللہ تعالیٰ اعلم! ائمہ میں سے امام مالکؒ کی طرف بھی انکار منسوب ہوا، لیکن علامہ محدث ابن عبدالبر مالکیؒ نے فرمایا[2]:۔ مجھے معلوم نہیں کہ فقہائے سلف میں سے کسی نے بھی مسح خفین کا انکار کیا ہو، البتہ امام مالکؒ کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے مگر ان سے بھی جو صحیح روایات ہیں وہ ثبوت کی صراحت کرتی ہیں۔

آیتِ مائدہ اور حکم وضوء! یہاں ایک اہم وضاحت اس امر کی ضروری ہے کہ آیتِ مائدہ میں جو وضو کا حکم وتفصیل مذکور ہے، آیا وضو کی فرضیت اسی سے شروع ہوئی ہے یا اس سے پہلے بھی تھی، چونکہ اکثر کتبِ متداولہ میں وضو کا اثبات اسی آیت سے کیا گیا ہے، اس لئے یہ حقیقت اوجاگر نہ رہی کہ وضو کا حکم نماز کے ساتھ ہی سے شروع سے موجود تھا، اور یہاں سورۂ مائدہ میں جو مدنی آخری سورتوں میں سے ہے، وضو کا حکم تعلیم وضو کے لئے نہیں بلکہ ضمنی طور سے ہوا ہے، صاحب روح المعانی نے لکھا:۔ یہ اشکال نہ ہو کہ آیتِ مائدہ میں پاؤں دھونے کے حکم میں کچھ ابہام کی شکل ہے، حالانکہ ایسے اہم فرض کو (غسل وجہ کی طرح) کھول کر بتلانا مناسب تھا (کہ بحث واحتمال کی گنجائش ہی نہ ہوتی) اور کلام الٰہی میں ابہام کی صورت ہونا یوں بھی مستبعد ہے، وجہ یہ ہے کہ وضو کی اصل فرضیت سالہا سال پہلے ابتداءِ بعثت کے وقت ہی ہو چکی تھی، اور اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام کو وضو کا طریقہ بھی تعلیم کردیا تھا، ایسی صورت میں سارے مخاطبین کیفیتِ وضو کو پہلے سے جانتے تھے، اور ان کی اس سے واقفیت ومعرفت آیتِ مائدہ مذکورہ سے استنباط پر موقوف نہ تھی، نہ یہ آیت تعلیم وضو کے لئے اتری ہے، بلکہ اس کی غرض وضو وغسل کا بدل تیمّم کو بتلایا ہے اور حکم تیمّم سے قبل وضو کا ذکر بطور تمہید ہوا ہے، جس میں زیادہ وضاحت وبیان کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، لہٰذا اس قسم کا ابہام کسی طرح محل اشکال واعتراض نہیں ہے (روح المعانی ۷۵/۶)

صاحبِ تفسیر مظہری نے لکھا:۔ وضو اس آیتِ مائدہ کے قبل ہی سے فرض تھا، جیسا کہ امام بخاریؒ کی روایت قصہ گم شدگی ہار حضرت عائشہؓ سے معلوم ہوتا ہے جو اس آیت کے شان نزول میں وارد ہوئی ہے، علامہ محدث ابن عبدالبرؒ نے فرمایا کہ سارے اہل مغازی جانتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے کبھی کوئی فرض نماز بغیر وضو کے نہیں پڑھی، اور وضو کی فرضیت نماز کی فرضیت کے ساتھ ہی ہوچکی تھی اور باوجود سابق تعامل کے آیتِ وضو مذکورۂ مائدہ کے نزول کی حکمت یہ ہے کہ اس کا فرض ہونا وحی متلو کا جزو بھی بن جائے، میں کہتا ہوں کہ یہ تیمّم کے لئے تمہید

---

[1] سورۂ مائدہ مدنی زندگی کی آخری سورتوں میں سے ہے کیونکہ اس کے بعد صرف سورۂ توبہ اور اس کے بعد سورۂ نصر اتری ہے، گویا قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتوں میں سے مائدہ کا نمبر (۱۱۲) توبہ کا (۱۱۳) اور نصر کا (۱۱۴) ہے، تفسیر روح المعانی ۴۷/۶ میں ہے کہ سورۂ مائدہ کا نزول حضور اکرم ﷺ پر سفر حجۃ الوداع میں مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ہوا ہے، آپ اس وقت اپنی اونٹنی پر سوار تھے جس کا ایک بازو وحی الٰہی کے بوجھ کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا اور آپ اس سے نیچے اُتر گئے تھے۔ [2] معارف السنن ۳۳۱/۱

کے طور پر اتری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (تفسیر مظہری ص۴/۳۳)

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا:۔ ابن جریرؒ نے کہا:۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ یہ آیت حق تعالیٰ کی طرف سے اس امر کا اعلان ہے کہ وضو کی فرضیت صرف نماز ادا کرنے کے واسطے ہے، دوسرے اعمال کے لئے نہیں، کیونکہ نبی اکرم ﷺ اس سے پہلے حالتِ حدث میں تمام اعمال سے رُک جاتے تھے تا آنکہ وضو فرما لیتے، صحابہ کرامؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام پیشاب کے بعد نہ ہم سے کلام کرتے تھے، نہ ہم آپ سے، اور اس وقت آپ ہمارے سلام کا بھی جواب[1] نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ رخصت کی یہ آیت نازل ہوئی "اذا قمتم الی الصّلوٰۃ الآیہ" اس کے بعد جب آپ خلاء سے واپس ہوتے اور کھانا پیش ہوتا تو صحابہ عرض کرتے کہ وضو کے لئے پانی لائیں؟ آپ فرما دیتے تھے کہ مجھے وضو کا حکم صرف نماز کے لئے دیا گیا ہے، اور کبھی فرماتے کہ میں نماز تو نہیں پڑھوں گا کہ وضو کروں (تفسیر ابن کثیر ۲/۲۲)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی قدیم عادت ہر وقت باوضو رہنے کی تھی، اور آپ نہ صرف ہر نماز کے لئے وضو فرماتے تھے، بلکہ طعام وسلام وغیرہ کے لئے بھی وضو فرماتے تھے پھر جب رخصت وخفت آئی تو آپ نے کئی نمازیں بھی ایک وضو سے ادا فرمائیں لیکن ہر نماز کے وقت مسواک کا اہتمام پھر بھی باقی رہا ہے۔

علامہ محدث ومفسر ابوبکر بن العربیؒ نے لکھا:۔ میرے نزدیک مائدہ والی آیتِ وضو، جس میں تیمم کا بھی ذکر ہے حضرت عائشہؓ کے قصہ میں اتری ہے، اور وضو پر پہلے ہی سے وحیِ غیر متلو کے تحت عمل درآمد کیا گیا، لہٰذا اس کا ذکر وحیِ متلو سے مکمل کر دیا گیا اور اس کے بعد اس کا بدل بھی ذکر کر دیا گیا اور نواقض طہارت بھی پوری طرح بیان کر دیئے گئے، اس کے بعد سورۂ نساء میں ولا جنبا الا عابری سبیل حتی تغتسلوا کے بعد وان کنتم مرضی الایہ سے آخر تک ان (نواقض) کا پھر اعادہ کیا گیا، اور بعینہ وہی مسائل پھر سے مکرر بیان کئے گئے، اور اس کی نظیر قرآن مجید میں دوسری جگہ نہیں ہے، اور اس امر کی دلیل کہ حضرت عائشہؓ کی مراد آیتِ مائدہ ہی ہے، یہ بھی ہے کہ سارے مدنی مفسرین نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اذا قمتم الی الصّلوٰۃ سے مراد نیند سے اُٹھ کر نماز پڑھنا ہے اور یہ صورت حضرت عائشہؓ ہی کے قصہ میں پیش آئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (تفسیر احکام القرآن ۱/۱۸۵)

علامہ محدث قسطلانیؒ (شارح بخاری) اور علامہ محدث زرقانیؒ (شارحِ موطا امام مالکؒ) نے مواہبِ لدنیہ اور اس کی شرح میں لکھا:۔ مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اعلیٰ مکہ میں جبل حراء پر حضور علیہ السلام کے لئے بہترین صورت اور اول درجہ کی خوشبو کے ساتھ ظاہر ہوئے اور کہا:۔ اے محمد! حق تعالیٰ آپ پر سلام بھیجتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم جن وانس کی طرف میرے رسول ہو، لہٰذا ان سب کو کلمہ **لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کی طرف بلاؤ، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنا پاؤں زمین پر مارا جس سے پانی برآمد ہوا، اور اس سے وضو کیا، جس کو حضور علیہ السلام دیکھتے رہے، پھر آپ سے کہا کہ اسی طرح سے وضو کریں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور آپ کو اپنے ساتھ نماز پڑھنے کو کہا، ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے ہے کہ آپ نے دو رکعت کعبہ کی طرف پڑھیں، وضو ونماز سکھا کر حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان کی طرف چڑھ گئے۔ اور حضور علیہ السلام اس حال میں وہاں سے لوٹے کہ جس پتھر اور مٹی کے ٹیلہ سے بھی گزرتے تھے، وہ آپ کو السلام علیک یارسول اللہ! سے خطاب کرتا تھا، آپ نے گھر پہنچ کر حضرت خدیجہؓ کو اس واقعہ کی خبر دی تو ان پر فرطِ خوشی کا عالم طاری ہو گیا، پھر آپ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور چشمہ پر لیجا کر وضو کیا اور ان کو بھی اسی طرح وضو کرنے کا حکم دیا، اس کے بعد آپ نے ان کو نماز پڑھائی، جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو پڑھائی تھی، یہ بھی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے امت

[1] بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ نے جوابِ سلام نہ دینے کا عذر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔ مجھے پسند نہیں ہوا کہ خدا کا ذکر بغیر طہارت کے کروں تو یہ سب حالات آیت رخصت نازل ہونے سے قبل کے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!" مؤلف"

میں سے سب سے پہلے نماز پڑھی اور یہ پہلی فرض نماز تھی، کیونکہ دو نمازیں صبح وشام کی پہلی امتوں کی طرح اس امت پر بھی ابتداء بعثت سے فرض تھیں، پھر شب معراج میں فرض نمازوں کی تعداد پانچ ہوئی ہے۔

فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ حضور علیہ السلام اسراء سے قبل بھی یقیناً نماز پڑھا کرتے تھے اور ایسے ہی آپ کے صحابہ کرامؓ بھی پڑھتے تھے، محقق زرقانیؒ نے لکھا کہ یہ حدیث ابتداءِ وضو والی متعدد طریقوں سے مروی ہے، جن کے راویوں میں کلام بھی ہے لیکن ان سب کے جمع ہونے سے قوت حاصل ہوگئی ہے اور ثابت ہوا کہ حدیث مذکور کی اصلیت ضرور ہے یہ بھی لکھا کہ حضور علیہ السلام جس طرح جن وانس کی طرف مبعوث ہوئے تھے، فرشتوں کی طرف بھی مبعوث تھے، صحیح ترین قول یہی ہے، جس کو ایک جماعتِ محققین نے اختیار کیا ہے، ان میں بارزی، ابن حزم، سبکی وغیرہ ہیں، اور یہاں صرف جن وانس کا ذکر اس لئے ہوا کہ ابتدا میں آپ کی بعثت ان دونوں کے لئے ہی تھی، اس کی مزید تفصیل اس کتاب کے باب الخصائص میں آئے گی۔ (شرح المواہب ۱/۲۳۴)!

اس موقع پر انبیاء علیہم السلام پر وحی اترنے کے اہم ترین اعداد وشمار بھی مذکور ہیں، جن میں نبی کریم ﷺ پر چوبیس ہزار مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا وحی لے کر اترنا نقل ہوا ہے، اس کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

حدیثی فائدہ! وضو کی حدیثِ مذکور کی تخریج اجمالی طور پر ترمذی شریف **باب النضح بعد الوضوء** میں بھی ہے اور امام ترمذی نے حسبِ عادت افادہ کیا کہ اس باب میں ابوالحکم بن سفیان، ابن عباس، زید بن حارثہ اور ابوسعید سے بھی روایات ماثور ہیں۔

زید بن حارثہ والی روایت کی تخریج ابن ماجہ **باب ماجاء فی النضح بعد الوضوء** (۳۶) میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مجھے وضو سکھایا اور نضح کا حکم دیا، اور یہ حدیث حضرت زید بن حارثہ سے مسندِ احمد میں اس طرح ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ابتداءِ وحی کے وقت آئے اور آپ کو وضو ونماز سکھلائی الخ (الفتح الربانی ۲/۵۳) صاحب تحفۃ الاحوذی نے اپنی شرح ۱/۵۵ میں اس کو نقل نہیں کیا ہے اور مسند احمد کی طرف اسامہ والی روایت نقل کی حالانکہ یہ دونوں احادیث ایک ہی جگہ باب النضح بعد الوضوء میں موجود ہیں۔

افاداتِ انوریہ! یہ بحث کہ آیتِ مائدہ نزول میں مقدم ہے یا آیتِ نساء، ہم پوری تفصیل سے انوار الباری جلد ہشتم (قسط ۱۰ ۱۷۴) کے بحث ونظر میں درج کر آئے ہیں، یہاں خاص طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تحقیق کو نمایاں کرنا ہے کہ آیت **وارجلکم الی الکعبین** کی قراءتِ نصب کی صورت میں عطف والی توجیہ مرجوح اور مفعول معہ والی توجیہ راجح ہے، کیونکہ حضرتؒ نے زمانہ درس دار العلوم دیو بند اور تحریر مشکلات القرآن کے وقت ترجیح مذکور کی رائے اختیار نہیں کی تھی، اور راقم الحروف نے جو حضرتؒ کے آخری دو سال کے درس بخاری شریف ڈابھیل میں شرکت کی تو اس میں ترجیح کی رائے سُنی اور قلمبند کی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ رفیق محترم علامہ بنوری عم فیضہم نے معارف السنن میں ترجیح کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا ہے اس لئے کہ آپ نے جامعہ ڈابھیل کے ابتدائی سال[1] کے درس میں شرکت فرمائی ہے راقم الحروف نے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے اس امر کو غیر معمولی اہمیت دی ہے کہ حضرتؒ کے آخری درس بخاری شریف کی آخری تحقیقات کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جائے کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ ایسے واسع المطالعہ محقق ومدقق محدث کے شایانِ شان یہی معلوم ہوتا ہے۔

حضرتؒ نے مشکلات القرآن میں نزولِ آیتِ مائدہ کے تقدم وتاخر دونوں احتمال کو موجہ قرار دیا ہے اور بظاہر کسی ایک کو ترجیح نہیں دی ہے لیکن ۱۳۶ میں تحریر فرمایا کہ پاؤں دھونے کا فریضہ نزولِ آیتِ مائدہ سے تقریباً ۱۸ سال قبل سے موجود تھا، اس لئے اگر آیتِ مذکورہ

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے جامعہ ڈابھیل میں ۱۳۴۶ھ سے شعبان ۱۳۵۱ھ تک چھ سال بخاری شریف کا درس دیا ہے جس کے آخری دو سال میں راقم الحروف نے شرکت کی اور امالی درس کو قلمبند کیا ہے۔ وللہ الحمد والمنۃ ''مؤلف''!

میں مختلف ومتعدد صورتوں کی طرف اشارہ ہوجائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے یعنی اشکال کی صورت جب ہی تھی کہ آیت مذکورہ ہی سے یہ فریضہ ثابت ہوتا کہ ابہام کی شکل موزوں نہ ہوتی، یہ وہی بات ہے کہ جس کی طرف دوسرے حضرات نے بھی توجہ کی ہے اور ہم ان کے اقوال نقل کر چکے ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ بظاہر حضرتؒ نے اس مقام پر تقدم نزولِ آیتِ مائدہ کو ترجیح دیدی ہے بظاہر اس لئے کہ ممکن ہے احتیاطاً ایسا فرمایا ہو، کیونکہ تاخر کی صورت میں جبکہ تقریباً ۱۰ھ میں نزولِ سورتِ مائدہ ہوا ہے تو گویا آیت مذکورہ بھی اوّلِ بعثت سے ۲۳ سال بعد اتری ہے اور ۱۸ سال کے لحاظ سے ۵ھ میں اس آیت کا نزول ہوا ہوگا۔

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ ارجلکم کا نصب عطف کے لئے ہونا مرجوح ہے (اگرچہ اپنی جگہ درست وصحیح ضرور ہے) کیونکہ اس میں شرکتِ حکم مقصود ہوتی ہے اور اس سے ۱۸ سال قبل فراغت ہوچکی ہے اور برابر ۱۸ سال تک اس کے مطابق عمل بھی ہوتا رہا ہے، اب اس کا اعادہ بطور تائید حکم سابق ہوا ہے۔ اور اس صورت میں اگر متعدد صورتوں کی طرف بھی اشارہ ہو تو مضائقہ نہیں ہے، چنانچہ واوِ معیت اور مفعول[1] معہ کی سب صورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ کسی ایک امر میں بھی اگر دو چیزوں کی صرف معیت یا مصاحبت ہوتی ہے تو واؤ کے ذریعہ دونوں کو ایک جگہ ذکر کردیا جاتا ہے، لہٰذا آیتِ وضو میں بھی واؤ صرف مصاحبت کے لئے ہے، شرکتِ حکم بیان کرنے کے لئے نہیں ہے، اس توجیہ میں خوبی یہ ہوگئی کہ گویا آیت میں وجہ ویدین کو تو ایک خانہ میں رکھا گیا اور راس ورجلین کو دوسرے خانہ میں، اور اشارہ کیا کہ ان دونوں کی نوع الگ الگ ہے، پھر بعض احکام میں دونوں یکساں ہیں اور بعض میں جُدا، مثلاً تیمّم میں سر اور پاؤں دونوں کو ایک ساتھ نظر انداز[2] کردیا گیا۔ جس کی طرف حضرت ابن عباسؓ نے بھی اشارہ کیا ہے اور شاید الفوز الکبیر میں بھی اس عبارت سے یہی مراد ہے کہ وجہ ویدین دونوں مغسول ہوتے ہیں اور تیمّم میں بھی ان ہی دو کا اعتبار ہے اور راس ورجلین دونوں سے کبھی غسل کا حکم ساقط ہوجاتا ہے، لہٰذا اُن دونوں کا حکم الگ ہے اور اِن کا الگ، اسی لئے ان دونوں کو آیت میں ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ہاتھ اور چہرے کے دھونے کا حکم تو پہلی امتوں میں بھی رہا ہے، لیکن سر اور پاؤں کے لئے حکم صرف شریعتِ محمدیہ میں ہوا ہے، اور سر کے مسح کی صورت غسلِ رجلین کے ساتھ ابتدائے نبوت ہی سے چلی آرہی ہے جو تمام مخاطبین کے لئے معلوم ومتعین تھی، پھر قرآن مجید کی ایک آیت میں غسل کا بدل تیمّم کو بتلانا تھا اور دوسری میں وضو کا بدل تیمم کو اسی کے ضمن میں دوسرے اشارات معیت ومصاحبت کے بھی آگئے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ وارجلکم قراءتِ جر کی صورت میں، مسح کے تحت ہوکر بھی حکم غسل صحیح رہتا ہے کیونکہ مسح کے معنی پانی کا لگانا اور بہانا دونوں آتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے، اور یہ از قبیل اختلاف المعانی بہ اختلاف المحال ہے، لہٰذا سر کے لئے مسح تر ہاتھ کا پھیرنا ہی رہے گا اور پاؤں کے لئے مسح کا مطلب ان پر پانی بہانا ہوگا، جیسے نضح کے معنی اختلافِ محل کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔

---

[1] ہم نے اس کی وضاحت وتفصیل انوارالباری ج ۴ میں بھی کی ہے، مگر غلطی سے طبع اوّل میں کئی جگہ بجائے مفعول معہ کے مفعول بہ چھپ گیا تھا اس کی تصحیح کرلی جائے، مشکلات القرآن ۱۳۶ میں بھی بہت سی مثالوں سے واوِ عطف اور واوِ معیت کا فرق نمایاں کیا گیا ہے اور یہ تحقیق حضرتؒ کی اہل علم ونظر کے لئے بہت ہی قابل قدر ہے جس سے بہت سے اشکالات حل ہوجاتے ہیں۔ ''مؤلف''!

[2] وضوعلی الوضوء کی صورت میں پاؤں پر بھی مسح درست ہے اسی طرح خفین پر بھی مسح درست ہے، غرض آیت میں معیت کی طرف اشارہ کیا گیا، واللہ تعالیٰ اعلم حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ اگر مسح خف کو آیت کے تحت نہ لائیں تو قرآن مجید سے اس کا ثبوت ہی ختم ہوجائیگا لہٰذا مسح کے حکم کا جنس ارجل کے لئے باقی رہنا قراءت جر کا مفاد ہے۔

بَابُ اِذَا لَمْ يُتِمَّ السُّجُوْدَ (جب کوئی شخص سجدہ پورا نہ کرے)

حدثنا الصلت بن محمد قال نامهدی عن واصل عن ابی وائل عن حذیفة انه رای رجلاً لایتم رکوعه ولا سجوده فلما قضیٰ صلوته قال له حذیفة ما صلیت قال واحبه قال لومت مت علیٰ غیرسنة محمد صلی الله علیه وسلم

ترجمہ! حضرتِ حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنا رکوع اور سجدہ مکمل نہ کرتا تھا، جب وہ اپنی نماز ختم کر چکا تو اس سے حذیفہ نے کہا تو نے نماز نہیں پڑھی (مسروق کہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ) اگر تو مرجائے گا تو محمد ﷺ کے طریقہ پر نہ مرے گا۔

تشریح! مقصد اس باب کا یہ ہے کہ نماز میں سجدہ پوری طرح نہ کرنے سے نماز درست نہ ہوگی، کیونکہ ایسا کرنے پر شدید وعید آئی ہے، اور حضور اکرم ﷺ کے سوا کسی طریقہ پر عمل کرتے ہوئے موت کا آجانا خسارۂ عظیم ہے، یہاں حدیث میں یہی شدید وعید رکوع کے پوری طرح نہ کرنے پر بھی ہے مگر اس کو امام بخاریؒ مستقل طور سے ابواب صفت الصلوٰۃ میں دوسری سند اور متن کے تغیر کے ساتھ ۱۰۹ میں باب اذالم تیم الرکوع کے تحت لائے ہیں۔

محقق عینیؒ نے فرمایا:۔ یہاں بابِ مذکور (باب اذالم تیم السجود) کے ذکر کا کوئی موقع ہی نہیں ہے، کیونکہ امام بخاریؒ کی عادت بعینہ ایک سند و متن کے ساتھ حدیث مکرر لانے کی نہیں ہے، دوسرے یہ کہ سجدہ کی کیفیت بیان کرنے کے لئے آگے آنے والے ابواب صفۃ الصلوٰۃ ہی زیادہ موزوں ہیں، تیسرے یہ کہ ان ابواب میں نسخہ مستملی میں تو یہ باب سرے سے درج ہی نہیں ہے اور نسخہ اصیلی میں بھی اس جگہ نہیں ہے بلکہ باب السجود علی الثوب فی شدة الحر کے بعد (باب الصلوٰة فی النعال سے پہلے) ہے اور وہاں یہ مناسبت ہو سکتی ہے کہ ان دونوں باب کا تعلق احکام سجدہ سے ہے (عمدہ ۲۹۲) حافظؒ نے اس موقع پر عینی کی طرح تحقیق و تدقیق کا حق ادا نہیں کیا، اور جو توجیہ کی ہے، اس پر عینی نے کچھ نقد بھی کیا ہے، البتہ حافظ نے بھی یہاں اس باب کے ذکر کو بے محل قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ یہاں یہ باب بظاہر ناسخین و ناقلین کی غلطی سے درج ہو گیا ہے، کیونکہ مستملی کے نسخہ میں نہیں ہے، جو اُن سب میں زیادہ حفظ اتقان والے ہیں۔ (فتح الباری ۱/۳۳۶)

بَابُ يُبْدِیْ ضَبْعَيْهِ وَيُجَافِیْ جَنْبَيْهِ فِی السُّجُوْدِ!

(سجدہ میں اپنے شانوں کو کھول دے۔ اور اپنے دونوں پہلو علیحدہ رکھے)

(۳۸۰) حدثنا یحیی بن بکیر قال حدثنی بکر بن مضر عن جعفر عن ابی هرمز عن عبدالله بن مالک بن بجینة ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا صلی فرج بین یدیه حتیٰ یبدو بیاض ابطیه

۱؎ واضح ہو کہ امام بخاریؒ سے اگرچہ صحیح بخاری شریف کو نوّے ہزار علماء نے سُنا ہے، مگر نسخہ بخاری مرتب و روایت کرنے والے اکابر اہل علم چار تھے، ۱ حافظ حدیث علامہ شیخ ابراہیم بن معقل النسفی (حنفی) (م ۲۹۴ھ) ۲ شیخ حماد بن شاکر (حنفی) (م ۳۱۱ھ) ۳ شیخ فربری (م ۳۲۰ھ) ۴ شیخ ابوطلحہ منصور بن محمد بزدوی (م ۳۲۹ھ) ان میں سے اگرچہ ہمارے سامنے فربری والا نسخہ ہے اور اسی کا رواج رہا ہے لیکن ان سب سے زیادہ مرتبہ شیخ ابراہیم نسفی حنفی کا ہے کیونکہ وہ حافظِ حدیث و فقیہ و مفسر بھی تھے اور اختلافِ مذاہب پر بڑی بصیرت رکھتے تھے، آپ کی تصانیف میں المسند الکبیر اور التفسیر کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو الحافظ العلامۃ ابواسحٰق النسفی قاضی نصف وعالمہا ومصنف المسند الکبیر والتفسیر وغیر ذلک، حافظ ابن حجر، حافظ مستغفری و حافظ خلیلی نے بھی حافظ ثقہ، نصیہ و صاحب تصانیف وغیرہ لکھا۔

علامہ قریشیؒ نے الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، علامہ کوثریؒ نے شروط الائمۃ للحازمی کے حاشیہ میں لکھا:۔ اگر ابراہیم بن معقل نسفی اور حماد بن شاکر یہ دونوں حنفی نہ ہوتے تو فربری پوری صحیح بخاری کے سماع عن البخاری میں منفرد رہ جاتے، جس طرح ابراہیم بن محمد بن سفیان حنفی امام مسلم سے سماع میں منفرد ہو جاتے۔

(مقدمہ لامع ۶۵ و امام ابن ماجہ و علم حدیث للعلامۃ النعمانی ۲۱۴) حافظ ابراہیم بن معقل کا تذکرہ مقدمہ انوار الباری ۲/۸۴ میں بھی ہو چکا ہے اور حماد بن شاکر کا تذکرہ ۲/۸۸ میں ہوا ہے، علامہ فربری کے موجودہ نسخہ کی ان سے بلاواسطہ روایت کرنے والے مستملی و کشمیہنی وغیرہ ہیں، اور بالواسطہ روایت کرنے والے اصیلی و مستغفری وغیرہ ہیں، جن میں سے مستملی کے نسخہ کو ان کے احفظ ہونے کے سبب سے ترجیح ہے۔ واللہ اعلم! ''مؤلف''!

ترجمہ! حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان میں اتنی کشادگی رکھتے کہ آپ کی بغلوں کی سپیدی ظاہر ہوتی تھی۔

تشریح! محقق عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے مردوں کے لئے سجدہ کی حالت میں ہاتھوں کو پہلو سے الگ رکھنے کی سنیت معلوم ہوئی، لیکن عورتوں کے لئے پہلو سے ملا کر سجدہ کرنے کا حکم ہے کیونکہ ان کے حق میں سَتر مطلوب ہے امام شافعیؒ نے بھی اپنی کتاب الام میں لکھا کہ مردوں کے واسطے کہنیوں کا پہلو سے دور رکھنا اور پیٹ کو رانوں سے الگ رکھنا مسنون ہے لیکن عورت سمٹ کر اور اعضاءِ جسم کو باہم ملا کر نماز پڑھے گی، علامہ قرطبی نے کہا کہ اس بارے میں فرائض ونوافل برابر ہیں۔ (عمدہ ۲/۲۹۴)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ نے نماز کے لئے سترِ عورت کے احکام کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے، سجدہ کی مذکورہ مسنون کیفیت یہاں ذکر کر کے متنبہ کیا کہ اس سے تستر[1] کے خلاف صورت نہیں بنتی، اور یہاں ان کا مقصود کیفیتِ سجدہ کا بیان نہیں ہے، جس کا شمار صفاتِ صلوٰۃ میں ہے۔

قولہ فرج بین یدیہ پر فرمایا:۔ کہنیوں کو پہلو سے الگ رکھ کر سجدہ کرنے کا حکم اس لئے ہوا تا کہ ہر عضو کا حظ وشرف مستقل طور سے حاصل کر سکے کہ حدیث ہی میں[2] یہ بھی ہے کہ سجدہ میں تمام اعضا سجدہ کرتے ہیں، اگر جسم کو سمیٹ کر اور اعضاء جسم کو باہم ملا کر سجدہ کیا جائے گا تو سب اعضا سمٹ کر بمنزلہ عضو واحد ہو جائیں گے، اور ہر ہر عضو کو مستقل طور سے سجدہ کا حصہ نہ مل سکے گا، جو مطلوب[3] شرع ہے۔

عورتوں کے الگ احکام

جیسا کہ اوپر امام شافعیؒ اور محقق عینی نے اشارہ کیا اور تمام ہی فقہاء سے منقول ہے کہ عورتوں کی نماز مردوں کی نماز سے بہت سی چیزوں میں مختلف ہے، اوّل تو عورتوں کے لئے مساجد سے زیادہ گھروں میں نماز کی فضیلت زیادہ ہے، جبکہ مردوں کے لئے جمعہ جماعات اور عیدین کے بڑے اجتماعات میں فرض نماز ادا کرنے کی بڑی فضیلت ہے، مسجد[4] جتنی زیادہ بڑی اور نمازی جماعت میں زیادہ ہوں، ثواب زیادہ

۱؎ یہ حکم مردوں کے لئے ہے اور عورتوں کے لئے چونکہ تستر وحجاب بدرجہ غایت مطلوب ہے، اس لئے ان کو اس کا مکلّف نہیں کیا گیا واللہ تعالیٰ اعلم!

۲؎ ابوداؤد میں ہے کہ بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ سات اعضاء جسم سجدہ کرتے ہیں، چہرہ، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں قدم، دوسری حدیث ہے کہ چہرہ کی طرح دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں، (ابوداؤد باب اعضاء السجود ۱۲۸/۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہاتھوں کے سجدہ کی صورت یہی ہے کہ کہنیوں کی طرف سے اونچے رہیں اور ہتھیلیوں کی طرف سے نیچے، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ غالباً اسی وجہ سے سجدہ میں افتراش ذراعین سے ممانعت آئی ہے، کہ علاوہ کتے کی مشابہت کے یہ صورت سجدۂ یدین کے خلاف بھی ہے لیکن باوجود ان سب امور کے بھی عورتوں کے لئے چونکہ ان کا تستر وحجاب ہی محبوب ترین صفت ہے، ان کو افتراشِ ذراعین کی اجازت ہوگئی، اور نہ صرف یہ بلکہ اور بھی وہ سب صورتیں جو مردوں کے لئے افضل تھیں، عورتوں کے لئے صرف تستر کی رعایت سے مفضول ہوگئیں، ظاہر ہے جب نماز میں تستر کی اتنی رعایت ہے تو دوسرے اوقات میں کتنی زیادہ ہوگی، اور بغیر شدید ضرورت کے گھروں سے باہر نکل کر اپنے اعضاءِ جسم کی نمائش کرنی کس درجہ غضبِ الٰہی اور عتاب نبوی کا موجب ہوگی۔ ''مؤلف''

۳؎ عورتوں کے واسطے چونکہ شریعت محمدیہ کو تستر سب سے زیادہ محبوب ہے اس لئے اس کا شرف وفضل حالتِ نماز میں بھی مقدم ہوا کہ سارے احوال زندگی میں سے حالتِ نماز ہی انسان کے لئے سب سے بہتر واشرف بھی ہے اور حالات نماز میں سجدہ کی حالت کو عظیم شرف حاصل ہے اگر عورت مرد کی طرح کھل کر اور پھیل کر سجدہ کرے گی تو وہ اپنے عظیم شرفِ تستر کو کھودے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۴؎ یہ جو کچھ مسجد وغیر مسجد کا فرق اور مرد وعورت کے لئے الگ احکام کی بات ہے اس کا تعلق صرف فرائض سے ہے، باقی سنن ونوافل کی ادائیگی وہ سب کے لئے گھروں میں ہی افضل ہے، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔ گھروں کے اندر نماز پڑھنے کو لازم پکڑو، کیونکہ سوائے فرض نماز کے اور سب نمازیں گھر کے اندر ہی زیادہ بہتر ہیں، اور فرمایا:۔ نمازوں کی ادائیگی گھروں میں بھی کرو اور ان کو قبریں نہ بنادو (ابوداؤد ۲۰۳)

انوارالباری ۸۳ میں باب قیام رمضان کے تحت کافی وضاحت ہو چکی ہے اور وہاں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے یہ بھی گزر چکا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوتا ہے اور حدیث میں یہ بھی وارد ہے کہ نماز جماعت کا ثواب ۲۵ گنا ہے، اور نمازِ صحرا کا ۵۰ گنا ہے لیکن عورتوں کے لئے حضور اکرم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ گھر کے صحن سے زیادہ کمرے کے اندر نماز افضل ہے اور کوٹھری میں کمرے سے بھی زیادہ ثواب ہے، (ابوداؤد) نیز فرمایا عورتوں کے لئے سب سے بہتر مسجدیں ان کے گھروں کے کمرے ہیں اور ان کے اندر ہو کر نماز پڑھنا سب سے افضل ہے (احمد وطبرانی) حضرت ابوحمید ساعدی کی بیوی نے حضور اکرم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کو محبوب رکھتی ہوں، آپ نے فرمایا میں بھی اس بات کو جانتا ہوں لیکن تمہاری نماز میری مسجد سے زیادہ اپنی قوم کی مسجد میں افضل ہے، اور اس مسجد سے بھی زیادہ اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر پڑھنا بہتر ہے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ تم اپنے رہائشی کمروں کے صحن میں نماز پڑھو، اور سب سے بہتر و افضل یہ ہے کہ کمرہ کے اندر ہو کر نماز پڑھو۔

یہ سُن کر وہ بی بی گئیں اور گھر کے بالکل اندر کے حصہ میں اپنی چھوٹی سی مسجد بنوائی، اور مرتے دم تک اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں نماز پڑھتی رہیں (مسند احمد) دوسری حدیث میں ہے کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی کے علاوہ عورت کی سب سے بہتر نماز کی جگہ گھر کے اندرونی کمرے اور کوٹھریاں ہی ہیں معلوم ہوا کہ مسلمان عورتوں کے لئے شریعتِ محمدیہ میں سب سے زیادہ عمدہ اور محبوب ترین صفت شرم وحیا اور تستر و حجاب ہے کہ نماز جیسی مقدس عبادت کی ادائیگی تک میں[1] بھی اس کی رعایت اس درجہ کی گئی ہے، ظاہر ہے ایسی حالت میں نماز گزار کے دل میں کسی بھی بُرے خیال ور جحان کی گنجائش نہیں ہے کہ خداوند قدوس سے قرب و تقرب و مناجات کی حالت ہے مگر شریعت کی گہری نظر نے دیکھا کہ ایسی حالت میں بھی مردوں کے لئے تو اس بات کا موقع مل سکتا ہے کہ وہ شیطانی و نفسانی اثرات کے تحت شہوانی جذبات و خیالات دل میں لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نبی کریم علیہ السلام ہمارے اس زمانہ کے بگڑے ہوئے حالات کو ملاحظہ فرماتے تو مسلمان عورتوں کو مسجدوں میں نماز ادا کرنے سے ضرور ضرور روک دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا، یہ حضرت عائشہؓ اپنے زمانہ کا حال بتلا گئی ہیں، جو ہمارے موجودہ دور کے حالات کے لحاظ سے ہزاروں ہزار گنا زیادہ بہتر زمانہ تھا، اب تو جنسی میلانات کی پیداوار اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں وقت سے بہت پہلے جوان اور بوڑھی ہو رہی ہیں اور دین و شریعت کا ماحول اچھے اچھے دینی و علمی گھرانوں تک سے بھی رخصت ہو رہا ہے۔

اوپر کا فرق و اختلاف تو نماز ادا کرنے کی جگہ کے بارے میں تھا اس کے بعد خود نماز کے ارکان کی ادائیگی میں بھی فرق ملاحظہ ہو کہ تقریباً پندرہ سولہ چیزوں میں دونوں کے لئے الگ الگ احکام ہیں مثلاً:۔

(۱) تکبیر تحریمہ کے وقت مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائیں، عورتیں صرف شانوں تک۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ نوافل وسنن کو گھروں میں ادا کرنے کا ثواب بہ نسبت مسجد کے ۲۵ گنا زیادہ ہے اور فرض کا ثواب اس کے برعکس مسجد میں زیادہ ہے اسی لئے خود حضور اکرم علیہ السلام کی عادتِ مبارکہ یہی تھی کہ حجرۂ مبارکہ میں سُنن و نوافل ادا فرماتے تھے اور مسجد نبوی میں صرف فرض پڑھتے تھے، یہی معمول صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی رہا، گھروں سے ہی وضو اور سنن سے فارغ ہو کر صرف فرض نماز کے لئے مسجدوں کو جاتے تھے، اب یہ سنت تقریباً متروک ہو رہی ہے، جس طرح حضور اکرم علیہ السلام کی سنت فرض نمازوں میں پوری سورت پڑھنے کی تھی کہ آپ نے کبھی بھی ادھوری سورت نہیں پڑھی، مگر اب ائمہ حتی کہ بہت سے علماء بھی اس کی رعایت نہیں کرتے، اور نمازیں غیر افضل اور غیر مسنون طریقہ پر ادا ہو رہی ہیں۔ اللھم اجعلنا من متبعی السنۃ السنیۃ۔ آمین ''مؤلف''

[1] فقہا نے لکھا ہے کہ نماز میں عورت کو چہرہ، دونوں ہتھیلیاں اور دونوں پیروں کے سوا سر سے پاؤں تک سارا بدن خوب ڈھانک لینا فرض ہے، اسی لئے باریک دوپٹہ اوڑھ کر بھی نماز جائز نہیں، جس میں سے بدن دکھائی دے، خواہ اس جگہ کوئی نامحرم موجود نہ ہو یا صرف محرم موجود ہوں یا صرف شوہر موجود ہو یا کوئی بھی وہاں موجود نہ ہو، ہر حالت میں سارے بدن کا ڈھکنا فرض ہے۔

یہی حکم نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں نامحرم مردوں کے بارے میں بھی ہے کہ مذکورہ تینوں اعضاءِ بدن کے علاوہ کسی حصہ جسم کا ان کے سامنے کھلنا درست نہیں ہے، نہ باریک کپڑوں میں ان کے سامنے آنا جائز ہے، جس سے بدن اور سر کے بال دکھائی دیں، اور خوف فتنہ کے وقت چہرہ اور ہاتھوں اور پاؤں کا کھولنا بھی درست نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! ''مؤلف''

(۲) مرد ناف کے نیچے ہاتھ کی دائیں ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگوٹھے و چھوٹی انگلی سے بائیں کلائی کا حلقہ کریں گے عورتیں سینہ پر بغیر حلقہ کے دائیں ہتھیلی کو بائیں پر رکھیں گی۔

(۳) تنہا نماز پڑھنے والے مرد کو فجر، مغرب وعشاء کی ادا یا قضا نمازوں میں قراءت بلند آواز سے کرنے کا اختیار ہے لیکن عورتوں کو کسی وقت بھی بلند آواز سے قراءت کرنے کا اختیار نہیں، ان کو ہر وقت آہستہ آواز سے قراءت کرنی چاہیے۔

(۴) مردوں کو رکوع میں اچھی طرح جھکنا چاہیے کہ سر اور سرین وپشت برابر ہو جائیں اور پنڈلیاں سیدھی ہوں، عورتوں کو صرف اتنا جھکنا کافی ہے کہ ان کے ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔

(۵) رکوع میں مرد ہاتھ کی انگلیاں کشادہ کر کے گھٹنوں پر رکھیں گے، عورتیں ملا کر رکھیں گی۔

(۶) مرد رکوع کی حالت میں اپنی کہنیاں پہلو سے الگ رکھیں گے، عورتیں ملی ہوئی۔

(۷) سجدہ کی حالت میں مرد پیٹ کو رانوں سے، بازو کو بغل سے اور کہنیوں کو پہلو سے جدا رکھیں گے اور بانہوں کو زمین سے اٹھا ہوا رکھیں گے، برخلاف اس کے عورتیں پیٹ کو رانوں سے، کہنیوں کو پہلو سے ملا کر اور بانہوں کو زمین پر بچھا کر سجدہ کریں گی۔

(۸) مرد سجدہ میں دونوں پاؤں کھڑے رکھ کر انگلیوں کو قبلہ رُخ کریں گے، عورتوں کو اس کی ضرورت نہیں، وہ پاؤں کو کھڑا نہ کریں گی بلکہ داہنی طرف کو نکال دیں گی، اور خوب دب کر اور سمٹ کر سجدہ کریں گی۔

(۹) سجدہ سے سر اٹھا کر مرد اپنا پیر کھڑا کر کے اس کی انگلیاں قبلہ رُخ کرے گا، اور بایاں پیر بچھا کر اسی پر بیٹھے گا، دونوں ہاتھ زانوؤں پر گھٹنوں کے قریب رکھے گا، عورتیں اپنے دونوں پاؤں داہنی طرف کو نکال کر بائیں سرین پر بیٹھیں گی، دونوں ہاتھ کی انگلیاں خوب ملا کر رانوں پر رکھیں گی۔

محدثِ کبیر لیث بن سعد کا ذکر

یہاں حدیث الباب کے تحت امام بخاریؒ نے لیث بن سعدؒ کی متابعت بھی ذکر کی ہے، اس مناسبت سے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام شافعیؒ سے ان کی بڑی تعریف منقول ہے، ان کو امام مالک سے زیادہ افقہ فرمایا کرتے تھے، اور جب تک مصر رہے ان کی قبر پر برابر حاضر ہوا کرتے تھے، سب سے زیادہ ان کی ملاقات میسر نہ ہونے کا قلق وافسوس ظاہر کیا کرتے تھے۔

ابن خلکان نے ان کو حنفی بتلایا ہے، محض تحصیلِ علم کے لئے مصر سے مکہ معظمہ، وہاں سے مدینہ طیبہ، اور پھر عراق گئے امام طحاوی نے ان کی ایک حدیث "من کان له امام فقراءة الا مام له قراءة" امام ابو یوسف سے روایت کی ہے جو صرف اہل کوفہ کے پاس تھی مکہ معظمہ مدینہ منورہ وغیرہ میں کہیں نہ تھی، لیث اس کو عراق سے لے گئے اور مصر میں اس کو مشہور کیا، اور مصر والوں نے اس کی تلقی بالقبول کی، میرے نزدیک یہ حدیث ٹھیک اسی طرح ہے، حافظ ابن حجرؒ نے ان کے مناقب میں مستقل رسالہ "الرحمة الغيشية فی الرحمة اللیشية" لکھا ہے، جس طرح حافظ ذہبی نے امام اعظم اور صاحبین کے مناقب میں رسالہ لکھا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری شریف میں یہی الفاظ ارشاد فرمائے تھے، جو ہم نے اُس وقت نوٹ کئے تھے اور یہاں نقل کئے ہیں فیض الباری ۲/۲۸ میں دوسری طرح ہے۔[۱]

۱؎ تذکرہ امالی حضرت شاہ صاحبؒ! فیض الباری اور انوار الباری کے بیان ومضمون میں بہت سی جگہ فرق نظر آئے گا، اور ممکن ہے ہمارے اپنے فہم وضبط سے پیدا شدہ بہت سی غلطیاں حضرتؒ کی طرف منسوب ہو جائیں، اس لئے یہ چند سطریں لکھی جارہی ہیں، اس وقت حضرتؒ کے امالی درس حدیث میں سے العرف الشذی، انوار المحمود، معارف السنن اور انوار الباری سامنے ہیں جن میں سے صرف العرف الشذی آپ کی حیات میں شائع ہوئی تھی، یہ زمانہ صدارتِ تدریس دار العلوم کی یادگار ہے، جب آپ ترمذی و بخاری دونوں کا درس دیا کرتے تھے۔ اور حدیثی ابحاث وتحقیقات کو دونوں کے درس پر تقسیم فرمایا کرتے تھے، اسی زمانہ کے درس میں ایک بار حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے بھی شرکت فرمائی تھی، اور فرمایا تھا کہ حضرت شاہ صاحب کے درس کی شان بہت عجیب ہے، اور آپ کے صرف ایک ایک جملہ کی شرح میں ایک ایک رسالہ تصنیف کیا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حضرتؒ کے درس کا ایک ایک لفظ نہایت قیمتی ہوتا تھا، قاری صحیح (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام بخاری کے رواۃ میں سے جلیل القدر امام حدیث و مجتہد ہونے کے باوجود امام بخاری نے ان کے فضل و کمال پر کوئی روشنی نہیں ڈالی، اور اپنی تاریخ کبیر ص ۴۳ میں صرف ان کے سن ولادت وفات اور عمر بتانے پر اکتفا کیا ہے، یہ بھی نہیں بتایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) طور سے قراءت کرتا کہ ایک حرف و اعراب کی غلطی بھی حضرت کو برداشت نہ تھی، حضرتؒ پوری توجہ سے سُنتے اور جہاں بولتے، اور اس مقام کا حق ادا فرمادیتے تھے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک سال کسی بحث کو مختصر بیان کرتے اور دوسرے سال بسط و تفصیل سے اس لئے اگر تمام سالوں کے امالی ایک جگہ جمع کر کے کوئی مجموعہ مرتب کیا جاسکتا تو وہ سب سے بہتر ہوتا۔

العرف الشذی کی تالیف سب سے پہلی کوشش تھی، اور مواد کی کثرت و فراوانی کے لحاظ سے اس میں حضرتؒ کے درسِ ترمذی شریف کی کافی جھلک آ گئی ہے اس وقت چونکہ بخاری شریف کے درس میں اس کے خاص مضامین پر الگ سے بولتے تھے، اس لئے العرف میں گویا سال کا نصف درس آیا تھا، العرف میں اگرچہ بہت سی خامیاں اور طباعت کی غلطیاں بھی تھیں تاہم اس کے مؤلف مولانا محمد چراغ صاحب دام ظلہم کا اساتذہ و طلبہ حدیث پر احسانِ عظیم ہے کہ اس کے ذریعہ انہوں نے علوم انوریہ اور تحقیقات نادرہ علمیہ کے دروازے کھول دیئے اور پھر عموماً مدارس عربیہ میں بھی اسی کے طرز تحقیق پر درس حدیث کا سلسلہ شروع ہوا، اگرچہ اب پھر انحطاط کا دور شروع ہوگیا ہے تاہم دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحب دام ظلہم العالی اور پاکستان میں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری دامت فیوضہم خاص طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کے تحقیقاتی درس کی امتیازی خصوصیات کو باقی رکھنے میں کامیاب ہیں۔

دوسری کوشش انوار المحمود کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، جس کی تالیف ۴۴ھ میں ہوئی، یہ کام کافی محنت و کاوش کے ساتھ ہوا اور طباعت سے قبل حضرت شاہ صاحبؒ کے ملاحظہ میں بھی آ گیا تھا، اگرچہ بالاستیعاب نہ دیکھ سکے، تاہم آپ نے جن مواضع کو دیکھا ان کی عبارت و مضمون کے لحاظ سے توثیق فرمائی اور اس کی کوشش کو بھی سراہا کہ حتی الامکان عبارات شارحین شروح کی مراجعت کر کے درج کی گئیں اور العرف سے اس کو بہتر قرار دیا، یہ بھی تاکید فرمائی کہ اسی طرح طبع کرادیں مگر کتابت و طباعت کی غلطیاں نہ ہونے پائیں، افسوس ہے کہ اس مجموعہ کی طباعت و اشاعت حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات میں نہ ہوسکی، کیونکہ آپ کی وفات صفر ۵۲ھ میں ہوگئی، اور انوار المحمود جلد اول کی طباعت ذی الحجہ ۵۲ھ میں ہوئی ہے، اور جلد دوم کی تو ۵۶ھ میں ہوئی ہے (واضح ہو کہ انوار المحمود ۱/۵) میں حضرتؒ کا سن وفات ۵۳ھ غلط چھپ گیا ہے۔ نفحۃ العنبر کے دونوں ایڈیشنوں میں بھی غلط چھپ گیا ہے۔ البتہ یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن ص ۴ میں ۵۲ھ صحیح چھپا تھا۔

انوار المحمود میں بھی بہت سی جگہ عبارات و مضامین کی خامیاں ہیں اور کتابت و طباعت کی غلطیاں تو بہت ہی زیادہ ہیں، تاہم با استعداد طلبا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور مؤلفؒ نے حوالوں اور شروح کی مراجعت کا نہایت اہم و ضروری کام بھی بڑی حد تک انجام دیدیا ہے، جعل الله سعيه مشكورا، تیسرے نمبر پر فیض الباری کا کام آتا ہے، جس کی تالیف حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد شروع ہوئی، اور حضرتؒ کے ملاحظہ میں اس کا کوئی حصہ نہیں آسکا، مؤلف فیض الباری حضرت مولانا محمد بدر عالم صاحبؒ کو اس کام کے لئے احقر ہی نے آمادہ کیا تھا اور "مجلس علمی" کی سرپرستی ہی میں تالیف کا سب کام ہوا ہے، حضرت مولانا موصوف اس کام کو موجودہ صورت سے کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر کرسکتے تھے، مگر ان کے تعلیمی مشاغل و ذمہ داریاں مانع رہیں، جن کے باعث وہ حوالوں اور شروح کی مراجعت کا کام نہ کرسکے، نیز اس کے ساتھ عبارات، تعبیرات و مضامین کی خامیاں بھی کافی رہ گئیں، زمانہ قیام مصر (۳۸ھ) میں احقر اور رفیق محترم مولانا سیّد محمد یوسف صاحب بنوری دامت فیوضہم نے طباعت کے وقت کام کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ وہ فیض الباری کے کام کی نگرانی فرمائیں اور احقر نصب الرایہ کی، اس وقت دفعتہً اور خلاف توقع فیض الباری کے مسودات میں ایسی خامیاں سامنے آئیں کہ ان کی اصلاح بھی دورانِ طباعت ممکن نہ تھی، اس لئے مولانا موصوف نے تقدمہ میں ان کی طرف اشارات کردیئے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غور سے نہیں پڑھا جاتا اور بہت سے لوگ فیض الباری کو حضرت شاہ صاحبؒ کی اپنی تالیف جیسا مرتبہ دیتے ہیں، پاکستان سے مولانا مفتی محمد یوسف صاحب فاضلِ امینیہ دہلی، استاذ جامعہ عربیہ اکوڑہ خٹک نے مودودی جائزہ کتاب میں اپنے علم و یقین کے حوالہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ فیض الباری کا مسودہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ملاحظہ سے گزر چکا تھا، چونکہ ایسے ظن و تخمین کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے، اس لئے تنبیہ کرنی پڑتی ہے۔

فیض الباری کے بعد "معارف السنن" کا کام شروع ہوا، اور اس کام کو حضرت مولانا سیّد محمد یوسف صاحب بنوری دام فیضہم نے زمانہ قیام ڈابھیل میں ہی مجلسِ علمی کی سرپرستی میں شروع فرمادیا تھا، خدا کا شکر ہے اس کی پانچ جلدیں کراچی سے شائع ہوچکی ہیں، اور وہ اس وقت نہ صرف حضرت شاہ صاحبؒ نے امالی درس حدیث کا بہترین و مستند مجموعہ ہے بلکہ ترمذی شریف کی مکمل شرح اور سارے علوم سلف و خلف کا نہایت بلند پایہ گنجینہ و ذخیرہ بھی ہے، نظرِ بد سے بچنے کے لئے طباعت کی غلطیاں کہیں کہیں اس میں بھی ہوگئی ہیں، جو امید ہے آئندہ ایڈیشنوں میں دور کردی جائیں گی۔

ان سب کے بعد اور آخر میں "انوار الباری" کا نمبر آتا ہے، جس کی اصل حقیقت تو بکل معنی الکلمہ "جہد المقل" سے زیادہ نہیں، مشہور ہے کہ حضرت یوسف علی نبینا علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے خریداروں میں ایک غریب ضعیف بوڑھی بھی اپنی بے بضاعت پونجی لے کر حاضر ہوئی تھی اور انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھوانے والے تو ہر زمانہ میں رہے ہیں، سنتے ہیں کہ بندر کو ایک گرہ ہلدی کی مل گئی تھی اور وہ پنساری بن بیٹھا تھا، کچھ ایسا ہی ملتا جلتا حال کم سواد راقم الحروف کا بھی ہے توفیق ایزدی سے آخر کے دو سالوں میں بخاری شریف کے درسِ انوری میں شرکت اور امالی درس قلمبند کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا، اس وقت محض ایک شوق کی کارفرمائی اور علم کی اپنی معمولی سی تشنگی بجھانے کے جذبہ سے زیادہ کوئی نیت نہ تھی، بڑی کوشش یہ تھی کہ ہر مسئلہ میں حضرتؒ کی اپنی خاص آراء اور حاصلِ مطالعہ چیزوں کو ضرور نوٹ کرلوں اور حضرتؒ کے اردو الفاظ کو بعینہا قلمبند کروں، اور اب جتنا کام بھی ہو رہا ہے ان ہی کی روشنی میں کر رہا ہوں، حضرت مولانا محمد بدر عالم صاحبؒ بھی اُن آخری دو سالوں میں شریکِ درس رہے اور حضرت کے امالی درس کو قلم بند کیا، مگر وہ حضرتؒ کی اردو تقریر کو عربی زبان میں ضبط کرتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سی چیزیں آگے پیچھے ہوگئی ہیں اور حوالوں میں غلطی ہوگئی، پھر اگر ان حوالوں اور کتبِ شروح کی مراجعت کرلی جاتی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ کن بڑے بڑے اکابر سے علم حاصل کیا، اور کتنے بڑے بڑے حضرات ان کے تلمیذ حدیث ہوئے ہیں، حالانکہ خود اپنی اس تاریخ کبیر میں بھی دوسروں کے تذکرہ میں ان کے قول کو بطور سند پیش کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ رجال و تاریخ کے علم میں بھی ان کی عظمت وسیادت کے قائل ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان کے اکابر شیوخ کے نام ۴۳ ذکر کئے، پھر ایک جماعتِ اقران واصاغر کا حوالہ بھی دیا، اور ۴۸ ان کے تلامذۂ حدیث ذکر کئے، جن میں مشہور حافظ حدیث عبداللہ بن مبارکؒ بھی ہیں، جن کیلئے امام بخاری نے تاریخ کبیر ۲/۲۱۲ میں سلام بن ابی مطیع کا قول "ماخلف بالمرو مثله" نقل کیا ہے اور اپنے رسالہ جزء رفع الیدین میں ان کو اعلم اہل زمانہ بھی فرمایا اور پھر طنز کیا کہ[1] بے علم لوگوں کے لئے بہتر تھا کہ وہ ابن مبارک ہی کا اتباع کر لیتے بجائے اس کے کہ انہوں نے دوسرے بے علم لوگوں کا اتباع کیا۔ اندازہ کیجئے کہ بقول امام بخاری اعلم اہل زمانہ ابن مبارک نے حضرت لیث بن سعد کی بھی شاگردی کی ہے، جو امام اعظم وامام ابو یوسف کے تلمیذ حدیث تھے، اور اتنے بڑے پایہ کے فقیہ ومجتہد ومحدث تھے کہ امام مالکؒ کے ستر مسائل میں غلطی کی نشان دہی کی، اور امام شافعیؒ نے تو ان کو امام مالکؒ سے زیادہ افقہ قرار دیا۔

حافظؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا کہ لیث کثیر العلم، صحیح الحدیث تھے، اور فرمایا کہ اہل مصر میں ان سے زیادہ اصح الحدیث واثبت دوسرا نہ تھا، کسی نے کہا کہ فلاں نے تو ان کی تضعیف کی ہے تو امام احمد نے فرمایا ہم اس کو نہیں جانتے، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے بڑوں کی تضعیف کرنے والے بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں مگر ان کی رائے کو وقعت نہیں دی گئی۔

حافظ نے امام شافعی کا یہ قول بھی نقل کیا کہ "لیث امام مالک سے زیادہ اثر کا اتباع کرتے تھے" یہ ایک حنفی المسلک فقیہ محدث کے لئے بہت بڑا کریڈٹ ہے، عبداللہ بن صالح نے کہا کہ میں بیس سال لیث کے ساتھ رہا، وہ اس پوری مدت میں عام لوگوں کے ساتھ ہی صبح وشام کا کھانا کھاتے رہے، ابن حبان نے کہا کہ لیث فقہ، ورع، علم وفضل اور سخاوت کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے سادات میں سے تھے، خلیلی نے کہا کہ اپنے وقت کے امام بلا مقابلہ تھے۔ الخ (تہذیب ۸/۴۵۹)

تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۲۴ میں بھی آپ کے مناقب وفضائل ذکر ہیں، حافظ کا مذکورہ بالا رسالہ نظر سے نہیں گزرا آپ کا تذکرہ مقدمہ انوار الباری ۲/۲۱۹ اور ۱/۴۵ میں بھی ہوا ہے، اس میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب بھی امام صاحب کی خبرِ حج سُنتے تھے تو مصر سے ضرور مکہ معظمہ حاضر ہوتے، اور امام صاحب سے استفادہ کرتے تھے، اس طرح جس قدر علمی استفادہ کیا ہوگا، اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے کیونکہ امام صاحب بکثرت حج کرتے تھے لیکن اس قسم کے واقعات افسوس ہے کہ دوسروں نے ذکر کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔ رحمة الله رحمة واسعة

امام بخاریؒ کے وہ نہ صرف اساتذہ میں سے ہیں، بلکہ ان کے اقوال تاریخ بخاری میں بہ طورِ سند پیش ہوئے ہیں، آج اگر ایسے جلیل القدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تب بھی صحت ہو جاتی، حضرت شاہ صاحبؒ درس کے وقت برجستہ اور بہت تیز بولتے تھے، اور نقول وحوالوں میں سرمو بھی غلطی نہ کرتے تھے، اس لئے اگر ایسی کوئی غلطی کسی تالیف میں ان کی طرف سے منسوب ہوتی ہے تو اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے، اپنی یادداشتوں پر بھی کامل بھروسہ نہیں، خصوصاً اپنی کم علمی وبے ایضاعتی کے باعث، مگر اس کی توثیق کے لئے کافی وقت حوالوں اور کتب شروح کی مراجعت ومطالعہ میں صرف کرتا ہوں، تب کچھ لکھتا ہوں۔

ناظرین انوار الباری کے بیشتر خطوط تقاضوں کے آتے ہیں، اور بعض احباب ناراض بھی ہوتے ہیں کہ اس طرح جوں کی چال کب تک چلوگے اور پوری شرح کب مکمل ہوگی؟ مگر میں اپنی مجبوری ومعذوری کو خود ہی جانتا ہوں، تنہا بھی ہوں، کیونکہ علوم وکمالاتِ انوریہ کے حاملین مجھ سے اتنی دور ہیں کہ ان سے کوئی مدد بھی نہیں مل سکتی، اس لئے ناظرین سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے، اب تک بھی جتنا کام ہوا وہ مخلصین کی دعاؤں کی بدولت ہی ہو سکا ہے، ورنہ یہ عاجز تو اس سے بھی عاجز تھا۔ واللہ الموفق والمعین!

[1] علامہ ابن ندیم نے امام اعظمؒ کے بارے میں لکھا تھا کہ مشرق سے مغرب تک روئے زمین کے تمام خشکی وتری کے حصوں میں دور ونزدیک جو کچھ بھی علم کی روشنی پھیلی وہ امام صاحبؒ ہی کی تدوین کا صدقہ ہے، ایسے امام ہمام کو بے علم اور گمراہ تک کہہ دیا گیا، اس سے زیادہ تکلیف دہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ والی اللہ المشتکی۔

حضرت لیث بن سعدؒ کو ابن خلکان وغیرہ نے حنفی کہا، قاضی ذکریا انصاری نے شرح بخاری میں اس کو یقینی قرار دیا، حافظ ابن ابی العموام نے ان کو تلمیذ امام اعظم ثابت کیا، امام شافعیؒ کو ان کی فقہ وحدیث کے مدون نہ ہونے کا افسوس وملال رہا۔

محدث، فقیہ وامام رجال کی کوئی مدون کتاب ہمارے پاس ہوتی تو موجودہ حنفیت دشمنی میں مزید کی ضرور رونما ہوتی، جس طرح ہمیں امید ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہؒ کی طباعت اور منظر عام پر آجانے سے بداندیشوں کی بہت سی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں ختم ہو جائیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

یہاں یہ چیز بھی نمایاں کرنی ہے کہ امام لیث بن سعد اپنے زمانہ کے اتنے بڑے جلیل القدر محدث تھے کہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ وہ ایک ایسی حدیث کو جو اس وقت بجز عراق کے دوسری جگہ معلوم و مشہور نہ ہوئی تھی عراق کے ائمہ حنفیہ وغیرہم سے اخذ کر کے مصر لے گئے، اور وہاں کے علماء محدثین وفقہا میں اس کی تلقی بالقبول بھی کرادی، یہ معمولی بات نہ تھی خصوصاً ایسے وقت میں کہ کچھ فقہاء و محدثین امام کے پیچھے جہری نمازوں میں بھی وجوب قراءۃ فاتحہ کے قائل موجود تھے، جن کو آئندہ دور میں امام بخاریؒ وغیرہ آگے بڑھا کر اور نمایاں کر کے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر بحث فرماتے ہوئے اسی حدیث لیث بن سعد بروایت امام طحاوی کو اپنے نزدیک سند کے لحاظ سے دوسری سب احادیث سے زیادہ اہمیت دیتے تھے کیونکہ اس کی سند میں چار جلیل القدر امام حدیث وفقہ موجود ہیں، جس کی نظیر بہت کم ملے گی۔ محترم علامہ بنوری عم فیضہم نے حضرتؒ کے اس ارشاد کو نمایاں کرتے ہوئے مزید تقویت وتائید کا سامان بھی فراہم کیا ہے جو بہت قابل قدر سعی ہے۔ ملاحظہ ہو معارف السنن ۲/۵۰۰، ۲/۱۸۷، ۲/۴۵۵، ۲

مسائل اختلافیہ میں ''فاتحہ خلف الامام'' کے مسئلہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ شاید کسی دوسرے مسئلہ کو نہیں، اسی لئے اکابر محدثین نے اس پر پورا زور صرف کر دیا ہے اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اس کی تحقیق میں گویا بطور ''حرف آخر'' کلام فرمایا ہے، پھر حضرتؒ کی پوری تحقیق کو جس وضاحت اور دلائل کے ساتھ مکمل کر کے علامہ بنوری نے پیش کر دیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ جزاہم اللہ خیرالجزاء!

حد یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بیانِ مذاہب تک میں بڑوں بڑوں سے غلطی ہوگئی ہے، حتی کہ امام ترمذیؒ جیسے متثبت بھی تسامح سے نہ بچ سکے اور محدث کبیر ابو عمر ابن عبدالبر نے الاستذکار میں امام لیث بن سعد کا مذہب امام شافعیؒ کے موافق قرار دیا ہے، حالانکہ امام شافعیؒ جہری وسری دونوں نمازوں میں مقتدی کے لئے قراءتِ فاتحہ کو واجب کہتے ہیں، اور لیث جہری میں امام اعظم، امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، ابن مبارک واسحٰق بن راہویہ کی طرح مانع قراءت ہیں، اور سرّی میں صرف استحباب کے قائل ہیں (کما صرح بہ الحافظ ابن تیمیہ فی فتاواہ ۲/۱۶۶، ۲/۱۶۷، ۲ طبع مکتبہ دارالعروبہ قاہرہ) حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا کہ سری نماز میں امام اوزاعی ولیث بن سعد کے نزدیک قراءتِ فاتحہ خلف الامام مستحب ہے اور اسی کو میرے جد امجد ابوالبرکات نے اختیار فرمایا تھا اور یہی امام احمدؒ کا مشہور قول بھی ہے، جو امام شافعیؒ کا قدیم قول تھا، اور حالتِ جہر امام میں مقتدی کا قراءت کرنا امام احمد کے ایک قول میں ناجائز وحرام ہے، اگر پڑھے گا تو نماز باطل ہو جائے گی، اور دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ نماز باطل نہ ہوگی۔

حضرت لیث بن سعد کے تذکرہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کا مذہب مصر میں شائع ہو گیا تھا (معارف السنن ۳/۲۶۵) اور جہاں انہوں نے امام ابو یوسف سے روایتِ حدیث کی ہے، امام موصوف نے بھی ان سے اپنی کتاب الخراج میں حدیث روایت کی ہے، اور ان دونوں ہی حنفی المسلک اماموں کا اتبع لاثر ہونا مخالفینِ حنفیہ تک نے تسلیم کیا ہے۔ **رحمہم اللہ تعالیٰ کلھم رحمۃ واسعہ!**

باب فضل استقبال القبلة يستقبل باطراف رجليه القبلة قاله ابو حميد عن النبي صلی الله عليه وسلم

(استقبال قبلہ کی فضیلت کا بیان، اپنے پیروں کی انگلیوں کو بھی قبلہ رُخ رکھنا چاہیے اس کو ابو حمید نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے)

(۳۸۱) حدثنا عمرو بن عباس قال نا ابن مهدی قال ثنا منصور بن سعد عن ميمون بن سياه عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذی له ذمة الله و ذمة رسول الله فلا تخفروا الله فی ذمته

(۳۸۲) حدثنا نعيم قال نا ابن المبارك عن حميد الطويل عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتیٰ يقولوا لآ اله الا الله فاذا قالوها وصلوا صلوتنا واستقبلوا قبلتنا واكلوا ذبيحتنا فقد حرمت علينا دمآؤهم واموالهم الا بحقها و حسابهم علی الله و قال علی بن عبدالله حدثنا خالد بن الحارث قال نا حميد قال سال ميمون بن سياة انس بن مالك فقال يآ اباحمزة وما يحرم دم العبد وماله فقال من شهد ان لآ اله الا الله واستقبل قبلتنا وصلی صلاتنا واكل ذبيحتنا فهو المسلم له ما للمسلم وعليه ما علی المسلم وقال ابن ابی مريم انا يحيی بن ايوب قال نا انس عن النبی صلی الله عليه وسلم

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی ہماری (جیسی) نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ ایسا مسلمان ہے، جس کے لئے اللہ اور اللہ کے رسول کا ذمہ ہے، تو تم اللہ کی ذمہ داری میں خیانت نہ کرو،

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا مجھے اس وقت تک لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہ کہہ دیں، پھر جب وہ یہ کہہ دیں اور ہماری (جیسی) نماز پڑھنے لگیں اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرنے لگیں اور ہمارا ذبیحہ کھالیں تو یقیناً ان کے خون اور مال حرام ہو گئے مگر حق کی بناء پر (جو اسلام نے ان پر مقرر کر دیا ہے) باقی ان کا حساب اللہ کے حوالے ہے اور علی بن عبداللہ نے کہا ہے کہ ہم سے خالد بن حارث نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حمید طویل نے بیان کیا، کہ میمون بن سیاہ نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ اے ابوحمزہ! وہ کون سی چیز ہے، جس سے آدمی کا جان و مال دونوں (دست درازی سے) محفوظ ہو جاتے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ جو شخص اس بات کی گواہی دے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور ہمارے قبلہ کا استقبال اور ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے جو حقوق دوسرے مسلمانوں کے ہوں گئے وہ اس کے بھی ہوں گے، اور اس کے ذمہ بھی وہ سب حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ذمہؔ ہیں۔

تشریح! محقق عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے احکام ستر کے سب اقسام ذکر کرنے کے بعد یہاں استقبال قبلہ کا بیان کیا ہے پھر اس کے ذیل میں مساجد کے احکام بھی بیان کریں گے، اور یہی ترتیب بہتر بھی ہے کیونکہ جو شخص نماز شروع کرنا چاہتا ہے سب سے پہلے اس کو ستر عورت لازم ہے، پھر استقبال قبلہ، اور ادائیگی فرض نماز چونکہ مساجد میں مطلوب ہے اس لئے ان کے احکام بھی ساتھ ہی بیان کرنا زیادہ موزوں ہوا پھر امام بخاریؒ نے فرضیتِ استقبال قبلہ وفضیلت کے ذیل میں اس امر کی بھی فضیلت بتلادی کہ استقبال کلی طور سے، یعنی جمیع اعضاءِ جسم سے اور جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ہو سکے اس کو حاصل کرنا چاہیے حتی کہ حالتِ سجدہ وتشہد میں بھی پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ کی طرف

متوجہ کرے، اور امام نسائیؒ نے تو اس پر مستقل باب الاستقبال باطراف اصابع القدم القبلة عند القعود للتشهد قائم کیا ہے۔

پھر علامہ عینیؒ نے حافظ ابن حجرؒ کے اس تسامح پر بھی تنبیہ کی کہ انہوں نے کہا امام بخاریؒ نے یہاں تمام اعضاء کے لئے استقبالِ قبلہ کی مشروعیت بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے، علامہ نے فرمایا کہ امام بخاری نے صرف فضیلت کا عنوان قائم کیا ہے، اور اسی کا ارادہ کیا ہے مشروعیت کا نہیں، اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ (عمدہ ۲/۲۹۵)!

افادۂ انور! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اگر امام بخاریؒ کی غرض یہاں فرضِ استقبال کا بیان ہے اور دوسرے اعضاء سے بھی استقبال کو بوجہ فضیلت ضمناً بیان کر دیا ہے تو یہاں شرائطِ صلوٰۃ کے طور پر اس کو لانا برمحل ہے، ورنہ زائد امور کا بیان صفۃِ صلوٰۃ کے تحت زیادہ موزوں ہے پھر فرمایا کہ جیسی کبیر (شرح منیۃ المصلی ۲۸۵) میں وضعِ قدم سے توجیہ اصابع القدم الی لقبلة مراد سمجھ کر اس کو فرض قرار دیا ہے اور بغیر اس کے نماز کو باطل ٹھیرایا ہے، وہ غلط ہے، یعنی سجدہ کی حالت میں وضع قدم زمین پر ضرور فرض ہے اور وضع قدم سے مراد وضع اصابع قدم بھی درست ہے (اسی لئے اگر ایسا جوتہ پہن کر نماز پڑھے، جس میں پاؤں کی انگلیاں زمین پر نہ ٹکیں تو نماز نہ ہوگی) لیکن وضع اصابع سے مراد توجیہ اصابع الی القبلہ سمجھنا درست نہیں، کیونکہ توجیہ کا درجہ صرف سنت وفضیلت کا ہوگا، اور اس کے بغیر نماز مکروہ ہوگی باطل نہ ہوگی، غالباً محقق عینی نے بھی مشروعیت وفضیلت کے فرق کی طرف اشارہ کر کے اسی پر تنبیہ کی ہے، جس کو حضرتؒ نے مزید افادہ کے ساتھ واضح فرما دیا۔ وللہ درہما، رحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ!

قولہ من صلے صلاتنا الخ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ان ہی احادیث سے اہلِ قبلہ کا لقب اہلِ اسلام کے لئے اخذ کیا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ یہ اہلِ اسلام کی بڑی اور کھلی ہوئی علامات ہیں، جن سے بڑی آسانی کے ساتھ دین اسلام والے دوسرے اہلِ مذاہب سے ممتاز ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ لوگ ہمارے ذبیحہ سے پرہیز کرتے ہیں، ہماری جیسی نماز نہیں پڑھتے، اور اپنی عبادات میں ہمارے قبلہ کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے، لہٰذا یہ تینوں چیزیں اہلِ اسلام کے لئے شعار کے درجہ میں ہوگئی ہیں، لیکن یہ مطلب نہیں کہ جن لوگوں میں یہ تینوں چیزیں پائی جائیں، ان کو ضرور مسلمان سمجھا اور کہا جائے گا خواہ وہ دین کی چیزوں کا انکار بھی کر دیں، اور خواہ وہ حضور علیہ السلام کے ارشاد ہی کے مطابق دینِ اسلام سے خارج بھی ہو جائیں، جس طرح تیر کمان سے دور ہو جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص پورے دین کو مانتا ہو اور اس پر عمل بھی کرتا ہو مگر ایک چھوٹی سے چھوٹی سورتِ قرآنی کا انکار بھی کرے یا اس کا حکم نہ مانے، یا جان بوجھ کر اس کو غلط معنی پہنائے، تو اس کے کفر میں شک نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ کہ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے، انبیاء علیہم السلام کی اہانت کرے، ان کے خلاف شان سخت نامناسب الفاظ استعمال کرے، دین کی تحریف کرے، احادیثِ رسول اکرم ﷺ اور اخبار و واقعات و معجزاتِ علیہم السلام کا انکار واستہزاء کرے وغیرہ تو اس کو کیسے داخلِ اسلام قرار دیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ہمارے زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ان سب موجباتِ کفر کا ارتکاب کیا جبکہ ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی ثبوتِ کفر کے لئے کافی تھا، مگر افسوس ہے کہ ہمارے اس دورِ جہالت کے بعض اہلِ علم نے بھی جن کو کتب فقہ وعقائد وکلام پر عبور نہیں تھا، مرزا کی تکفیر میں تردد کیا، اور کہا کہ ہم احتیاط کرتے ہیں اور یہ نہ سمجھا کہ جس طرح اکفارِ مسلم پر دلیری کرنا گناہ ہے بالکل اسی طرح عدم اکفارِ کافر بھی گناہ ہے، اور اسی لئے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قتالِ مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے تردد کو دیکھ کر فرمایا تھا "اجبار فی الجاهلية وخوار فی الاسلام"؟ (کہ زمانہ جاہلیت میں تو بڑے دلیر اور بہادر تھے، اب یہ اسلام کے زمانے میں بزدلی اور کمزوری کیسی؟) اس کے بعد پھر جلد ہی حضرت عمرؓ نے بھی اپنی رائے بدل دی اور فرمایا کہ میرا دل بھی اس بات کے لئے کھل گیا، جس کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا دل کھل گیا تھا، اور وہ سمجھ گئے کہ احتیاط کا اقتضاء بھی وہی تھا، جس کو حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کیا تھا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہاں حضرتؒ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ بہت مختصر ہے، کیونکہ اس نہایت عظیم ومہم مسئلہ پر برسہابرس قبل، زمانہ صدارتِ تدریس دارالعلوم دیوبند میں مستقل رسالہ اکفار الملحدین لکھ چکے تھے اور آپ کا یہ مشہور ومعروف رسالہ اہل علم ودرایت کے لئے مشعلِ راہ بن چکا ہے، جس کو پڑھ کر اہل علم کے لئے علوم وحلِ مشکلات کے دروازے کھلتے ہیں، عجیب وغریب نادر علمی تحفہ ہے، جس میں بیسیوں کتبِ متدا ولہ وغیر متدا ولہ کے نوادرِ نقول واقتباسات درج ہوئے ہیں، حضرتؒ فرماتے تھے کہ دیوبند کے زمانہ میں جب میں نے دیکھا کہ مرزائی فتنہ نے بڑے زور شور سے سر اٹھایا ہے اور کچھ دنیادار لالچی علماء بھی اس کے ساتھ ہوگئے ہیں اور قرآنی آیات واحادیث کی تحریف پر تُل گئے ہیں، اور ہمارے بہت سے اہلِ حق علماء بوجہ قصورِ استعداد ومطالعہ جوابات سے عاجز ہو رہے ہیں تو مجھے نہایت تشویش لاحق ہوئی اور دل ودماغ پر یہ فکر ہر وقت مسلط رہنے لگا کہ خدانخواستہ ہمارا صحیح دین مغالطوں کی نذر ہو کر نابود ہو جائے گا اور علمائے حق اس کی حفاظت کا حق ادا نہ کرسکیں گے، یہ خیال تقریباً چھ سال تک رہا، اور اس زمانہ میں میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی، لیکن پھر ایک دم یہ خیال بدل گیا اور یقین ہوگیا کہ یہ دین باقی رہے گا، فرمایا کہ اسی مدت میں یعنی چھ سال تک میں نے برابر صبح وشام مرزائیوں کے رد میں لکھا ہے، اور جو طبع ہوا ہے وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے، اس طبع شدہ سے آپ کا اشارہ اکفار الملحدین، عقیدۃ الاسلام صدع النقاب اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، اور ختم النبوۃ کے رسائل کی طرف ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دام ظلہم نے جمع وترتیب دے کر شائع کئے تھے، اس کے بعد ڈابھیل کی مجلسِ علمی سے ''خاتم النبیین'' بھی شائع ہوا۔

افسوس صد افسوس کہ باقی ذخیرہ جو یادداشتوں کی شکل میں تھا، وہ محفوظ بھی نہ رہ سکا، جس طرح دوسری یادداشتوں کا ذخیرہ ضائع ہوگیا جو کئی بکسوں میں جمع تھا، زمانہ قیام ڈابھیل میں ایک روز فرمایا تھا کہ میں نے حنفیہ کے لئے اس قدر سامان جمع کیا ہے کہ آج تک مجموعی طور سے تمام سلف علماءِ حنفیہ سے بھی نہیں ہوسکا ہے لیکن افسوس ہے کہ میری یادداشتوں کو صاف اور منقح کرنے کے لئے کوئی صاحبِ سواد نہیں ملا اور نہ امید ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ سراپا علم تھے اور ان سے استفادہ کرنے والے ان کی نسبت سے سراپا جہل تھے، اسی لئے آپ کے تلامذہ بھی الا ماشاء اللہ آپ کے علوم وکمالات کو نہ سنبھال سکے، راقم الحروف نے اکثر دیکھا کہ علماءِ وقت مشکلاتِ قرآن کے بارے میں آپ سے استفسار کرتے آپ ان کی تشفی کے لئے توجہ فرماتے اور جوابات دیتے اور آخر میں فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! کوئی کہاں تک اترے؟! یعنی کلام الملک العلام ہے وہ کہاں تک نازل ہوتا کہ تمہاری نازل افہام ان کا احاطہ کرلیں، چونکہ حضرتؒ اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں سے علوم عالیہ کے قرب سے فیضیاب وبہرہ ور ہوچکے تھے، اس لئے آپ کے علوم وکمالات بھی ہماری عام دسترس سے باہر تھے، اسی لئے حضرتؒ مایوسی کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جتنا کچھ درس بخاری شریف اور اپنی علمی مجالس میں بیان فرماتے ہیں، ان کو بھی آپ کے تلامذہ نہ سنبھال سکیں گے، احقر چونکہ حضرتؒ کی ایک ایک بات غور سے سنتا اور لکھتا رہتا تھا، تو کسی قدر مانوس ہوگئے تھے، اور شاید خیال کیا ہوگا کہ ٹوٹی پھوٹی چیزیں دوسروں تک پہنچا دے گا، ایک دفعہ مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''مولوی صاحب! یہ صاحب اگر ہمیں پہلے سے مل جاتے تو ہم بہت کام کر لیتے۔''

یہ جملہ اس جگہ صرف تحدیثِ نعمت کے طور پر زبانِ قلم پر آگیا، ورنہ میں اپنے جہل اور کم استعدادی سے ناواقف نہیں ہوں، میں نے اُس وقت ساری کوشش اِس کی کی تھی کہ حضرتؒ کے الفاظ بعینہ قلم بند کرلوں، اور آپ کی خاص خاص آراء کو محفوظ کرلوں، اور وہی کوشش انوار الباری کی تالیف میں کام آرہی ہے، یہاں اصل ذکر اس کا تھا کہ حضرتؒ فتنہ مرزائیت کے سیلاب اور اُس وقت کے علماءِ میں مقابلہ کی قوت واستعداد نہ دیکھ کر کتنے فکر مند ہوگئے تھے، اور آپ نے علماءِ وقت کے سامنے اتنا عظیم الشان ذخیرہ پیش کردیا کہ پھر پوری قوت سے اُس سیلاب کو روکا جاسکا، ورنہ حال یہ تھا کہ حضرتؒ نے ایک روز ہندوستان کی ایک مرکزی علمی درس گاہ کے محترم شیخ الحدیث کا واقعہ نقل کیا کہ

انہوں نے مرزائیوں کی تکفیر کے بارے میں احتیاط وتاویل کا پہلو ذکر کیا تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے تو شرح عقائد اوراس کی شروح وحواشی کا مطالعہ بھی نہیں کیا، ورنہ ایسی بات نہ کہتے، اس میں اور تمام کتب عقائد وکلام میں ہے کہ ''ضروریات دین'' کی تاویل وانکار موجب کفر ہے، دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ڈابھیل تشریف لے جانے کے بعد مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ چونکہ پوری شدت سے مرزائیوں کا مقابلہ کرتے تھے، اوران کے کفریہ عقائد اپنے درس میں بھی بیان کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے بعض دوسرے اساتذہ سے اگر درس میں مرزائیوں کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ جواب دیتے تھے کہ ''دار التکیفر'' والوں کے پاس جاکر دریافت کرو (یعنی مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ سے جو مرزائیوں کی تکفیر کرتے ہیں) یہ گویا دارالعلوم میں علمی اقدار پر سیاسی اقتدار کے تفوق وبرتری کے آثار نمایاں ہونے کی ابتداء تھی، آگے ع قیاس کن زگلستانِ او بہارش را

خیر! بات اکفار الملحدین کی تالیف سے چلی تھی، اورخدا کا شکر ہے اب اس کا اردو ترجمہ بھی پوری تحقیق واحتیاط کے ساتھ ''مجلسِ علمی'' کراچی سے شائع ہوگیا ہے، امید ہے کہ اس سے اہل علم وعوام سب ہی کو نفع عظیم حاصل ہوگا۔

یہاں حدیث الباب کی مناسبت سے چند امور ضروریہ بغرض افادہ ذکر کئے جاتے ہیں:۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے احوال ومعاملات کو ظاہر پر محمول کرنا چاہیے، لہٰذا جو شخص شعارِ دین کو ظاہر کرے، اس پر اہل اسلام ہی کے احکام جاری کئے جائیں گے، جب تک کہ اس سے دین کے خلاف کوئی بات ظاہر نہ ہو، آگے لکھا کہ حدیث میں صرف استقبالِ قبلہ واکلِ ذبیحہ وغیرہ کا ذکر اس لئے ہوا کہ بعض اہل کتاب بھی اگر چہ اقرارِ توحید کے ساتھ استقبالِ قبلہ وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ ہماری جیسی نماز نہیں پڑھتے، نہ ہمارے قبلہ کا استقبال کرتے ہیں اوران میں سے بہت سے غیر اللہ کے لئے ذبح کرتے ہیں اور بہت سے ہمارا ذبیحہ نہیں کھاتے، دوسرے یہ کہ کسی شخص کی نماز اور کھانے کا حال بہت جلد اور پہلے ہی دن معلوم ہوجاتا ہے، دوسرے امورِ دین کا حال جلد معلوم نہیں ہوتا، اس لئے بھی صرف اِن چند چیزوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔ (فتح الباری ۱/۳۳۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہماری جیسی نماز نہ پڑھیں یا ہمارے امام کے پیچھے اپنی نماز درست نہ سمجھیں، یا ہمارا ذبیحہ نہ کھائیں، تو وہ خود بھی ہم سے کٹ گئے، اور ہمارے دین سے اپنے دین کو الگ سمجھنے لگ گئے، اس لئے ہمارے فیصلہ سے قبل ہی گویا انہوں نے اپنے بارے میں فیصلہ دیدیا ہے۔

محقق عینیؒ نے لکھا: ذبیحہ کا ذکر خاص طور سے اس لئے بھی کیا کہ یہود ہمارے ذبیحہ کے کھانے سے پرہیز کرتے تھے، پھر آگے لکھا: حدیث سے ثابت ہوا کہ علاماتِ مسلم میں سے مسلمانوں کا ذبیحہ کھانا بھی ہے اس لئے کہ بہت سے اہل کتاب اور مشرکین مسلمانوں کا ذبیحہ کھانے سے انقباض اور دلی تنگی محسوس کرتے ہیں۔

قوله حتى يقولوا لا اله الا الله پر لکھا:۔ صرف ان تین باتوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ تینوں دین محمدی کے خواص میں سے ہیں کیونکہ یہود وغیرہم کی نماز میں رکوع نہیں ہے، ان کا قبلہ بھی دوسرا ہے، اور ذبیحہ بھی الگ ہے (عمدہ ۲/۲۹۶)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہود، نصاریٰ، اور مشرکین کے بارے میں تو فیصلہ بہت کھلا ہوا تھا، لیکن خود مسلمانوں کے اندر جو فرقِ باطلہ پیدا ہوئے، ان کے بارے میں ایمان وکفر کا فیصلہ کرنا بہت بڑے علم اور غور وخوض کا محتاج تھا، اس لئے حق تعالیٰ کی مشیت نے اس دورِ تلبیس میں حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کام کو لیا، جنھوں نے تمام علماءِ سلف وخلف کی گراں قدر تصریحات وفیصلوں کی روشنی میں ایک جامع ومکمل رسالہ ''اکفار الملحدین'' لکھا یہ رسالہ آپ نے بہ زمانہ صدارت تدریس دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۳ھ میں ایک استفتاء کے جواب میں چند ہفتوں کے اندر تالیف فرمایا تھا، اور یہ اُسی زمانہ میں اکابر دیوبند کی تقاریظ کے ساتھ شائع بھی ہوگیا تھا۔

حدیث الباب کے مالہ وما علیہ اور مسئلہ ایمان وکفر کو پوری طرح سمجھنے کے لئے تو اس پورے رسالہ کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے اور اساتذۂ دورۂ حدیث کو خاص طور سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، ہم یہاں اس کا صرف ضروری خلاصہ پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں، واللہ المفید:۔

(۱) ایمان وکفر کی کلیدی حقیقت پوری طرح سمجھنے کیلئے ہمارے پاس صحاح کی مشہور حدیث ہے جس کو بخاریؒ ومسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور مسلم شریف کے الفاظ کا ترجمہ بروایت ابو ہریرہؓ یہ ہے:۔رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ مجھے اس وقت تک لوگوں سے جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ لوگ خدا کی توحید اور میری رسالت کی شہادت نہ دیں اور جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس تمام کو نہ مان لیں، جب وہ اس کو اختیار کرلیں گے تو ان کو مسلمانوں کی طرح احکام شریعت کے مطابق جان ومال کی امان حاصل ہوجائے گی، بجز اسلامی ضابطہ کے ماتحت باز پرس کے کہ وہ سب سے برابر ہوگی، باقی ان کے دلوں اور باطن کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، وہی جانتا ہے کہ وہ دل سے ایمان لائے ہیں یا نہیں (مسلم مع نووی ۳۷/۱ کتاب الایمان)

محقق عینیؒ نے لکھا کہ یہ روایت ابی ہریرہ بخاری میں بھی ہے (عمدہ ۲۰۹/۱) صاحب تحفہ نے شرح ترمذی میں لکھا:۔وفی روایة للبخاری حتی یشهدوا ان لااله الا الله ویو منوابی وبماجئت به وکذافی روایة المسلم (تحفۃ الاحوذی ۳/۳۵۰)

دوسری روایت ابی ہریرہؓ مسلم میں اسی طرح ہے:۔حضور علیہ السلام نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اس امت کا جو شخص بھی خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی میری بعثت کی خبر سن کر میری نبوت اور ان سب چیزوں پر ایمان لائے بغیر مرجائے گا جو میں لے کر آیا ہوں وہ جہنمی ہے (مسلم مع نووی ۸۶/۱ کتاب الایمان)

تیسری روایت حضرت ابن عمرؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ مجھے حکم دیا گیا ہے لوگوں سے جدال وقتال جاری رکھو تا آنکہ وہ خدا کی توحید اور میری رسالت پر ایمان لائیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں الخ (بخاری ص ۸ ومسلم وغیرہ)

ایک روایت حضرت ابن عمرؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔تم میں سے کوئی شخص باایمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کی تمام خواہشات ان سب امور کے تابع وموافق نہ ہوجائیں جو میں لایا ہوں (شرح السنہ وصححہ النووی)

معلوم ہوا کہ ہر مومن کے لئے پورے دین اور ضروریات دین کی تسلیم وانقیاد ضروری ہے، کچھ کو ماننا اور کچھ کو نہ ماننا یا بعض باتوں پر عمل کرنا اور باقی چھوڑ دینا تکمیلِ ایمان ودین کے خلاف ہے، چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میرے سارے امتی جنت میں جائیں گے، مگر جو انکار کرے، صحابہؓ نے پوچھا، وہ کون ہے؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی، اس نے مجھے نہ مانا اور میرا انکار کیا۔

ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ پورے دین کو ماننا اور ان سب باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جن کا قابلِ اعتماد ثبوت رسول اکرم ﷺ کے اقوال وافعال سے ملتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس قابلِ اعتماد ثبوت کے ذرائع ووسائل کی پوری تفصیل ووضاحت فرمائی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔

(۲) مومن وکافر کے فرق کی عملی وضاحت اس عظیم واقعہ سے بخوبی ہوجاتی ہے جو رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حصلاً ہی دورِ خلافت صدیقی میں پیش آیا، اور حضرت صدیق اکبرؓ نے متبعین نبوت کاذبہ اور مانعینِ زکوٰۃ سے قتال وجہاد کیا، یہ واقعہ اجمال وتفصیل کے ساتھ متعدد صحابہ کرام سے کتب صحاح میں نقل ہوا ہے، یہاں ہم اس سے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کا ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں۔فرمایا:۔

اُس وقت اہل عرب میں سے، جنھوں نے کفر وارتداد اختیار کیا وہ چار فرقے تھے۔

(۱) جنھوں نے مسیلمہ کذاب کے دعوائے نبوت کی تصدیق کی یا اسود عنسی کے ساتھ لگ گئے، یہ سب لوگ حضور ﷺ کی نبوت وختم نبوت

کے منکر ہوکر دوسرے مدعیانِ نبوت کے متبع ہوگئے تھے، لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مقابلہ میں لشکر آرائی کی اور مسیلمہ کو یمامہ میں اور عنسی کو صنعاء یمامہ میں مع ان دونوں کے متبعین کے قتل کرایا، اکثر ہلاک ہوگئے، کچھ فرار ہوئے، ان کی اجتماعی قوت ختم ہوئی اور زور ٹوٹ گیا۔

(۲) وہ لوگ تھے جو دین سے پھر گئے، شریعتوں کا انکار کیا، نماز، زکوٰۃ وغیرہ امورِ دین سے منحرف ہوکر جاہلیت کی طرف لوٹ گئے، جس پر وہ پہلے سے تھے، اس فرقہ کے لوگ بہت کم تعداد میں تھے، اوران کی خود ہی کوئی اجتماعی قوت وزور نہ تھا، (شاید اسی لئے ان کے ساتھ کوئی نمایاں صورت مقاتلہ وجہاد کی پیش نہیں آئی ہے کہ اس کا ذکر وتذکرہ کیا جاتا)

(۳) وہ لوگ تھے جنھوں نے نماز وزکوٰۃ میں تفریق کی، یعنی نماز کا اقرار کیا اور فرضیتِ زکوٰۃ کا انکار کیا۔

(۴) وہ تھے جنھوں نے تفریق مذکور تو نہیں کی، نہ اُن دونوں کی فرضیت سے انکار کیا، لیکن امام وقت اور نائب رسول وخلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کرنے کے وجوب سے انکار، اور کہا کہ قرآن مجید میں حضور اکرم ﷺ ہی کو حکم تھا کہ لوگوں کی زکوٰۃ وصول کریں، ان کے بعد کسی کو لینے کا حق نہیں، نہ ہم اس کو دیں گے، ان دونوں فرقوں نے تاویل باطل کی راہ اختیار کی تھی، اور صرف ان ہی دونوں کے بارے میں حضرت صدیق اکبرؓ وحضرت عمرؓ کا مناظرہ ومکالمہ پیش آیا ہے، جس کا ذکر کتبِ صحاح وسیر میں آتا ہے۔

اس مناظرہ میں حضرتِ صدیق اکبرؓ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کے ذریعہ استدلال کیا اور حضرتِ فاروق ؓ نے عموم حدیث سے استدلال فرمایا ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ بھی موجبِ عام کو قطعی سمجھتے تھے (جو حنفیہ[۱] کا مسلک ہے) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ بخاری وغیرہ کی مذکورہ حدیثِ ابن عمرؓ (نماز وزکوٰۃ والی) اور بخاری ومسلم کی حدیث ابی ہریرہ (جس میں رسول اکرم ﷺ کی لائی ہوئی سب چیزوں پر ایمان لانا ضروری اور نہ ماننے والوں کو کافر سمجھ کر ان سے مقاتلہ کو فرض قرار دیا ہے) یہ دونوں حدیثیں حضرتِ صدیق، حضرت فاروق اعظمؓ کے علم میں نہ تھیں، ورنہ حضرتِ عمرؓ کو حجت وبحث کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور حضرت ابوبکرؓ جانتے تو وہ بھی الا بحقہ کے عموم سے استدلال کرنے یا قیاس سے حجت پکڑنے کی بجائے ان ہی دونوں حدیثوں کو پیش کردیتے، اگرچہ احتمال اس امر کا بھی موجود ہے کہ باوجود واقف ہونے کے اس وقت ان کا استحضار نہ رہا ہو، یا بجائے دلیل[۲] نقلی کے دلیل نظری ہی سے استدلال کرنا زیادہ موزوں ومناسب خیال کیا ہو (انوار المحمود ۶۵/۱/۴)

یہ مضمون تھوڑے فرق کے ساتھ عمدۃ القاری ۱۲۳/۱۱ اور فتح الباری ۲۲۴/۱۲-اور ۲۲۵/۱۲ میں بھی مذکور ہے فتح الباری میں قاضی عیاض سے اہل ردّۃ کی تین قسم نقل کی ہیں اور ابن حزم کی ملل ونحل سے چار اقسام، جن میں یہ تفصیل ہے کہ جمہور اور اکثریت اہل عرب کی تو بدستور اپنے مکمل اسلام پر رہی جس طرح حضور علیہ السلام کی زندگی میں تھے، ان سے کم وہ تھے جو اسلام کی اور سب باتوں کو مانتے تھے، بجز زکوٰۃ کے، اور یہ تاویل کرتے تھے کہ زکوٰۃ کا دینا صرف حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا۔ کہ وہ سببِ تطہیر تھے، اوران کی نماز بھی

---

[۱] حنفیہ کے یہاں مُوجبِ عام قطعی ہے، اس لئے عام کتاب اللہ کی تخصیص خبر واحد یا قیاس سے جائز نہیں سمجھتے، شافعیہ کے نزدیک عام کتاب اللہ ظنی ہے اور وہ اس کی تخصیص خبر واحد اور قیاس دونوں سے جائز کہتے ہیں۔

اس کی پوری بحث کتبِ اصول فقہ میں ہے اور توضیح تلویح ۱۰۶ مطبوعہ نول کشور مع حاشیہ توشیح دیکھی جائے جو لوگ حنفیہ کو اہل الرائے کا طعنہ دیتے ہیں کیا وہ اب بھی حنفیہ کے مقابلہ میں شافعیہ کو اہل حدیث اور غیر اہل الرائے ہی کہیں گے؟ ''مؤلف''!

[۲] معلوم ہوا کہ جس کا قلب ودماغ علوم نبوت سے منور ہوچکا ہے ان کی روشنی میں اگر وہ کسی امر کی حقیت پر مطلع ہوجائے تو اس کے لئے صرف دلیل نظری پیش کرنے پر اکتفا کرنا بھی درست ہے جیسے حضرت صدیقؓ نے کیا اور ہمارے نزدیک یہی شان حضرتِ امام اعظم کی بھی تھی جنھوں نے علوم نبوت کی روشنی میں اپنی شوریٰ مجلسِ علمی میں بارہ لاکھ سے زیادہ مسائل کے شرعی فیصلے کرائے، جن میں سے بہت سے مسائل کے صرف نظری دلائل ہمارے سامنے آسکے، اگرچہ وہ سب ہی مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ تھے واللہ تعالیٰ اعلم! ''مؤلف''

وجہ سکینت تھی، جب یہ دونوں وصف دوسروں کے لئے نہیں تو وہ زکوٰۃ بھی نہیں لے سکتے، تیسرا ان سے کم تعداد میں وہ گروہ تھا جس نے کھلا کفر وردۃ اختیار کرلی تھی جیسے طلیحہ وسجاح وغیرہ مدعیانِ نبوت کے متبعین، چوتھا گروہ ایسے لوگوں کا تھا جو متردد تھے، اور منتظر تھے کہ غلبہ جس طرف ہوگا ان کے ساتھ ہو جائیں گے، حضرت ابوبکرؓ نے ان سب گمراہ لوگوں کی سرکوبی کے لئے لشکر روانہ کئے، اور فیروز کے لشکر نے اسود کے شہروں پر غلبہ کر کے اس کو قتل کیا، مسیلمہ کو یمامہ میں قتل کیا گیا، طلیحہ وسجاح اسلام کی طرف لوٹ آئے، اور اکثر مرتدین نے پھر سے اسلام قبول کرلیا، اس کے بعد ایک سال نہیں گزرا کہ سب ہی مرتدین دین اسلام میں واپس آگئے، وللہ الحمد (فتح ۱۲/۲۲۴)!

فتح الباری ۱۲/۲۲۵ میں روافض کا بخاری کی حدیث پر اعتراض اور علامہ خطابی کا جواب پھر حافظ کا نقد ونظر بھی لائق مطالعہ ہے۔

افاداتِ عینی! محقق عینیؒ نے عنوانِ استنباط الاحکام کے تحت ۱۲ فوائد قیمہ تحریر کئے، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) علامہ نوویؒ نے لکھا کہ جو بھی واجباتِ اسلام، کم یا زیادہ کا انکار کرے ان سے قتال کرنا واجب ہے اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ ایک بستی کے لوگ اگر ترکِ اذان پر اتفاق کرلیں تو امام وقت کو ان سے قتال کرنا چاہیے اور یہی حکم تمام شعائرِ اسلام کا ہے (۲) نجات اخروی کے لئے پختہ اعتقاد کافی ہے، دلائل وبراہین کا جاننا واجب وشرط نہیں (۳) اہل شہادت میں سے اہل بدعت کی تکفیر درست نہیں (۴) مناظرہ کی کیفیت مذکورہ حدیث سے زیادہ ظاہر سے یہی ہے کہ حضرتِ صدیقؓ، حضرتِ فاروقؓ اور دوسرے صحابہ حاضرینِ مجلسِ مناظرہ حدیث ابن عمرؓ سے واقف نہ تھے، اور اس میں کوئی استبعاد بھی نہیں ہے کہ ایک مدت تک کوئی حدیث بعض اکابرِ صحابہ سے بھی مخفی رہی ہو اور دوسرے درجہ کے صحابہ اس کو جانتے ہوں، جیسے جزیہ مجوس اور طاعون والی حدیثیں بہت سے صحابہ پر ایک مدت تک مخفی رہیں (عمدہ ۱/۲۱۱)!

علمی لطیفہ! عنوان بیانِ لغات کے تحت علامہ عینی نے لکھا کہ حافظ ابن حجر نے (فتح ۱/۵۸ اعصموا کی تحقیق میں) عصمۃ کو عصام سے ماخوذ بتلایا ہے کہ اصل العصمۃ من العصام کہا اعصام اس دھاگے کو کہتے ہیں، جس سے مشکیزہ کا منہ باندھتے ہیں۔

حالانکہ معاملہ برعکس ہے یعنی عصام مشتق ہے عصمۃ سے نہ کہ برعکس، کیونکہ مصادر مشتق منہا ہوا کرتے ہیں، مشتق نہیں لہٰذا ان کو مشتق قرار دینا علم الاشتقاق سے بڑی ناواقفیت کی دلیل ہے (عمدہ ۱/۲۱۰)!

اہل قبلہ کی تکفیر کا مسئلہ

امام بخاریؒ نے یہاں باب فضل استقبال القبلة کے تحت جو احادیث حضرت انسؓ سے نقل فرمائی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ جو بھی توحید کی شہادت دے، اور ہمارے قبلہ کا استقبال کرے، ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے وہ خدا کی پناہ اور ذمہ داری میں آگیا، لہٰذا خدا کی پناہ میں کوئی خلل اندازی نہ کرو، سب کا فرض ہے کہ اس کے جان ومال کی حرمت سمجھ کر اس کی حفاظت کریں بجز اس کے کہ وہ خود ہی اپنے کو قصاص وغیرہ کسی مواخذہ میں مبتلا کرلے، وغیرہ۔

ان احادیث سے ایک اصولی مسئلہ یہ سمجھا گیا کہ کسی اہل قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ان تین باتوں کے ساتھ اس کے عقائد واعمال کیسے ہی خلافِ حق اور قرآن وحدیث کے مخالف ہوں، وہ اہل قبلہ ہی باقی رہے گا کیونکہ ان احادیث میں بھی شہادتِ توحید وغیرہ سے اشارہ اس طرف موجود ہے کہ بہ لحاظِ عقیدہ مقتضیاتِ شہادتِ توحید کے خلاف کوئی امر اس سے صادر نہ ہوا ہو اور بہ لحاظِ عمل قبلہ وذبیحہ کے بارے میں اس نے عامہ مسلمین سے الگ طریقہ اختیار نہ کیا ہو،

سب جانتے ہیں کہ بہت سی احادیث میں صرف توحید سے تمام ایمانیات وعقائد مراد لئے گئے ہیں جیسے **من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة** اور مسلم وغیرہ سے یہاں بھی ہم ذکر کر آئے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ان تمام چیزوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا جو آپ

لے کر آئے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شخص ہمارے ذبیحہ سے پرہیز کرے گا، وہ ضرور ہمارے عقائد سے مختلف عقیدہ رکھتا ہوگا، یا جو شخص ہمارے ساتھ یا ہمارے امام کے پیچھے اپنی نماز جائز نہ سمجھے گا[1]، وہ ہم سے مخالف عقائد والا ہوگا۔

ایک مغالطہ کا ازالہ! بعض لوگوں کو قلتِ علم ونظر کے باعث یہ مغالطہ ہوا ہے کہ اہل قبلہ اور اہل تاویل کی تکفیر درست نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے رسالہ اکفار الملحدین میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، جس کے بعد کسی بھی اہل علم ونظر کے لئے مسئلہ مذکورہ کی صحیح پوزیشن سمجھنے میں دقت پیش نہیں آسکتی، حضرتؒ نے فرمایا کہ ممانعتِ تکفیر اہل قبلہ کا اصل ماخذ سنن ابی داؤد کی یہ حدیث ہے کہ تین چیزیں اصل ایمان ہیں (۱) لا الہ الا اللہ کا اقرار کرنے والے کے جان ومال پر دست درازی نہ کرنا (۲) کسی گناہ کے ارتکاب کی بنا پر اس کو کافر نہ کہنا (۳) کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج نہ سمجھنا الخ (ابوداؤد **باب فی الغز ومع ائمة الجور . کتاب الجهاد ۱/۳۴۲**)

اس حدیث سے دو باتیں خاص معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ کسی گناہ کے ارتکاب کے باعث ایک مسلمان کو کافر یا اسلام سے خارج نہ سمجھا جائے گا، دوسری یہ کہ ارشاد مذکور کا زیادہ تعلق ائمہ جور سے ہے، اسی لئے مذکورہ تین باتوں کے ذکر کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جہاد کا حکم یہ میری بعثت سے دجال کے قتال تک ضرور جاری رہے گا، خواہ ائمہ عدل کے ساتھ ہو کر کیا جائے یا ائمہ جور کے ساتھ ہو کر کرنا پڑے، اس لئے امام ابوداؤدؒ اس حدیث کو عنوانِ مذکور کے تحت لائے ہیں، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے بھی یہ ہے کہ عدم تکفیر اہل قبلہ کا تعلق دراصل امراء اور حکمرانوں سے ہے کہ ان کی پوری اطاعت ضروری ہے اور جب تک ان سے کھلا ہوا کفر ایسا نہ دیکھ لیا جائے کہ اس کے کفر ہونے پر قرآن وحدیث کی روشنی میں دلیل وبرہان موجود ہو، ان کے خلاف بغاوت کرنا جائز نہیں، جیسا کہ بخاری ومسلم کی احادیث میں مروی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کا کھلا ہوا کفر اگر کسی میں دیکھ لیا جائے تو پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اُس کو قائل کر کے لاجواب بھی کر دیا جائے، یا اس کے کھلے ہوئے قولی یا فعلی کفر وشرک کی اس سے تاویل معلوم کی جائے (کیونکہ اس کے معاملہ کو اُن دیکھنے والے اہل علم ونظر کے فیصلہ ورائے پر محول کر دیا گیا ہے، جن کی نظر قرآن وحدیث کے دلائل وبراہین پر حاوی ہو) کسی گناہ کی وجہ سے عدم تکفیر کی بات امام ترمذیؒ نے ابواب الایمان میں باب لا یزنی الزانی وهو مومن کے تحت اختیار کی ہے جس کا حوالہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اکفار ۱۲ کے حاشیہ میں دیا ہے۔

حضرتؒ نے اس مغالطہ کو بھی رفع کیا کہ بہت سے جاہلوں نے امام اعظم کی طرف بھی عدم تکفیر اہل قبلہ کی بات مطلقاً منسوب کر دی ہے حالانکہ محقق ابن امیر الحاج نے شرح تحریر ۳/۳۱۸ میں امام صاحب کا قول بھی **ولا نکفر اهل القبلة بذنب** نقل کیا ہے اور ان کا یہ ارشاد حسبِ تحقیق علامہ نوح آفندیؒ صرف معتزلہ اور خوارج کی تردید کے لئے ہے (کہ خوارج گناہ کبیرہ کی وجہ سے مسلمان کو کافر کہتے ہیں اور معتزلہ اس کو ایمان سے خارج اور مخلد فی النار قرار دیتے ہیں، لیکن ہم اہل السنۃ والجماعت نہ اس کو گناہ کبیرہ کے باعث کافر کہتے ہیں نہ اسلام سے خارج اور مخلد فی النار، بلکہ مسلمان اور لائق مغفرت مانتے ہیں) امام صاحب کی طرف غلط بات اس لئے بھی منسوب ہوگئی کہ سب نے آپ کا قول منتقیٰ کے حوالہ سے بغیر بذنب کے نقل کیا ہے، مثلاً شرح مقاصد ۲/۲۶۹ اور مسایرہ ۲/۲۱۴ میں وغیرہا حالانکہ بذنب کی قید موجود تھی، اور اسی لئے حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی کتاب الایمان ۱۲۱ میں لکھا کہ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت اس امر پر متفق ہیں کہ گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر نہ کہا جائے تو اس گناہ سے مراد، زنا، شراب خوری وغیرہ معاصی ہوتے ہیں، علامہ نوویؒ نے بھی شرح عقیدہ طحاویہ

---

[1] مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی نے فتاویٰ احمدیہ جلد اول ۱۸ میں اپنے ایک متبع کو لکھا: کسی شخص کے پیچھے بھی جو ہم پر ایمان نہیں لایا، نماز نہ پڑھو، تمہارا فرض ہے کہ اُس امام کو ہمارے حالات سے واقف کرو، پھر اگر تصدیق کرے (میری نبوت وغیرہ کی) تو بہتر، ورنہ اس کے پیچھے اپنی نماز ضائع مت کرو، اور اگر کوئی خاموش رہے کہ نہ تصدیق کرے نہ تکذیب تو وہ منافق ہے اس کے پیچھے بھی نماز نہ پڑھو (بحوالہ اکفار الملحدین (عربی) ۱۱۱) "**الیوم اکملت لکم دینکم**" کے بعد کسی بھی نئے عقیدہ یا عمل کو صحتِ نماز وامامت کے لئے فرض وضروری قرار دینا اس امر کی صریح شہادت ہے کہ اس کا دین ومذہب سب مسلمانوں سے الگ ہے، اور علمائے امت نے لکھا ہے کہ کسی کے کافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو کافر کہتا یا سمجھتا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم! "مؤلف"

میں ۲/۴۶۴ پر اس کی پوری طرح وضاحت کی ہے۔اور لکھا کہ بذنب کی قید بتارہی ہے کہ فسادِ عقیدہ کی بنا پر ضرور کافر کہا جائے گا، (نقلہ الملا علی قاریؒ فی شرح الفقہ الاکبر ۱۹۶)

فسادِ عقیدہ کے سبب تکفیر

امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابویوسف وامام محمدؒ سے مروی ہے کہ جو شخص قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے (شرح فقہ اکبر ۳۰)

جو شخص رسول اکرم ﷺ کے لئے بُرے الفاظ کہے یا آپ کو جھوٹا کہے یا کسی قسم کی بھی توہین کرے وہ کافر ہے اور اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی (کتاب الخراج امام ابویوسفؒ ۱۸۲)

حضرت رسول اکرم ﷺ پر سب وشتم کرنے والا کافر ہے اور جو کوئی اس کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے، اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ (شفاء قاضی عیاض)

انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کو بھی سب وشتم کرنے والا کافر ہے، جس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی، اور جو شخص ایسے شخص کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے (مجمع الانہر، درمختار، بزازیہ، درر، خیریہ)

مواقف میں ہے کہ اہل قبلہ میں سے صرف اسی قول وفعل پر تکفیر کی جائے گی، جس میں ایسے امر کا انکار پایا جائے، جس کا رسول اللہ محمد ﷺ سے ثبوت یقینی طور پر ہو چکا ہو، یا وہ امر مجمع علیہ ہو، حدیث من صلیٰ صلاتنا سے بھی یہی مراد ہے کہ تمام دین کو مانتا ہو اور کسی بھی موجب کفر عقیدہ اور قول وفعل کا مرتکب نہ ہو نہ یہ کہ جو شخص بھی یہ تین کام کرے وہ مسلمان ہے خواہ کیسے ہی کفریہ عقائد واعمال کا مرتکب ہو (شرح فقہ اکبر ۱۹۵)

وہ شخص بھی کافر ہے جو ہمارے نبی اکرم ﷺ کے بعد اپنے لئے نبوت کا دعویٰ کرے یا جو آپ کے سوا کسی جدید مدعیِ نبوت کی تصدیق کرے کیونکہ آپ بہ نصِ قرآن وحدیث خاتم النبیین اور آخری پیغمبر تھے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آخری زمانہ میں آسمان سے اُتریں گے، وہ چونکہ پہلے ہی نبی ہیں اس لئے اعتراض نہیں ہوسکتا، دوسرے وہ خود بھی ایک امتی کی طرح قرآنی شریعت کا ہی اتباع کریں گے۔)

چونکہ صریح اور مجمع علیہ نصوص میں تاویل وتحریف یقینی طور پر موجب تکفیر ہے، اس لئے وہ شخص بھی کافر ہوگا جو ایسی تاویل وتحریف والے کو کافر نہ کہے یا اس میں توقف وتردد کرے، کیونکہ یہ شخص ایک مسلّم کافر کو کافر کہنے کی مخالفت کر کے خود بھی اسلام کی مخالفت کرتا ہے، جو دین پر کھلا ہوا طعن اور اس کی تکذیب ہے (شرح الشفاء للخفاجی والملا علی قاریؒ)

جو شخص اس بات کو نہ جانتا ہو کہ حضرت مولانا سیدنا محمد ﷺ آخری نبی ہیں، وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ امر ضروریات میں سے ہے (الاشباہ والنظائر) واضح ہو کہ بابِ مکفرات میں ضروریات سے لاعلمی[1] عذر نہیں ہے۔

اِس امر پر امت کا اجماع ہو چکا ہے کہ جن امور کا حضور ﷺ سے ثبوت بطور اجماع ہم تک پہنچ گیا، ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی موجب کفر ہے، اسی طرح جو کوئی حضور علیہ السلام کے بعد کسی کو نبی مانے یا آپ کے کسی ثابت شدہ کو نہ مانے وہ کافر ہے (الفصل لابن حزم

---

[1] آج کل بہت سے نوجوان مسلمان عقائدِ اسلامی اور ضروریاتِ دین سے ناواقفیت کی وجہ سے جنت دوزخ وغیرہ کے وجود سے انکار کر دیتے ہیں، وہ کفر کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں اور ناواقفیت عذر نہیں ہے، کیونکہ سارے قطعی امورِ اسلام کا جاننا اور ماننا فرض وضروری ہے، حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن ۳/۷ و ۲/۷ و ۲/۷ میں پوری تفصیل سے لکھا ہے کہ صحتِ نکاح کے لئے مرد وعورت کے کن کن عقائد کی درستی ضروری ہے اور لکھا کہ جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے لیکن اسکے عقائد کفر تک پہنچے ہوں، تو اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد ہو جائیں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

لہٰذا پیغام آنے کے وقت لڑکی والوں پر واجب ہے کہ اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں، جب اس طرف سے اطمینان حاصل ہو تب اس پیغام کو قبول کریں ورنہ نہیں، اور اگر پہلے سے معلوم نہ ہو اور بعد کو خرابی کا علم ہو تو نکاح کے بعد تعلق ختم کرا دیں، یہ سرپرستوں کا فرض ہے، اور منکوحہ لڑکی کو بھی چاہیے کہ وہ علیحدگی اختیار کرے۔

(۳/۲۵۵) جو شخص بھی کسی قطعی حکم شرعی کا انکار کرتا ہے وہ اپنی زبان سے کہے ہوئے اقرار لا الہ الا اللہ کی تردید کرتا ہے (سیر کبیر للامام محمدؒ ۲/۶۵۴)

نہ صرف ضروریاتِ دین کی تاویل یا انکار کفر ہے بلکہ حنفیہ کے نزدیک ہر قطعی الثبوت امر کا انکار بھی کفر ہے اگرچہ وہ ضروریاتِ دین میں سے نہ بھی ہو (ردالمختار ۳/۲۸۴ مسایرہ ۲۰۸)

ضروریاتِ اور قطعیات میں کوئی بھی تاویل مسموع نہیں اور تاویل کرنے والا کافر ہوگا۔ (کلیات ابی البقاء ۵۵۳) ضروریاتِ دین میں تاویل کفر سے نہیں بچاسکتی (عبدالحکیم سیالکوٹی علی الخیالی، اور خیالی میں بھی اسی طرح ہے)

فرقہ اہلِ بدعت اہلِ قبلہ میں داخل ہے اس کی تکفیر میں اس وقت تک جرات نہ کی جائے جب تک وہ ضروریاتِ دینیہ کا انکار نہ کریں، اور متواتراتِ احکام شرعیہ کو رد نہ کریں، اور ان امور کو قبول کرنے سے انکار نہ کریں جن کا دین سے ہونا یقینی (اور بدیہی وضروری) طور پر معلوم ہے (مکتوباتِ امام ربانیؒ ۳/۳۸ و ۸/۹۰)

جو شخص یمامہ والوں کے حق میں تاویل کر کے اُن کو مسلمان ثابت کرے وہ کافر ہے اور جو شخص کسی قطعی اور یقینی کافر کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے (منہاج السنہ للحافظ ابن تیمیہؒ ۲/۲۳۰)

ایک مغالطہ کا ازالہ! فقہاء نے ایسے شخص کو مسلمان ہی کہا ہے جس کے کلام میں ۹۹ وجہ کفر کی موجود ہوں اور صرف ایک وجہ اسلام کی، اس کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ حکم عام نہیں ہے، بلکہ اس وقت ہے کہ قائل کا صرف ایک کلام مفتی کے سامنے آئے اور اس کا کوئی دوسرا حال معلوم نہ ہو تو مفتی کو معاملہ تکفیر میں احتیاط کرنی چاہیے لیکن اگر کسی شخص کا یہی یا اس جیسا دوسرا کلمہ کفر اس کی تحریروں میں موجود ہو، جس سے یقین ہوجائے کہ معنی کفری ہی مراد لیتا ہے یا وہ خود اپنے کلام میں معنی کفری کی تصریح کردے تو باجماع فقہاء ایسے شخص پر کفر کا حکم لگایا جائے گا، اور اس کو مسلمان ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

خلاصہ! (۱) عدم تکفیر اہل قبلہ کا حکم غیر ضروریاتِ دین وغیرامور قطعی الثبوت سے متعلق ہے (۲) حکم عدم تکفیر اہلِ قبلہ کا تعلق امراء وحکمرانوں سے ہے (۳) حکم مذکور کا تعلق ذنوب کے ساتھ ہے نہ کہ عقائد وایمانیات کے ساتھ۔

ہم نے اکفار الملحدین کے مضامین کا خلاصہ اوپر پیش کردیا ہے باقی علماء اور اہل تحقیق ونظر کا پوری کتاب ہی کا مطالعہ کرنا چاہیے، ورنہ دور سے شاید وہ بھی یہی خیال کریں کہ "دار التکفیر" والوں نے یوں ہی بے تحقیق کچھ لکھ پڑھ دیا ہوگا۔ "والناس اعداء ماجھلوا"

مسئلہ حیات ونزولِ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

یہ مسئلہ بھی ضروریاتِ دین اور متواترات سے متعلق ہے، اس لئے ایمان کا جزوِ اعظم ہے، شروع سے آج تک کتبِ عقائد میں اس کو بڑی اہمیت سے ذکر کیا گیا، اور خاص طور سے امام مسلم نے تو نزول عیسیٰ علیہ السلام کو ابوابِ ایمان کا جز وقرار دیا ہے، پھر یہ کہنا کتنی کم علمی کا اظہار ہے کہ نزول مسیح علیہ السلام کا مسئلہ چونکہ ایک جزئی مسئلہ ہے اس لئے اس کو عقائد وایمانیات کا درجہ حاصل نہیں تقریباً ۳۵ سال پہلے کی بات ہے کہ انقلاب لاہور میں مولانا آزاد کا ایک خط کسی مستفسر کے جواب میں شائع ہوا تھا، جس میں تھا کہ کوئی مسیح آنے والا نہیں ہے، اس کی فکر میں نہ پڑیں، وغیرہ، احقر نے مولانا سے خط وکتابت کی، وہ اس وقت کلکتہ میں تھے، میں نے لکھا کہ آپ نے ایسی بات کس طرح لکھدی جبکہ یہ مسئلہ عقائد وایمانیات میں داخل ہے، جواب آیا کہ اس عقیدہ سے مسلمانوں میں یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ کچھ نہ کریں اور مسیح آئیں گے جب ہی کچھ فلاح کی صورت ہوسکے گی اور یہ ایمان کا جز نہیں ہے، احقر نے لکھا کہ بخاری ومسلم اور دوسری کتبِ صحاح میں تو ان کی آمد کو کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، اس لئے اگر مسلمان اُس اچھے وقت کی امید وانتظار کریں تو کیا برائی

ہے؟اور جب نزولِ مسیح علیہ السلام کا ثبوت احادیثِ متواترہ سے ہے تو اِس پر یقین وایمان یا عقیدہ رکھنا تو خود ہی ضروری ہوگیا،اس پر مولانا نے جواب دیا کہ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ احادیث صحاح میں اس کا ذکر ہے،لیکن وہ بطورِ علامتِ قیامت کے ہے،اس لئے ایمان کا جزو نہیں بنتا،اس کے ساتھ پھر بطورِ طنز کے یہ جملہ بھی ارشاد ہوا کہ میں تو حدیث کو ان لوگوں سے بھی زیادہ مانتا ہوں،جو کسی امام کے قول کی وجہ سے حدیث کو ترک کردیتے ہیں،گویا یہ جملہ اپنی عدم تقلید کی پختگی اور عصبیت کا اظہار واعلان تھا،اور ساتھ ہی اس امر کا بھی بیّن ثبوت کہ موصوف کو ائمہ مجتہدین خصوصاً ائمہ حنفیہ کے مدارکِ اجتہاد سے متعلق کوئی بصیرت حاصل نہ تھی،بلکہ اتنے قریب ہوکر علماءِ[1] دیوبند کے مسلکِ اعتدال اور طرزِ تدریس وتحقیق سے بھی ناواقف تھے ورنہ ایسے بے محل جملہ سے ہم لوگوں پر طنز وتعریض کیا ضروری تھی؟ خیر!

---

[1] **گفتنی یا ناگفتنی!** بعض لوگوں کا خیال ہے واللہ تعالیٰ اعلم کہ ''تذکرہ'' میں بھی حنفیہ اور علمائے دیوبند کے خلاف کافی زہرافشانی ہوچکی تھی،اور شاید مولانا آزاد کے الگ دینی ذہن اور مکتبِ خیال کے پیشِ نظر ہی لاہور میں علماءِ دیوبند نے ان کی امارت قبول کرنے سے اجتناب کیا تھا،مگر قسمت کی خوبی کہ آزادی کے صدقہ میں وہ امارت کا خواب پورا ہوگیا،اور دارالعلوم دیوبند،جمعیۃ علماءِ ہند اور مسلمانانِ ہند کی سربراہی کے وہ بلاشرکتِ غیرے مالک بن گئے جبکہ دینی ذہن وافتادِ خیال کے لحاظ سے وہ مسلمانانِ ہند کے سوادِ اعظم سے کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے،اس کے بعد جو کچھ سامنے آیا وہ سب کو معلوم ہے کہ ان کی سربراہی میں مسلمانوں کا زمینداراہ بالکلیہ منسوخ ہوا کہ تھوڑی تھوڑی سی آراضی بھی بقدرِ گزارہ ان کے پاس باقی نہ رہ سکیں،حالانکہ انگریزی دور میں موروثی کے قانون کو بھی خلافِ شریعت اور مداخلت فی الدین قرار دیا جاچکا تھا اور موروثی جائیداد کی آمدنی کو علماءِ نے ناجائز وحرام کہا تھا،کشمیر میں باوجود وعدوں کے رائے شماری نہ کرائی گئی،فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف کوئی سخت قدم نہ اٹھایا گیا،اردو کا مسئلہ بھی بدستور الجھارہا،اور مولانا آزاد ہی نے آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا کہ اپنے مستقل سیاسی زندگی کا وجود ختم کردو،چنانچہ کیرالا و مدارس کے سوا سارے مسلمانوں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا،اور وہ بزدل بن کر سیاسی موت مرگئے۔جس طرح مولانا نے اپنی تفسیر بیان القرآن ۳۲۰/۳ میں آیت **فقال لھم اللہ موتوا ثم احیاھم** کی تفسیر میں خاص تحقیق فرمائی تھی کہ وہ لوگ بزدلی کے باعث دشمنوں سے مغلوب ہوگئے تھے،یہی ان کی موت تھی،پھر خدا نے عزم وثبات کی روح ان میں پھونک دی جس کی وجہ سے وہ دشمنوں کے مقابلہ پر آمادہ ہوسکے اور فتح مند ہوئے،اور یہی ان کی (گویا سیاسی) زندگی تھی (حقیقی موت یا زندگی مراد نہیں) بات اپنی جگہ درست ہے اور اس کو سب جانتے ہیں خصوصاً مسلمان کہ ان کا مذہب تو بغیر سیاست کے بالکل ہی بے روح ہے مگر اس کو مولانا نے آیت مذکور کی تفسیر کے طور پر بے محل پیش کیا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ قصہ اہل اذرعات یا بنی اسرائیل ہی کا کسی قدیم زمانہ کا بیان فرمایا ہے،جن کی تعداد چالیس ہزار تک مروی ہے اور وہ سب طاعون وموت کے ڈر سے اپنے شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں کی طرف نکل گئے تھے،اور وہاں بھی موت سے نہ بچ سکے تھے،پھر ایک مدت کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے خدا نے اپنے فضل وقدرت کا اظہار کرنے کے لئے ان کو پھر سے زندہ کردیا تھا اور یہ موت وزندگی واقعی اور حقیقی تھی (محض سیاسی نہیں) (جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں بھی ہے۔جس کو مولانا آزاد بھی معتبر تفاسیر میں شمار کرتے تھے)

مولانا مودودی کی مسامحت: اس مقام پر مولانا مودودی سے بھی بڑی مسامحت ہوگئی کہ اس آیت کا مصداق اُن بنی اسرائیل کو قرار دیدیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکل کر وادی تیہ میں گئے تھے،اور وہاں ان کی ایک نسل ختم ہوگئی اور دوسری نسل اٹھی جس نے کنعانیوں پر غلبہ حاصل کیا،انہوں نے لکھا کہ معلوم ہوتا ہے،اس معاملہ کو حق تعالیٰ نے موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے (تفہیم القرآن ۱/۱۸۴)

واضح ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے،وہ ان کا نکلنا بحکم خداوندی تھا،اور اس کو حق تعالیٰ نے بڑی تفصیل سے بطور اظہارِ نعمت کے بیان فرمایا ہے کہ ہم نے تمہیں آلِ فرعون کی غلامی سے نکال کر سمندر کو پھاڑ کر راستہ بنا کر بخیریت گزروایا تھا،اور وہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرق کردیا تھا۔(بقرہ آیت ۴۹ و ۵۰)

اور سورۂ یونس آیت ۸۹ و ۹۰ سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ وہارون دونوں نے فرعون اور اس کے لوگوں کے لئے ہلاکت کی دعا کی تھی جو قبول کرلی گئی اور بنی اسرائیل کو سمندر سے گزارا گیا تاکہ پیچھے فرعون اور اس کا لشکر بھی چلے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ مع لشکر کے غرق ہوا،اور سورۂ طٰہٰ آیت ۷۷ میں یہ بات بھی کھول دی تھی کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی تھی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ،اور ان کے لئے سمندر میں سوکھی سڑک بنالے تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ سمندر کے بیچ سے گزرنے ہوئے ڈر لگے،اور سورۂ اعراف آیت ۱۳۶ میں **فانتقمنا منھم** الخ فرمایا کہ تب ہم نے فرعون اور اس کے اتباع کرنے والوں سے انتقام لیا،اور انھیں سمندر میں غرق کردیا،کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے غفلت برتی تھی،اس سے معلوم ہوا کہ ان کو سزا ہی دینی تھی،جس کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا ایک ظاہری سبب بن گیا تھا کہ سارے مصر کے بڑے بڑے سردار اعیانِ سلطنت وامراء اور شہزادے،کافر ومشرک عوام سب ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام وبنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کو نکل کھڑے ہوئے تاکہ ان کو ملک سے نکال دیں یا ختم کردیں،مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی خدائے تعالیٰ کے وعدہ نصرت پر اطمینان سے نکل کھڑے ہوئے تھے،ان کو کچھ خوف فطری طور پر صرف اس وقت ہوا کہ فرعون اور اس کے لوگ ان کے بالکل قریب ہی پہنچ گئے،اِدھر ان کو گھبراہٹ ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو دلاسا دیا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہاں اس مسئلہ پر مزید روشنی کے لئے ابن عطیہ کا ارشاد قابل ذکر ہے کہ: تمام امت محمدیہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قربِ قیامت میں بجسم عنصری تشریف لانے والے ہیں۔ جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے، اور اجماع کے بارے میں، ہم یہاں حافظ ابن تیمیہؒ کا قول پیش کرتے ہیں (جن کو مولانا آزاد بھی اپنا بہت بڑا مقتدا تسلیم کرتے تھے): ''صحابہ کرام کا اجماع قطعی حجت ہے اور اس کا اتباع فرض ہے بلکہ وہ سب سے بڑی حجت اور دوسرے تمام دلائل پر مقدم ہے'' (اقامۃ الدلیل ۱۳۰/۳)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر امت کے اجماع اور تواتر کی تصریح کی ہے (فتح الباری ۳۵۷/۶، تلخیص الحبیر باب الطلاق، تفسیر ابن کثیر ۵۸۲/۱ و ۱۳۲۱/۳/۴)

لمحہ فکریہ! حضرت شاہ صاحب علامہ کشمیری، حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان صاحب، راس المتکلمین علامہ عثمانیؒ وغیرہ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کہ ہم تو خدا کے حکم سے ادھر آئے ہیں وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا، اور اُدھر وحی آگئی کہ سمندر پر اپنا عصا مارو، فوراً ہی سمندر پھٹا، اور پہاڑوں کی دروں کی طرح کا راستہ بن گیا، درمیان سمندر تک فرعون اور اس کے بے شمار ساتھی بھی چلتے رہے، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سارے ساتھی ایک ایک دوسرے کنارے پر عافیت و سلامتی کے ساتھ پہنچ گئے، اور فرعون مع اپنے ساتھیوں کے یک دم ہی سب غرق ہو گئے، کوئی ایک بھی نہ بچ سکا۔

سورۂ شعراء آیت ۵۲ میں مزید وضاحت ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، تمہارا پیچھا کیا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ نکلنے کا مقصد سارے فرعونیوں کو بطریق مذکور عذاب الٰہی میں مبتلا کرنا تھا، غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا وحی الٰہی کے تحت اور خاص مقاصد و مصالح کے لئے تھا، اس کا حضرت حزقیل علیہ السلام والے واقعہ سے نہ کوئی جوڑ ہے نہ مناسبت، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام مع قوم بنی اسرائیل کے کوہ طور کے میدان میں جا کر رہے، اور بہت سے احوال و واقعات پیش آئے اور ان سب کے بعد یہ حکم ملا تھا کہ جاؤ! ظالم کنعانیوں کو ارض فلسطین سے نکال دو اور اس علاقہ کو فتح کر لو، تو ان بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو کر جہاد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہنے لگے اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون الآیہ (مائدہ) (آپ اور آپ کا پروردگار جا کر جہاد و قتال کر لیں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) خیال کیجئے کہ اس قصہ کا جوڑ کس طرح اُس دوسرے قصہ سے لگا دیا اور دونوں کو ایک کر دیا، کیا صرف اس لئے کہ خدا کی حقیقی اماتہ واحیاء والی بات کو ہم عقلی طور پر سمجھنے سے عاجز ہیں۔

پھر حق تعالیٰ نے تو فرمایا کہ جو لوگ موت کے ڈر سے شہروں کو چھوڑ کر نکلے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے موت دے دی اور پھر ان کو ہی زندہ بھی کر دیا تا کہ وہ اس کے فضل و قدرت کا مشاہدہ کر لیں اور آئندہ بزدلی اور ڈر کو دل سے نکال کر احکام الٰہی کی اطاعت پر کمربستہ ہوں اگر ایک نسل ختم ہوئی اور دوسری پیدا ہوئی تو اس سے خدا کے خاص فضل و قدرت کا مظاہرہ کیا ہوا، یہ تو ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے خاص بات کیا تھی جس کے سبب یہ قصہ اتنے اہتمام سے بیان کیا گیا اور قصہ مذکور بیان کر کے ان الله لذوفضل علی الناس کا جملہ کس لئے ارشاد ہوا؟ سب سے زیادہ یہ کہ فقال لهم الله موتوا ثم احياهم کا منطوق صاف بتلا رہا ہے کہ جن کو موت دی تھی پھر ان ہی کو زندہ فرمایا، عربیت کا صحیح ذوق رکھنے والا بھی اس سے ایسا نہیں سمجھ سکتا کہ واقع میں جو ایک نسل خود ہی اپنی عمر طبعی پر ختم ہوئی تھی، اور دوسری نسل عادی طریق پر وجود میں آئی تھی تو پہلی نسل کو تو حق تعالیٰ نے موتوا فرمایا اور دوسری کے وجود عادی کو بغیر کسی وجہ خاص کے فاحیاھم سے تعبیر فرما دیا، درحقیقت جیسا کہ مولانا مودودی نے آگے خود ہی ۲۰۲/۱ حاشیہ ۲۹۷ میں لکھا ہے انبیاء علیہم السلام کو بہت سے امور غیبیہ کے عینی کے مشاہدات کرائے گئے ہیں اور احیاء و اماتہ کے قرآنی واقعات کا تعلق بھی اسی امر سے ہے اور غالباً انبیاء سابقین کے طفیل میں پہلی امتوں کو بھی اس قسم کے مشاہدات کرائے گئے ہیں جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ سب چالیس ہزار آدمی مر گئے اور خدا کے حکم سے پھر زندہ بھی ہو گئے اور انہوں نے خدا کے فضل و قدرت کا عینی مشاہدہ کر لیا۔

اسی طرح سرورِ انبیاء علیہم السلام کو چونکہ سب سے زیادہ امور غیبیہ اور ملکوت السموات کے علاوہ سدرہ و طوبیٰ، جنت اور عرش تک کے مشاہدات کرائے گئے تو آپ کے طفیل میں امت محمدیہ کے افراد کو بھی بہ کثرت امور غیبیہ کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

حضرت تھانویؒ نے لکھا:۔ پہلی امتوں میں سے کسی کا قصہ ہے، طاعون یا جہاد سے بھاگے تھے خدا نے یہ بات دکھلائی کہ موت و حیات سب ہی اس کے قبضہ قدرت میں ہے، چنانچہ ان کو ایک دم سے موت آگئی پھر حق تعالیٰ نے ان کو حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا کے بعد زندہ کر دیا تا کہ بلا سبب موت اور بلا سبب حیات دونوں کا ان کو مشاہدہ ہو جائے، اور فضل سے مراد خواہ خود ان کا زندہ کرنا یا اعتقاد درست کر دینا ہے، یا امتِ محمدیہ کو یہ قصہ سنا کر ان کے عقیدہ و عمل کی اصلاح ہے جو بلا شبہ بڑا فضل ہے یعنی ان کو تلقین کی گئی کہ جہاد وغیرہ سے بسبب خوفِ موت پسپا نہ ہوں اور موت و حیات سب قبضہ الٰہی میں سمجھیں (بیان القرآن ۹۸/۲)

بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو بھی تھوڑی بہت قیادت کا مقام حاصل کر لیتا ہے، وہ تفسیر ضرور لکھتا ہے، اور بیسیوں جگہ علمائے سلف اور قدیم مفسرین کے خلاف اپنی لئے رائے پیش کر دیتا ہے، قرآن مجید کو سمجھنے کا ارادہ رکھنے والے کس تفسیر کو درست سمجھیں اور کس کو غلط؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح و صواب کی توفیق بخشے اور غلطیوں کے ارتکاب سے محفوظ کرے۔ آمین! ''مؤلف''

دارالعلوم سے علیحدگی[1] چونکہ خاص سیاسی اسباب ووجوہ کے تحت عمل میں لائی گئی تھی اور دارالعلوم کی تاریخ میں وہ گویا علمی اقدار کی شکست اورسیاسی اقدار کی پہلی فتح تھی، اسی لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ ان حضرات کے علمی اثرات کو بھی ختم کیا جائے اور شاید اسی جذبہ کے تحت مرزائیوں کے بارے میں سوال پر طلبہ کو یہ جواب بھی دیا جاتا ہوگا کہ "دار التکفیر" والوں سے جا کر دریافت کرو، یہ دارا لتکفیر والے وہ چند اساتذہ تھے جو حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ کے مکتبِ فکر کے پیرو تھے، اسی طرح اگر کوئی استاذِ تفسیر مولانا آزاد کی تفسیر پر درس میں کچھ نقد کرتا تھا، تو اس کو بھی اوپر کے حضرات روکنے کی باتیں کرتے تھے، گویا بلا خوفِ لومتہ لائم احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے فریضہ کو (جو ہمیشہ سے دارالعلوم کا طرۂ امتیاز رہا تھا) سیاسی مصالح کے تحت نظرانداز کرنے کی ابتداء کردی گئی تھی۔

مولانا آزاد کی تفسیر پر نفحۃ العنبر اور مقدمہ مشکلات القرآن میں کافی نقد آچکا تھا، اور جب مولانا آزاد ۳۸ھ میں جامعہ ڈابھیل گئے تھے تو مشکلات القرآن وغیرہ مطبوعاتِ مجلس علمی وہاں ان کو پیش بھی کردی گئی تھیں، اور اب انوار الباری میں بھی حسبِ ضرورت غلطیوں کی نشان دہی ضرور کی جاتی ہے۔

یہ بھی دارالعلوم ہی سے خوشہ چینی کا فیض ہے کہ ہمیں کچھ کام کرنے کی توفیق ملی، مرزائیوں کی تکفیر کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے، ساری دنیا کے علماءِ نے ان کے عقائد معلوم کرنے کے بعد بالاتفاق تکفیر کی ہے، اور اکفار الملحدین میں سارے دلائل اسی سے متعلق ہیں اور کفروایمان کی حدود کیا ہیں، اسی پر ساری امتِ محمدیہ کے علمائے سلف کے فیصلے پیش کئے ہیں یہ کتاب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی صدارتِ تدریس دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں مع تقاریظ اکابر دارالعلوم شائع ہوچکی تھی، اس لئے یہ بات کم تکلیف دہ نہیں کہ دارالعلوم کی علمی دنیا میں ایسا انحطاط یکدم آجائے کہ مہماتِ مسائل کی تحقیق اور اہم علمی غلطیوں کی نشان دہی کو طعن وطنز اور تعریض کا نشانہ بنایا جائے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

آپ کا ذکرِ مبارک قصص القرآن مولفہ حضرت مولانا محمد حفیظ الرحمان صاحبؒ میں تفصیل سے کیا گیا ہے، آپ کا زمانہ نبوت حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، اور تفسیر ابن کثیر، روح المعانی، اور تفسیر کبیر وغیرہ میں آیتِ بقرہ الم تر الی الذین خرجوا کے تحت یہی قصہ زمانہ حضرت حزقیل علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے، جمہور مفسرین کی رائے مذکور سے الگ، ایک قول تابعی مفسر ابن جریج کا یہ بھی ہے کہ یہ کوئی

---

[1] دارالعلوم دیوبند کا انقلاب! ۱۳۴۵ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ اکابر کی علیحدگی کے اسباب ووجوہ تو کافی تفصیل طلب ہیں، جن کو مورخ کا قلم لکھے گا، سب سے زیادہ اہم وجہ وہ تجویز تھی جو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم نے ۴۴ھ میں مجلسِ شوریٰ پر اپنا غیر معمولی اثر ورسوخ استعمال کر کے پاس کرائی کہ (حتی الوسع بشرطِ اہلیت اس خاندان (قاسمی) میں اہتمام کو مرجح رکھا جائے) اور اس تجویز کو شرعی دلائل سے ماخوذ بھی قرار دیا گیا، حالانکہ یہ تجویز علاوہ خلافت شانِ دارالعلوم ہونے کے، اسلاف واکابر دارالعلوم کے بلند مطمح نظر اور ان کی ہدایات ووصایا کے بھی مخالف تھی، سب سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور مسجد دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے اس کلمہ حق کا اعلان فرمادیا کہ "مدرسہ وقف ہے ارث نہیں" آپ کی ہمنوائی دوسرے حضرات اکابر واساتذہ نے بھی کی اور سب نے دارالعلوم سے احتجاجاً علیحدگی اختیار کرلی، کیونکہ مہتمم صاحب تجویز مذکور کو بدلنے یا دوسری مطلوبہ اصلاحات کے نفاذ کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوسکے، اور اس کے مقابلہ میں انہوں نے ان سب اکابر اور بہت سے اساتذہ کی علیحدگی کو ترجیح دی، بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں (جن کے وہ ہمیشہ بہت ہی مدح رہے تھے) یہ بھی کہہ دیا کہ، شاہ صاحب کو دارالعلوم کی ضرورت ہے، دارالعلوم کو شاہ صاحب کی کوئی ضرورت نہیں، دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں، مگر بظاہر ناقدری کی اتنی بڑی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی، پھر پہلی بات تو غلط ہی ثابت ہوئی، کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ تازندگی مہتمم صاحب کے دارالعلوم کی طرف محتاج نہ ہوئے، البتہ دوسری ایک حد تک درست ہوگئی کہ دارالعلوم کو شاہ صاحب ایسا "چلتا پھرتا کتب خانہ" پھر میسر نہ ہوا، اور نہ شاید اس کو اس کی ضرورت پیش آئی۔

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ افسوس صد افسوس   ع جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی۔

راقم الحروف نے ان حضرات نفوس قدسیہ کی علیحدگی کے بعد بھی چند ماہ دارالعلوم میں گزارے، اور دورہ کا سال پورا کیا تھا، سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ تحریکِ اصلاح کو افساد کا نام دیا گیا، اور مخلصین کو اصحابِ غرض ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، یعنی   ع خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد   "مؤلف"

واقعہ نہیں بلکہ صرف تمثیل کی صورت ہے لیکن ہمارے علم میں سلف میں سے یہ کسی نے بھی نہیں لکھا کہ یہ واقعہ وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام و بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنے کا ہے، بظاہر یہ سب سے پہلی مولانا مودودی صاحب ہی کی دماغی اختراع ہے اور آپ نے اس کے لئے کسی تفسیر وغیرہ کا حوالہ بھی نہیں دیا، اگر چہ ایسے بڑوں کو کسی کی تائید کی ضرورت بھی نہیں، یہ تو ہم جیسی چھوٹوں کو ہی اسکی فکر و تلاش رہتی ہے۔

جدید تفاسیر! راقم الحروف کا موضوع تفسیری مباحث نہیں ہیں، خصوصاً تفہیم القرآن، یا ترجمان القرآن کی تحقیقات کے مطالعہ کی نوبت تو بہت ہی کم آتی ہے، اگر چہ ارادہ ضرور ہے کہ انوار الباری کے بعد کچھ کام اس سلسلہ کا بھی کیا جائے اور جدید تحقیقاتِ تفسیر یہ کا بھی جائزہ لیا جائے، تاکہ مفید و صالح مواد کے لئے قدر دانی اور شکر گزاری کا حق ادا کیا جائے، اور مضر یا غیر مفید تفردات، مسامحات و شطحیات کی نشاندہی کر کے ان کی تردید بھی خوش اسلوبی کے ساتھ ہو جائے۔ و لامر بید اللہ۔

ترجمان القرآن میں تو مضامین کی غلطیاں کافی تعداد میں نظر سے گزری ہیں، اور ان پر متفرق طور سے لکھا بھی جا چکا ہے تفہیم القرآن سے توقع نہ تھی کہ اس میں ایسے تفردات بھی ہوں گے، جن کی مثال اوپر ذکر ہوئی ہے اس لئے یہاں کچھ لکھنا ضروری سمجھا گیا، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم!

ایمان و اسلام وضروریاتِ دین کی تشریح

قرآن وحدیث و اجماع سے ثابت شدہ تمام امورِ غیبیہ اور اعمالِ طاعت کو ماننا ایمان ہے اور اعمال کی ادائیگی اسلام ہے، پھر ان تمام ثابت شدہ امور کو ضروریاتِ دین کہتے ہیں اور ان کا انکار یا تاویلِ باطل کفر ہے۔

حضرت مجاہد و قتادہؒ نے آیت یایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافہ (بقرہ) کی تفسیر میں فرمایا:۔ یہ آیت مسلمانوں کو شریعتِ محمدیہ کے ہر ہر جزو کے التزام طاعت کی دعوت دیتی ہے خواہ فرائض ہوں یا مستحبات، واجب علی الاعیان ہوں یا واجب علی الکفایہ، اگر فرضِ عین ہوں تو اعتقادِ فرضیت کے ساتھ ان کی ادائیگی بھی فرض ہوگی، اور اگر مستحبات ہوں تو ان کے استحباب کا اعتقاد لازم ہوگا اور عمل صرف مستحب کے درجہ میں ہوگا، غرض جن چیزوں کا بھی دین محمدی میں داخل ہونا سب کو معلوم ہو چکا ہے، وہ سب ایمانیات میں داخل ہیں، کیونکہ ایمان رسول خدا کی کامل و مکمل فرمانبرداری کا نام ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ضروریاتِ دین کی تشریح کے بعد فرمایا:۔ مثلاً (۱) نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کے فرض ہونے کا اعتقاد بھی فرض ہے اور نماز سیکھنا بھی فرض ہے اور نماز سے ناواقفیت یا اس کا انکار کفر ہے (۲) مسواک کرنا سنت ہے مگر اس کے سنت ہونے کا اعتقاد فرض ہے اور اس کے مسنون ہونے کا انکار کفر ہے اس کا علم حاصل کرنا سنت ہے، ناواقفیت محرومی کا باعث ہے اور اس پر عمل نہ کرنا عتابِ نبوی اور ترک سنت کے درجہ کے عذاب کا موجب ہے۔

اس کے مسنون ہونے کا انکار اس لئے کفر ہوا کہ اس کا معمولاتِ نبویہ میں سے ہونا سب عام و خاص کو معلوم ہے اور جو چیز بھی اس درجہ کی ہے وہ ضروریاتِ دین میں داخل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے بھی اپنی فتاویٰ میں پوری تفصیل کے ساتھ ایمان و کفر کی بحث ذکر فرمائی ہے آپ نے فرمایا:۔ جو شخص بھی ضروریاتِ دین کا انکار کرتا ہے وہ اہل قبلہ (اور مسلمان) رہتا ہی نہیں، اس لئے کہ ضروریات دین وہ کہلاتے ہیں جو کتاب اللہ اور احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہو چکے ہیں، ان تینوں کے ذریعہ جتنے بھی عقائد و اعمال فرض و نفل وغیرہ ثابت ہیں، ان سب کو ماننا ضروری ہے، پھر عقائد کا جاننا اور ماننا تو سب ہی کا ضروری و فرض ہے، اعمال میں سے فرض کا جاننا فرض اور عمل فرض ہے، مسنون کا جاننا سنت اور عمل بھی سنت، مستحب کا جاننا مستحب اور عمل بھی صرف مستحب کے درجہ میں رہے گا، لیکن ضروریاتِ دین میں سے انکار کسی ایک چیز کا بھی کفر ہوگا۔

تفصیل ضروریاتِ دین! مندرجہ ذیل حقیقتوں پر ایمان و یقین رکھنا ایک مومن کے لئے ضروری ہے:۔ (۱) وجودِ باری تعالیٰ مع تمام

صفاتِ کمال اس طرح کہ وہ اپنی ذات وصفاتِ عالیہ کے لحاظ سے یکتا و بے مثال اور ازلی و ابدی ہے اور صفاتِ عیوب ونقصان صفاتِ مخلوق سے اس کی ذات سبحانہ تعالیٰ منزہ ومبرا ہے۔

(۲) حدوثِ عالم، کہ حق تعالیٰ کے سواء پہلے سے کچھ نہ تھا، اس کے سواء تمامی موجوداتِ عالم (علوی وسفلی) اس کی قدرت وارادہ کے تحت موجود ومخلوق ہوئی ہیں (۳) قضاء وقدر پر ایمان کہ جو کچھ دنیا میں اب تک ہوا، یا اب ہو رہا ہے اور آئندہ ہوگا، وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق ہے اور اسی کے ارادہ وقدرتِ کاملہ سے ظہور ووجود حاصل کرتا ہے، اور بندوں کو جن اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے ان کے لئے بندوں کو بھی بقدرِ ضرورت اختیار وارادہ عطا کر دیا گیا ہے، یعنی بندہ نہ مجبورِ محض ہے نہ مختارِ مطلق، اور جس درجہ میں بھی اس کو اختیار وارادہ دے دیا گیا ہے، بقدر اس کے ہی اعمال کی جزاء وسزا مقرر کر دی گئی ہے، جو سراسر عدل ہے، اسی لئے اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کہ بندہ کو کچھ بھی اختیار نہیں، یا وہ مکمل طور سے مختارِ مطلق ہے، دونوں باتیں ایمان کے خلاف اور کفر میں داخل ہیں (۴) فرشتے جن اور انسان اس کی اہم ترین مخلوقات سے ہیں (۵) بنی آدم کو اپنی ساری مخلوقات پر شرف بخشا اور ان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا، اور زمین وآسمان کی ساری چیزوں کو اس کے لئے مسخر کیا (۶) بنی آدم میں سے انبیاء علیہم السلام کو منتخب کیا اور ان کو شرفِ نبوت ورسالت سے سرفراز فرما کر جن وانس کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا (۷) ہدایت ورہنمائی کے لئے وحی کا سلسلہ قائم کیا اور کتابیں بھی نازل فرمائیں، مثلاً تورات، زبور، انجیل وقرآن مجید (۸) انبیاء علیہم السلام کی تعداد خدا کو معلوم ہے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر سرورِ دوعالم افضل الرسل محمد ﷺ پر آ کر ختم ہو گیا آپ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی دنیا میں نہیں آئے گا (۹) آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتر کر دینِ محمدی کی تائید وتقویت فرمائیں گے، وہ آسمان پر زندہ اٹھائے گئے تھے اور اِس وقت بھی وہاں پر زندہ موجود ہیں اور دنیا میں آ کر اپنے مفوضہ کاموں کی تکمیل کے بعد وفات پا کر حضور اکرم ﷺ کے روضہ مطہرہ مقدسہ میں دفن ہوں گے (قرآن مجید اور صحیح متواتر احادیث سے یہ سب امور ثابت ہیں) (۱۰) انبیاء علیہم السلام کے بعد مرتبہ ان کے صحابہ کا ہے، ان کے بعد تابعین، تبع تابعین علماءِ واولیائے امت کے درجات ہیں (۱۱) انبیاء علیہم السلام کے جن معجزات کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہو چکا ہے، ان کو درست بلا تاویل ماننا ضروری ہے (۱۲) شریعتِ محمدیہ کے تمام احکام جو قرآن مجید وحدیث واجماع وقیاس سے ثابت ہیں، ان سب کو ماننا اور درجہ بدرجہ ان پر عمل کرنا ضروری ہے یعنی فرائض، واجبات، سُنن ومستحباتِ دین سب ہی کو دین کا جزو یقین کرنا تو ضروری ہے باقی عمل کے لحاظ سے فرض پر عمل کرنا فرض اور مستحب ہوگا وغیرہ، اسی طرح نواہی ومنکراتِ دین کا حکم ہے (۱۳) مرنے کے بعد ہر شخص آخرت کی پہلی منزل میں مقیم ہوگا، جس کو "برزخ" کہتے ہیں (۱۴) روزِ قیامت کا یقین کہ ایک دن خدا کے حکم سے ساری دنیا زمین وآسمان کی چیزیں فنا ہو جائیں گی (۱۵) روزِ جزاء یعنی حساب وکتاب کا دن کہ ہر مکلف کے سارے اعمال کا جائزہ لے کر جزاء وسزا کا حکم کیا جائے گا (۱۶) جنت وجہنم کا وجود برحق ہے، جنت میں ابدی نعمتوں کے مستحق ہمیشہ رہیں گے اور جہنم میں ابدی عذاب کے مستحق ہمیشہ رہیں گے، اور کسی کے لئے موت نہ ہوگی (۱۷) حق تعالیٰ کے مقرب وبرگزیدہ بندوں کی شفاعت گنہگار بندوں کے لئے، باذن واجازتِ خداوندی ہوگی (۱۸) جنت میں حق تعالیٰ شانہ کی دائمی خوشنودی اور دولتِ دیدار بھی حاصل ہوگی، جو سب نعمتوں سے برتر اور افضل ہوگی۔

کفر کی باتیں! اوپر کی درج شدہ تمام ضروریاتِ دین اور جو دوسری کتبِ عقائد وکلام میں مفصل درج ہیں، سب ہی پر ایمان ویقین رکھنا مومن کے لئے ضروری ہے اور کسی ایک چیز کا انکار بھی کفر کی سرحد میں داخل کرنے کے لئے کافی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی توحید یا کسی صفت یا حدوثِ عالم کا انکار، اور وجودِ جن وملائکہ، برزخ، جنت وجہنم، معجزات وغیرہ یا احکامِ اسلام میں سے کسی کا انکار یا تاویل بھی کفر ہے، اسی طرح کسی نبی کی نبوت کا انکار یا کسی آیتِ قرآنی کا انکار وتحریف، یا خاتم النبیین کے بعد کسی نبی کی نبوت کا اقرار، یا عالم کو قدیم سمجھنا، یا حق تعالیٰ جل ذکرہ، انبیاء وملائکہ کے بارے میں توہین وتحقیر کے الفاظ استعمال کرنا اور کسی شخص میں کفر کی باتیں ہوتے ہوئے اس کو کافر نہ سمجھنا یا اس کو کافر

کہنے میں تامل وتردد کرنا بھی کفر ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کفر وایمان کی باتوں میں فرق نہیں کرتا، واللہ تعالیٰ اعلم۔ مزید تفصیلات ودلائل کے لئے اکفار الملحدین، اور کتبِ عقائد وکلام کا مطالعہ کیا جائے۔ واللہ الموفق!

باب قبلة اهل المدينة واهل الشام والمشرق' ليس في المشرق ولا في المغرب قبلة لقول النبي صلى الله عليه وسلم لا تستقبلوا القبلة بغائط او بول ولكن شرقوا او غربوا

(باب دربارۂ قبلہ اہل مدینہ واہل شام ومشرق، مشرق یا مغرب میں قبلہ نہیں ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے قضائے حاجت یا پیشاب کے وقت قبلہ کی طرف منہ نہ کرو، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کرو۔)

(۳۸۳) حدثنا علي بن عبدالله قال نا سفيان قال نالزهري عن عطاء ابن يزيد الليثي عن ابي ايوب الانصاري ان النبي صلى الله عليه وسلم قال اذا اتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستد بروها ولكن شرقوا اوغربوا قال ابوايوب فقد منا الشام فوجدنا مر احيض بنيت قبل الكعبة فنحرف ونستغفر الله عزوجل و عن الزهري عن عطاء قال سمعت ابا ايوب عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله

ترجمہ! حضرت عطاء لیثی نے حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت کی کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ جب تم قضائے حاجت کرو تو نہ قبلہ کی طرف رُخ کرو نہ اس سے پیٹھ پھیرو، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف توجہ کرو، حضرت ابوایوبؓ کا بیان ہے کہ ہم شام گئے تو وہاں ہم نے بیت الخلاء قبلہ کے رُخ پر بنے ہوئے دیکھے لہٰذا ہم ترچھے ہوکر بیٹھتے تھے، اور حق تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔

تشریح! امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اہل مدینہ اور کعبہ کے لحاظ سے اسی کی سمت میں واقع ہونے والے ملک شام اور مدینہ طیبہ سے مشرق والے بلاد کا قبلہ ان کی مشرقی ومغربی سمت میں نہیں ہے، اور اسی لئے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ قضائے حاجت کے وقت مشرق ومغرب کی سمت میں تمہارے لئے رُخ کرنے کی اجازت ہے کہ یہ کعبہ معظمہ کی تعظیم میں مخل نہیں ہے، امام بخاریؒ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کے کسی حصہ کے لوگوں کے لئے بھی مشرق ومغرب کی سمت میں قبلہ نہیں ہے، کیونکہ امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر علامہ زماں سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تاہم علامہ ابنِ بطال نے امام کی یہی مراد قرار دے کر اس کو صحیح کرنے کی یہ توجیہ کی کہ کعبہ کے مشرق ومغرب میں بھی جن کے بلاد اس خط کے نیچے واقع ہیں جو مشرق سے مغرب تک کعبہ کے اوپر سے گزرتا ہے صرف ان کو چھوڑ کر باقی ان سب کے لئے جو اس خط کے دائیں بائیں آباد ہیں، انحراف کی وجہ سے جواز کی گنجائش ہے، جس طرح حضرت ابوایوبؓ نے کیا کہ شام جا کر عیسائیوں کے زمانہ کے سمتِ قبلہ پر بنے ہوئے بیت الخلاؤں کا استعمال انحراف کے ساتھ کیا، اور چونکہ اس معمولی انحراف کے وہ عادی نہ تھے، اس کو طبعاً وعادۃً مکروہ سمجھ کر استغفار کو بھی اختیار کیا، محقق عینیؒ نے علامہ موصوف کی اس توجیہ کو ذکر کرکے اس پر نہ صرف یہ کہ کوئی نقد نہیں کیا بلکہ اس کو اور زیادہ سنبھال کر پیش کر دیا ہے۔ جس سے دونوں توجیہ اپنی اپنی جگہ درست ہو جاتی ہیں، یعنی امام بخاریؒ کی مراد صرف اہلِ مدینہ اہلِ شام اور مدینہ سے مشرق کی سمت والے بلادِ عرب ہوں، تب تو بات صاف ہی ہے لیکن اگر ابنِ بطال والی توجیہ مراد ہو تب بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ مشرق ومغرب سے مراد مشرق ومغرب کی تمام سمتیں ہوسکتی ہیں، ٹھیک درمیانی خطِ مشرق ومغرب کو چھوڑ کر جنوب وشمال کی طرف تھوڑا سا انحراف بھی بول وغائط کے وقت کافی ہے اور یہی تشریق وتغریب ہے، جس میں کعبہ معظمہ کی تعظیم کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، اور چونکہ ٹھیک درمیانی خط والے بہ نسبت دوسروں کے بہت کم لوگ ہوں گے ان کی طرف گویا اس عام حکم میں تعرض نہیں کیا گیا، محقق عینی نے اس توجیہ میں خاص طور سے انحراف مذکور کے ساتھ عند الغائط کی بھی قید ظاہر کردی تا کہ معلوم ہو کہ جس طرح یہاں امت سے تنگی رفع کرنے کے لئے بول وغائط کے وقت تھوڑے انحراف بہ

سمتِ شمال وجنوب کو شریعت نے کافی قرار دیا ہے، اسی طرح دوسری طرف بھی تنگی رفع کرنے کے لئے نماز میں استقبالِ قبلہ کے واسطے ربع دائرہ تک کا توسع جائز کردیا گیا ہے، دونوں جگہ توسع ملحوظ ہے، وللہ درالمحقق العینیؒ اور شاید اسی لئے عینی نے اس بحث کے شروع میں یہ الفاظ ادا کئے ہیں کہ یہاں ہمیں قلم دبا کر ذرا زور دار تحریر لکھنی ہے کیونکہ بعض دوسرے لوگوں نے خواہ مخواہ دور از کار بحثوں کا رُخ اختیار کیا ہے۔

یہاں سے دوسری حدیثِ ترمذی وغیرہ کی مراد بھی واضح ہوگئی، جس میں "مابین المشرق والمغرب قبلۃ" وارد ہے، محقق عینی نے لکھا کہ وہ بھی صرف مدینہ اور اس کی سمت پر واقع بلاد وممالک کے لئے ہے، اور جس طرح ان کے لئے وسعت ہے، ایسی ہی وسعت مشرق ومغرب کی سمت میں رہنے والوں کے لئے بھی جنوب وشمال کے لحاظ سے ہوگی، اور اس سے قبلہ کی سمت میں ربع دائرہ تک کی وسعت کا جواز بھی ملتا ہے، یعنی جس طرح اہلِ مدینہ اور دوسرے کعبہ معظمہ سے شمال میں رہنے والوں کیلئے قبلہ کا رُخ مابین المشرق والمغرب وسیع ہے، اسی طرح اہل مشرق کے لئے مابین الشمال والجنوب وسعت ہوگی۔

اس پوری بحث کو پڑھ لینے کے بعد جب آپ اُس دائرہ والے نقشہ پر غور کریں گے، جو ہم نے یہاں پیش کیا ہے تو امید ہے کہ اس سلسلہ کی تمام احادیث اور شروح کی مراد منقح ہوجائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ، ولہ الحمد پہلے مسجدِ حرام اور بیت اللہ شریف کا نقشہ انوار الباری ۱۲/۱۴/۱۱ میں شائع ہوچکا ہے۔

بَابُ قَوْلِ اللہ تَعَالیٰ وَاتَّخِذُوْ مِن مَّقَامِ اِبْرَاھِیْمَ مُصَلّٰی

(ارشادِ باری تعالیٰ کہ مقام ابراہیم کے پاس نماز کی جگہ بناؤ)

(۳۸۴) حدثنا الحمیدی قال نا سفیان قال نا عمرو بن دینار قال سألنا ابن عمر عن رجل طاف بالبیت للعمرة ولم یطف بین الصفا والمروة یأتی امرأته، فقال قدم النبی صلی اللہ علیه وسلم فطاف بالبیت سبعاً وصلے خلف المقام رکعتین فطاف بین الصفا والمروة وقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة وسألنا جابر بن عبداللہ قال لایقربنها حتی یطوف بین الصفا والمروة

(۳۸۵) حدثنا مسدد قال نا یحییٰ عن سیف یعنی ابن ابی سلیمان قال سمعت مجاهداً اتی ابن عمر فقیل له، هذا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم دخل الکعبة فقال ابن عمر فاقبلت والنبی صلے اللہ علیه وسلم قد خرج واجد بلالا قائماً بین البابین فسألت بلالاً فقلت اصلی النبی صلے اللہ علیه وسلم فی الکعبة ؟ قال نعم! رکعتین بین الساریتین اللتین علیٰ یساره اذا دخلت ثم خرج فصلے فی وجه الکعبة رکعتین.

(۳۸۶) حدثنا اسحٰق بن نصر قال نا عبدالرزاق قال انا ابن جریج عن عطاء قال سمعت ابن عباس قال لما دخل النبی صلے اللہ علیه وسلم البیت دعا فی نواحیه کلها ولم یصل حتی خرج منه فلما خرج رکع رکعتین فی قبل الکعبة و قال هذه القبلة

ترجمہ! حضرت عمرو بن دینار کہتے ہیں:۔ ہم نے حضرت ابن عمرؓ سے سوال کیا کہ جس شخص نے عمرہ کے لئے بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کی سعی نہ کی تو کیا وہ اپنی بیوی سے صحبت کرسکتا ہے؟ آپ نے بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ نے بیت اللہ کا طواف سات مرتبہ کرکے مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت پڑھیں، پھر صفا مروہ کا طواف کیا تھا، تمہارے لئے حضور اکرم ﷺ کے ہی طریقہ کی اتباع کرنی ہے، اس بارے میں ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ طوافِ صفا ومروہ سے پہلے ہرگز بیوی سے قربت نہ کرے۔

ترجمہ! حضرتِ مجاہد روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس کوئی شخص آیا اور بتایا کہ دیکھو رسول اکرم ﷺ کعبہ معظمہ کے اندر تشریف لے گئے ہیں، حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں اُدھر پہنچا تو حضور اکرم ﷺ باہر آ چکے تھے، اور (گویا) میں بلال کو (اب بھی) دیکھ رہا ہوں کہ دونوں باب کے درمیان کھڑے ہیں، میں نے بلال سے پوچھا کہ رسول اکرم ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! دو رکعت اُن دونوں ستونوں کے درمیان جو داخلہ بیت اللہ کے وقت بائیں جانب ہوتے ہیں پھر حضور اکرم ﷺ نے باہر آکر دو رکعت کعبہ کے مواجہہ میں پڑھیں۔

ترجمہ! عطاء کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سُنا کہ جب حضور اکرم ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اس کے تمام گوشوں میں دعائیں کیں اور نماز نہیں پڑھی، پھر جب باہر نکلے تو دو رکعت کعبہ معظمہ کے سامنے پڑھیں اور فرمایا کہ یہی قبلہ ہے۔

تشریح! امام بخاریؒ کا اصل مقصد تو نمازوں میں کعبہ معظمہ کی طرف توجہ واستقبال کا حکم ہی بیان کرنا ہے لیکن اس باب میں یہ بھی بتلایا کہ حرم شریف میں بیت اللہ کے پاس ہی ایک جانب مقام ابراہیم بھی موجود ہے، اور طواف کے بعد کی دو رکعت اس کے پاس پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے عمل سے بھی ثابت ہوا، لیکن اسی کے ساتھ امام بخاریؒ نے دوسری وتیسری حدیث بھی ذکر کیں تا کہ اصل حکم وجوبِ توجہ الی الکعبہ نظر سے اوجھل نہ ہو جائے، اور ہر حکم کو اپنے اپنے مقام و درجہ میں رکھا جائے۔

مطابقت ترجمہ! یہ وصلیٰ خلف المقام سے حاصل ہوگئی، جو پہلی حدیث الباب میں مذکور ہے اور محقق عینیؒ نے بھی اس کی صراحت کی ہے، پھر نہ معلوم لامع الدراری ۱۵۴/۱ میں ایسا کیوں لکھا گیا کہ ترجمۃ الباب پر یہ اشکال ہے کہ امام بخاریؒ نے اس میں آیت قرآنی ذکر کی ہے جس میں مقام ابراہیمؑ پر نماز پڑھنے کا امر ہے، پھر وہ جو روایات اس ترجمہ کے تحت لائے ہیں، ان میں مقام ابراہیم کو مصلے بنانے پر کوئی دلالت نہیں ہے، پھر لکھا کہ حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ نے اسی اشکال کے دو جواب دیئے ہیں، الخ حیرت ہے کہ حضرت شیخ الحدیث دامت ظلہم نے عدم مطابقت اور اشکال وجواب کی بات کہاں سے نکال لی، اشکال کا ذکر حافظ اور عینی دونوں کے یہاں نہیں ہے، اور عینی نے تو صاف مطابقت کی نشان دہی بھی کر دی۔ اور بظاہر حضرت گنگوہیؒ کے نزدیک بھی عدم مطابقت کا کوئی اشکال یہاں نہیں ہے بلکہ وہ امام بخاریؒ کی یہ مراد واضح فرمانا چاہتے ہیں کہ مقام ابراہیم کے پاس نماز کے حکم کے باوجود بھی فرض استقبال کعبہ کے تاکد میں فرق نہیں آیا، کیونکہ حضور علیہ السلام نے صلوٰۃ خلف المقام کے ساتھ بھی استقبالِ کعبہ کو ترک نہیں فرمایا دوسری بات حضرتؒ نے امام بخاریؒ کی یہ بتلائی کہ آیت میں اگرچہ امر ہے مگر وہ سنیت یا استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں ہے کیونکہ وجوب کے لئے ہوتا تو حضور علیہ السلام مواجہہ بیت اللہ میں نماز نہ پڑھتے، جو دوسری اور تیسری حدیث الباب میں مذکور ہے، اس لئے کہ اس صورت میں مقام ابراہیم حضور اکرم ﷺ کے پیچھے تھا، آگے نہیں تھا اور آگے صرف کعبہ تھا، علاوہ ازیں یہ بات بجائے خود بھی صحیح نہیں ہے کہ روایاتِ باب میں مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے پر کوئی دلالت نہیں ہے، جبکہ پہلی ہی حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے مقام ابراہیم میں نماز پڑھنے کا ذکر صراحت سے موجود ہے، یہ تو پوری طرح آیتِ ترجمۃ الباب کے مصداق پر عمل تھا، لیکن اس پر عمل کے باوجود یہ بھی ظاہر کرنا ضروری تھا کہ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھنا موجب شرف وبرکت واز دیادِ اجر ہے، یہ نہیں کہ اس کی وجہ سے بیت اللہ کے استقبال کی اہمیت کچھ کم ہوگئی، بلکہ حسبِ تحقیق حضرت گنگوہیؒ اس کا تاکدِ مزید مفہوم ہوا کہ اس کے پاس بھی نماز کی صحت استقبال کعبہ معظمہ پر ہی موقوف ہے اور اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے وہاں بھی نماز میں استقبال ترک نہیں فرمایا، اور باقی دونوں حدیثیں ذکر کر کے امام بخاریؒ نے اسی مقصد تاکد و وجوبِ استقبال کعبہ کو واضح فرمایا، محقق عینیؒ نے مناسبتِ بابِ سابق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:۔ کہ اس باب کی سابق ابواب متعلقہ قبلہ کے ساتھ مناسبت کی وجہ یہ بھی بن سکتی ہے کہ آیت

کریمہ مذکورہ ترجمۃ الباب میں بھی قبلہ کا بیان ہے کیونکہ حسنؒ سے مصلےٰ بمعنی قبلہ ہے اور قتادہ وسدی نے کہا کہ مقام کے پاس نماز پڑھنے کا حکم ہوا تھا، اگرچہ مقام کا قبلہ ہونا صرف اسی صورت میں متعین تھا کہ مقام کو نمازی اپنے اور قبلہ کے درمیان کر لے، کیونکہ دوسری جہات ثلاثہ میں صرف کعبہ کی طرف رُخ کرنے سے نماز درست ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ فرض تو استقبال بیت اللہ ہی کا ہے مقام کا نہیں اور اسی لئے حضور علیہ السلام نے جب بیت کے پاس خارج بیت نماز بغیر استقبالِ مقام پڑھی تو صراحت سے فرمادیا کہ یہی قبلہ ہے (عمدہ ۲/۳۰۲)

افاداتِ عینیؒ! فرمایا: پہلی حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ عمرہ میں سعی واجب ہے جو سارے علماءِ کا مذہب ہے بجز حضرت ابن عباسؓ کے اسی لئے ان کے نزدیک طواف کے بعد احرام کی پابندی ختم ہو جاتی ہے خواہ سعی نہ کرے، حالانکہ یہ رائے ضعیف اور خلافِ سنت ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت پڑھی جائیں، پھر بھی اس کو بعض نے سنت اور بعض نے واجب کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طواف کے تابع ہے، وہ سنت ہو تو یہ بھی سنت ہے وہ واجب ہو تو یہ بھی واجب ہے (عمدہ ۲/۳۰۳)

دوسری حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ میں داخل ہونا جائز ہے اور مغنی میں حج کرنے والے کے لئے اس میں داخلہ اور دو رکعت پڑھنے کو مستحب لکھا ہے، جس طرح حضور علیہ السلام سے ثابت ہے لیکن بیت اللہ اور حطیم کے حصّہ میں جوتوں کے ساتھ داخل نہ ہو کہ خلافِ ادب ہے، علامہ نووی نے یہ اجماعِ اہل حدیث ثابت کیا کہ بیت اللہ کے اندر دو رکعت پڑھنا مستحب ہے جیسا کہ روایتِ بلال سے ثابت ہے، اور جس روایتِ اُسامہ وغیرہ میں نفی ہے وہ مرجوح ہے، یا اس کو دو واقعات پر محمول کر سکتے ہیں، رہی یہ بات کہ دوسری مشہور روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ مجھے افسوس ہے حضرت بلالؓ کے ساتھ مدت تک رہا لیکن یہ سوال نہ کر سکا کہ حضور علیہ السلام نے بیت اللہ کے اندر کتنی رکعت پڑھی تھیں اور یہاں سوال کرنے کا ذکر ہے تو اس کا بہتر جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس وقت صرف یہ سوال کیا تھا کہ حضور علیہ السلام نے بیت اللہ کے اندر کیا کیا، حضرت بلالؓ نے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ کر دیا، جس سے دو رکعت سمجھی گئیں، پھر زبانی طور سے اس کی وضاحت کرانے کو حضرت ابن عمرؓ بھول گئے ہوں گے، جس کا افسوس کیا کرتے تھے الخ (عمدہ ۲/۳۰۵)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا کہ بعض علماءِ نے جو لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اپنے زمانہ میں حضرت عمرؓ سے اپنے زمانہ کے لحاظ سے افضل تھے، وہ شاید ان ہی جیسی وجوہ سے ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو ہر وقت اتباعِ سنت ہی کی دھن لگی رہتی تھی، اور اگر کوئی بات تحقیق سے رہ گئی تو اس کا افسوس کیا کرتے تھے، یہ ان کی عجیب وغریب شان ہی فضیلتِ خاصہ کا موجب تھی اور فرمایا کہ یہاں جو حضرت ابن عمرؓ نے یقین کے ساتھ دو رکعت کا ذکر فرمادیا، وہ اس لئے نہیں تھا کہ حضرت بلالؓ سے پوچھ لیا تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ کم سے کم نماز دو ہی رکعت ہوتی ہے، پس اسی کے قائل ہو گئے (اور حسبِ روایت وتحقیق عینی دو کا اشارہ بھی اس کی تائید میں موجود تھا۔)

تیسری حدیث الباب کے تحت محقق عینیؒ نے ''ہذہ القبلۃ'' پر لکھا کہ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ یہ قبلہ اور کعبہ معظمہ ہے پھر اس طرح ارشاد فرمانے کی کیا وجہ تھی؟ تو ایک وجہ تو خطابی سے منقول ہے کہ اب قبلہ کا حکم اسی بیت پر ثابت ومستحکم ہو چکا اس کے بعد منسوخ نہ ہوگا، لہٰذا ہمیشہ اسی کی طرف نماز پڑھنی ہوگی، دوسرا احتمال یہ ہے کہ امام کے کھڑے ہونے کی مسنون جگہ بتلائی ہو کہ مواجہہ بیت میں کھڑا ہو، باقی تینوں جوانب وارکان میں نہیں، اگرچہ نماز کی صحت وجواز ان اطراف میں بھی ہے تیسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے صرف ان لوگوں کا حکم بتلایا جو بیت اللہ کا مشاہدہ ومعائنہ کر رہے ہوں کہ ان کے لئے مواجہتِ بیت عیاناً ضروری ہے، اپنی اجتہادی رائے سے کام نہیں لے سکتے۔

علامہ نوویؒ نے ایک اور توجیہ بھی لکھی کہ یہی کعبہ وہ مسجد حرام ہے جس کے استقبال کا حکم ہوا سارا حرم نہیں، نہ سارا مکہ اور نہ ساری مسجد حرام جو کعبہ کے گرد ہے بلکہ مسجد حرام کا صرف یہی حصّہ جو کعبہ معظمہ ہے وہی قبلہ ہے۔

نیز ایک روایت میں جو حضور علیہ السلام نے باب بیت اللہ ہی کو قبلہ بیت فرمایا، وہ بھی استحباب پر محمول ہے، کیونکہ نفسِ جوازِ استقبال تو تمام جہاتِ کعبہ کے لئے حاصل ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے (عمدہ ص ۴۷/۲)

قولہ ہٰذا القبلۃ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: اس سے اشارہ پورے بیت اللہ کی طرف ہے اور اس کی وجہ سے مالکیہ نے بیت اللہ کے اندر فرض نماز پڑھنے کو ناپسند کیا ہے[1] کہ پورے کا استقبال نہیں ہو سکتا، لیکن حنفیہ کے یہاں درست ہے اور اس میں ان کے نزدیک زیادہ توسع ہے۔

باب التوجه نحو القبلة حيث كان وقال ابو هريرة قال النبي صلى الله عليه وسلم استقبل القبلة و كبر

(جہاں بھی ہو (نماز میں) قبلہ کی طرف توجہ کرنا، اور حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا قبلہ کا استقبال کر اور تکبیر کہہ)

(۳۸۷) حدثنا عبدالله بن رجاء قال نا اسرائيل عن ابى اسحق عن البراء قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم صلے نحو بيت المقدس ستة عشر شهراً او سبعة عشر شهراً و كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحب ان يوجه الى الكعبة فانزل الله عزوجل قدنرىٰ تقلب وجهک فى السماء فتوجه لحو القبلة وقال السفهاء من الناس و هم اليهود ما ولهم عن قبلتهم التى كانوا عليها قل لله المشرق والمغرب يهدى من يشاء الىٰ صراط مستقيم فصلے مع النبى صلى الله عليه وسلم رجل ثم خرج بعد ما صلى فمر علىٰ قوم من الانصار فى صلوٰة العصر يصلون نحو بيت المقدس فقال و هو يشهد انه' صلے مع رسول الله صلى الله عليه وسلم و انه' توجه نحو الكعبة فتحرف القوم حتى توجهوا نحو الكعبة.

(۳۸۸) حدثنا مسلم بن ابراهيم قال نا هشام بن عبدالله قال نا يحيى ابن ابى كثير عن محمد بن عبدالرحمٰن عن جابر بن عبدالله قال كان النبى صلى الله عليه وسلم يصلى على راحلته حيث توجهت به فاذا ارادالفريضة نزل فاستقبل القبلة

(۳۸۹) حدثنا عثمان قال ناجرير عن منصور عن ابراهيم عن علقمة عن عبد الله صلى الله عليه وسلم قال ابراهيم لآادرى زاداونقص فلما سلم قيل له' يارسول الله احدث فى الصلوٰة شى قال وماذاک قالوا صليت كذا و كذا فثنىٰ رجليه واستقبل القبلة و سجد سجدتين ثم سلم اقبل علينا بوجهه قال انه

---

[1] فیض الباری ۲/۳۲ میں غلطی سے مالکیہ کا مسلک عدم جواز درج ہو گیا ہے اور کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۵۰ میں تفصیل مذاہب اس طرح ہے:۔

مالکیہ! نماز فرض بیت اللہ کے اندر صحیح ہے مگر مکروہ ہے بہ کراہتِ شدیدہ اور وقت کے اندر اس کا اعادہ مستحب ہے، نفل اگر غیر موکدہ ہوں تو وہ اس کے اندر مستحب ہیں، موکدہ ہوں تو مکروہ، مگر اعادہ کی ضرورت نہیں، کعبہ کی چھت پر نماز فرض صحیح نہیں، نفل غیر موکدہ صحیح ہیں، نفل موکدہ میں دو قول برابر درجہ کے ہیں۔

حنابلہ! فرض نماز بیت اللہ کے اندر اور چھت پر بھی صحیح نہیں بجز اس کے کہ کسی دیوار سے بالکل متصل ہو کر پڑھے کہ اس کے پیچھے کچھ حصہ نہ رہے نماز نفل ومنذور درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ باہر کھڑا ہو کر اندر سجدہ کرے۔

شافعیہ! نماز فرض ونفل سب درست ہیں، مگر باب کعبہ کی طرف کو جبکہ وہ کھلا ہو درست نہ ہوگی اور چھت پر جب درست ہوگی کہ اس کے سامنے کم از کم دو تہائی ذراع کی اونچی کوئی چیز ہو۔

حنفیہ! بیت اللہ کے اندر اور چھت پر ہر نماز درست ہے البتہ اوپر مکروہ ہے، کیونکہ اس میں ترک تعظیم بیت اللہ ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے یہاں سب سے زیادہ توسع ہے جیسا کہ حضرتؒ نے اشارہ فرمایا، اور زیادہ تنگی اس مسئلہ میں حنابلہ کے یہاں ہے، واللہ تعالیٰ اعلم "مؤلف"

لوحدث فی الصلوٰة لنبأتکم به ولکن انمآ انا بشر مثلکم انسیٰ کما تنسون فاذانسیت فذکرونی واذاشک احدکم فی صلوٰته فلیتحر الصراب فلیتم علیه ثم لیسلم ثم یسجد سجدتین

ترجمہ! حضرت براءؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اور آپ چاہتے یہی تھے کہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم آجائے، پس اللہ تعالیٰ نے آیت قد نری تقلب نازل فرمائی اور آپ نے قبلہ کا استقبال کیا اس پر سفید لوگوں نے جو یہود تھے طنز کیا کہ اب پہلے قبلہ سے کیوں پھر گئے، حق تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے! مشرق ومغرب سب خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہے صراط مستقیم کی ہدایت مرحمت فرمادیتا ہے، حضور علیہ السلام کے ساتھ ایک شخص نے نماز پڑھی اور پھر وہ کچھ انصار کے پاس سے گزرا جو عصر کی نماز بیت المقدس کی طرف پڑھ رہے تھے تو اس نے شہادت کے ساتھ بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کعبہ کی طرف نماز پڑھ کر آیا ہے، اس پر وہ سب لوگ کعبہ کے طرف کو گھوم گئے!

ترجمہ! حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی سواری پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے، جدھر کو بھی وہ چلتی تھی لیکن جب فرض نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تھے تو سواری سے اتر کر اور استقبال قبلہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔

ترجمہ! عثمان، جریر، منصور، ابراہیم، علقمہ، عبداللہ (بن مسعود) روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی، ابراہیم کہتے ہیں، یہ مجھے یاد نہیں کہ آپ نے (نماز میں کچھ) زیادہ کر دیا تھا یا کم کر دیا تھا، الغرض جب آپ سلام پھیر چکے تو آپ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ کیا کوئی بات نماز میں نئی ہوگئی، آپ نے فرمایا، وہ کیا؟ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اس قدر نماز پڑھی، پس آپ نے اپنے دونوں پیروں کو سمیٹ لیا، اور قبلہ کی طرف منہ کر کے دو سجدے کئے، اس کے بعد سلام پھیرا، پھر جب ہماری طرف اپنا منہ کیا تو فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی نیا حکم ہو جاتا تو میں تمہیں (پہلے سے) مطلع کرتا لیکن میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، جس طرح تم بھولتے ہو میں بھی بھول جاتا ہوں، لہٰذا جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلاؤ، اور جب تم میں سے کسی شخص کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو اسے چاہیے کہ صحیح حالت کے معلوم کرنے کی کوشش کرے، اور اسی پر نماز تمام کرے، پھر سلام پھیر کر دو سجدے کرلے۔

تشریح! محقق عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے اس باب میں نماز فرض کے لئے جہت قبلہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت وفرضیت بتلائی ہے، خواہ وہ نمازی سفر میں ہو یا حضر میں، اور پہلے باب سے اس کی مناسبت ظاہر ہے، تحویل قبلہ کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

استنباط احکام! علامہ عینیؒ نے لکھا:۔ پہلی حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ (۱) احکام کا نسخ درست ہے، اور یہی جمہور کا مذہب ہے، کچھ لوگوں نے جن کی کوئی اہمیت نہیں، اس کو نادرست سمجھا ہے (۲) قرآن مجید سے سنت کا نسخ ہو سکتا ہے یہ بھی جمہور کا مسلک ہے، امام شافعیؒ کے اس بارے میں دو قول ہیں (۳) خبر واحد مقبول ہے (۴) نماز کا قبلہ کی طرف ہونا واجب ہے اور اجماع سے اس کا کعبہ معظمہ ہونا متعین ہے (۵) ایک نماز دو سمت میں جائز ہو سکتی ہے (اسی لئے اب بھی اگر تحری کے بعد غلط سمت میں نماز شروع کر دے اور درمیان میں صحیح قبلہ کا علم ہو جائے تو اس کی طرف گھوم جائے گا)

دوسری حدیث الباب سے معلوم ہوا (۱) فرض نماز میں ترک استقبال قبلہ درست نہیں، اسی لئے حضور علیہ السلام فرض کے لئے سواری سے اتر کر ضرور استقبال کرتے تھے، البتہ شدت خوف کا وقت اس سے مستثنیٰ ہے اور مجبوری ومعذوری کی حالت میں سواری پر بھی فرض ہو سکتی ہے (۲) نفل نماز سواری پر بحالت سفر تو سب کے نزدیک درست ہے، البتہ حضر میں امام ابو یوسف وغیرہ کے نزدیک درست ہے، امام ابوحنیفہ وامام محمد اور اصطخری شافعی کے نزدیک درست نہیں۔

تیسری حدیث سے معلوم ہوا (۱) افعال میں انبیاء علیہم السلام کو بھی سہو ہو سکتا ہے، علامہ ابن دقیق العیدؒ نے کہا کہ یہی قول اکثر علماء

واہل نظر کا ہے لیکن افعال بلاغیہ میں سہو کسی کے نزدیک بھی درست نہیں ہے جیسا کہ قاضی عیاض وغیرہ نے تصریح کی ہے (۲) افعال انبیاء علیہم السلام میں نسیان بھی واقع ہوسکتا ہے مگر اس پر ان کو برقرار نہیں رکھا جاتا اور حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو تذکیر و تعلیم فوراً کر دی جاتی ہے۔

محقق عینیؒ نے یہاں سہو و نسیان میں فرق بھی بتلایا ہے کہ نسیان کسی چیز سے غفلت قلب کا نام ہے اور سہو کسی چیز کا قلب سے غافل ہونا ہے، آگے عینی نے کلام فی الصلوٰۃ عامداً و ناسیاً اور عدد رکعات میں شک کی صورتوں کے احکام تفصیل و دلائل کے ساتھ بیان کئے ہیں (۳) حنفیہ کے نزدیک سہو کے دو سجدے سلام کے بعد کے ہیں جیسا کہ حدیث الباب سے بھی ثابت ہوا، اور یہی حضرت علی، سعد بن وقاص، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عمار بن یاسر، عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک سے مروی ہے اور ابن ابی لیلیٰ، ابراہیم نخعی، حسن بصری اور سفیان ثوری کا بھی مذہب ہے، لیکن امام شافعیؒ وغیرہ سلام سے قبل کہتے ہیں، تاہم ہدایہ میں ہے کہ یہ خلاف صرف اولویت واستحباب کا ہے، اور ایسا ہی ماوردی نے الحاوی میں اور ابن عبدالبر وغیرہ نے کہا ہے۔ (عمدہ ۳/۱۴/۲)

حافظ کا سکوت! حافظ ابن حجرؒ نے ثم یسلم ثم سجدتین پر خاموشی اختیار کی، اور بغیر جواب دہی کے آگے چلے گئے ایسے موقع پر کہ اپنی مذہب میں کمزوری ہو سکوت اور جہاں کچھ قوت ہو تو دوسروں پر نکیر میں حد اعتدال سے بڑھ جانا، اہل ادب و تحقیق کے لئے موزوں نہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے فرمایا:۔ ہدایہ سے معلوم ہوا کہ خلاف افضلیت کا ہے، البتہ تجرید کی عبارت سے دوسری بات نکلتی ہے، تاہم میں کہتا ہوں کہ ہدایہ ہی کی رائے لینی چاہیے، اگرچہ مرتبہ قدوری کا بڑا ہے، کیونکہ تجرید کی روایت لینے سے اکثر احادیث صحاح کی مخالفت لازم آئے گی، اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں احادیث قولیہ تو سب ہی حنفیہ کی حجت و تائید میں ہیں، جیسا کہ ابوداؤد و بخاری میں بھی ہیں، اور فعلی احادیث دونوں قسم کی ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اختلاف صرف افضلیت کا ہے، اس سے زیادہ کا نہیں۔

افادات انور! فرمایا:۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نفل نماز میں تحریمہ کے وقت استقبال کرنا چاہیے پھر چاہے سواری اپنے راستے پر دوسری جہت میں ہی چلتی رہے لیکن حنفیہ کے یہاں اس میں توسع ہے، انہوں نے تحریمہ کے وقت بھی استقبال کو شرط نہیں قرار دیا ہے۔

نماز کا قلب تحریمہ ہے یا موضع تامین؟ مجھے اس میں تردد تھا، لیکن اب رجحان یہ ہے کہ آمین کہنے کا موقع ہی قلب صلوٰۃ ہے، کیونکہ تحریمہ پالینے میں تو نماز کے لئے جلدی کرنے اور خصوصی اہتمام ہی کا ثواب ہے، لیکن آمین کا موقع حاصل کرنے میں اگلے پچھلے سب گناہوں کی مغفرت کا وعدہ ہے، لہٰذا آمین پالینے کا موقع ہی نماز کا قلب بننے کے واسطے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

باقی رہا یہ کہ رکوع پالینے سے پوری رکعت مل جاتی ہے، لہٰذا وہ قلب ہونا چاہیے تو وہ درست نہیں کیونکہ یہ تو بہت ہی کم ہمت لوگوں کے لئے ایک قسم کی رعایت دی گئی ہے کہ رکوع تک بھی مل گئے تو رکعت ہوگئی وہ کوئی انعام واکرام کا مستحق بنانے والی بات نہیں ہے، اسی لئے حضرت ابوہریرہؓ سے[1] منقول ہے کہ وہ بڑی کوشش واہتمام آمین پالینے کا کیا کرتے تھے، اتنا اہتمام وہ فاتحہ کا بھی نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی

---

[1] بخاری شریف ۱۰۷ (باب جہر الامام بالتامین) میں آئے گا کہ حضرت ابوہریرہؓ جس زمانہ میں بحرین میں موذن تھے، تو اذان کے بعد اپنے امام مروان کو بلند آواز سے کہا کرتے تھے کہ دیکھنا! میری آمین فوت نہ کرا دینا، اور یہ بھی نقل ہوا ہے کہ امام سے شرط کر لی تھی کہ جب تک میں صف میں نہ پہنچ جاؤں، مجھ سے پہلے ولا الضالین نہ کہہ دینا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام ان کا انتظار کرتے ہوں گے یا حضرت ابوہریرہؓ سستی یا دیر کرتے ہوں، یہ بلکہ حضرت نافع ہی کا قول بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ آمین کو نہ چھوڑتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ امام کے آمین کہنے سے پہلے نماز میں ضرور شریک ہو جاؤ، اور میں نے ان سے اس بارے میں حدیث بھی سنی ہے (یعنی آمین امام کے ساتھ آمین کہنے کی فضیلت مغفرت ذنوب والی جو آگے بخاری میں بھی ہے)

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا:۔ دیکھو حضرت ابوہریرہؓ ایسے جلیل القدر صحابی آمین کے لئے کتنا اہتمام کرتے اور ترغیب دیتے تھے پھر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا اہتمام یا ترغیب کیوں نہیں ہوئی؟!

فرمایا موطا امام مالکؒ میں لا تفتنی کی جگہ لا تسبقنی بآمین مروی ہے اس سے پوری طرح واضح ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ فاتحہ خلف الامام کے قائل نہ تھے، واللہ تعالیٰ اعلم!

کچھ لوگوں نے ان کو قراءتِ فاتحہ خلف الامام کا قائل سمجھا ہے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ آمین ہی قبولیتِ صلوٰۃ وغیرہ پر مہر کرنے والی ہے، اور فاتحہ تو امام کی بھی مقتدی کے لئے کافی ہے، بخلاف آمین کے کہ وہ مقتدی کا حصہ ہے اور امام آمین کے بارے میں مقتدی کا وکیل ونائب نہیں ہوتا۔

بحث ونظر! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ہم پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جن حضرات نے صرف ایک شخص کے کہنے پر نماز کا رُخ بدل دیا انہوں نے کس طرح ایک سابقہ قطعی امر کو ایک شخص کی خبر سے (جو ظنی ہے) منسوخ قرار دیدیا، کیونکہ ہم تو اصل خبر کو قطعی کہتے ہیں، یعنی ہر حدیثِ رسول کو قطعی سمجھتے ہیں، آگے ظنیت جو آئی ہے وہ تو ہم تک پہنچنے کے ذریعہ سے آئی ہے، لہٰذا یہاں بھی ظنیت طریق میں ہے ناسخ میں نہیں، اور ان حضرات کے لئے طریق کی ظنیت کیوں مانع نہ ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس تحقیق کا ذریعہ تھا، یعنی مدینہ طیبہ جا کر حقیقتِ حال معلوم کر سکتے تھے، لہٰذا اصل یہ قرار پائی کہ جب کوئی امر قطعی الاصل ہو تو ظنی پر بھی عمل میں کوئی جرح نہیں، اور اسی لئے تبلیغِ دین کے لئے عدد تواتر کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے اور نہ کسی کافر کو یہ کہنے کا حق ہے کہ تمہارا دین اگرچہ اپنی جگہ قطعی ہے، لیکن مجھ تک جو کچھ پہنچا ہے وہ سب اخبارِ آحاد کے ذریعہ پہنچا ہے، لہٰذا وہ مجھ پر حجتِ ملزمہ نہیں ہوسکتا، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ اس اصل کو اصولیوں نے نہیں لکھا، مجھ کو تنبہ ہوا تو اس کو میں نے نیل الفرقدین[1] اور اکفار الملحدین میں بھی لکھ دیا ہے۔

خبر واحد کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خاص تحقیق

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا حضرتؒ خبر واحد کو بھی اصالۃً اور فی حد ذاتہ قطعی فرمایا کرتے تھے، اور احادیثِ صحیحین کے بارے میں آپ حافظ ابن حجر شافعی، شمس الائمہ سرخسی حنفی، حافظ ابن تیمیہ حنبلی، اور شیخ عمرو بن الصلاحؒ کی رائے کو مرجح خیال کرتے تھے، اور رائے جمہور عدم افادۂ قطع کو مرجوح کہتے تھے اور یہ شعر بھی اس کے حسبِ حال پڑھا کرتے تھے۔

تعیرنا انا قلیل عدیدنا فقلت لهاان الکرا درقلیل

نیز فرمایا کرتے تھے کہ صحیحین کی اخبارِ آحاد اگرچہ اہل اصول کے قاعدہ سے ظنی قرار پاتی ہیں مگر قرائن اور قوتِ طرق کی موجودگی میں وہ بھی قطعی بن جاتی ہیں، لیکن ان کا علم وبصیرت صرف اہل علم ونظر ہی کو حاصل ہوسکتی ہے، ہر شخص کو نہیں، پھر یہ بھی فرماتے تھے کہ افادۂ قطع کی بات اطباقِ امت یا تلقی بالقبول کی وجہ سے نہیں بلکہ درحقیقت اسی وجہ سے ہے اور ہونی چاہیے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے، اور اسی لئے جن احادیث کی مثلاً امام بخاری نے تخریج تو کی مگر ان کے کسی جزو پر باب وترجمہ قائم نہیں کیا تو اس جز کو بھی ہم قطعی نہ کہیں گے، کیونکہ ان کی عدم تبویب کے باعث اس کے ثبوت میں شبہ پیدا ہو گیا، اور قطعیت جب ہی رہتی ہے کہ کوئی مانع وشبہ موجود نہ ہو۔

---

[1] حضرتؒ نے فرمایا:۔ تواتر طبقہ کے بعد اسناد کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لئے شریعت نے اس کے بعد کسی مکلف کو ملزم بنانے کیلئے اس کا اثبات بطورِ تواتر ضروری قرار نہیں دیا، بلکہ علماءِ امت کا فیصلہ یہ ہے کہ جس امر کی بھی سند صحیح ہو اور رسم امام میں وہ موجود ہو تو وہ قرآن ہے اور اسی طرح غیر قرآن کے بارے میں بھی ہے کہ جو امور اپنی جگہ قطعی ہیں جیسے دعوتِ اسلام تو ان کی تبلیغ صرف اخبارِ آحاد کے ذریعہ ہوجانے پر بھی حجت پوری ہوجاتی ہے، خواہ دعوت متواترہ نہ ہو، لہٰذا یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ جب تک کسی کافر کو اسلام کی طرف بطریقِ تواتر نہ بلایا جائے اس کو جاحد ومنکرِ اسلام قرار نہ دینا چاہیے، کیونکہ قطعی امورِ حقہ کی طرف دعوت دینے میں اخبارِ آحاد بھی کافی ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ فی نفسہ اپنی جگہ پر قطعی ہیں، اور جب بھی کوئی طلبِ صادق کے ساتھ ان کی طرف توجہ کرے گا، ان کا اثبات ممکن ہے لہٰذا ان میں سے کسی امر کا بھی انکار ونفی کرنا جحود ہی قرار پائے گا، جس طرح کوئی آنکھ دیکھی چیز کی خبر دے تو اس کی نفی وانکار مکابرہ یا ہٹ دھرمی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ادنیٰ توجہ سے اس امر کی تحقیق کی جاسکتی ہے غرض دوسرے پر کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے اتنا کافی ہوتا ہے کہ وہ بات فی نفسہ قطعی ہو یا اس کے پس پشت قطعی دلائل وآثار موجود ہوں، اور بطریق تواتر ہی ہر بات کو ثابت کرنا ضروری نہیں ہوا کرتا۔

اسی طرح امت کے وہ اجماعی فیصلے بھی ہیں جو بطریق آحاد ہم تک پہنچے ہیں کہ وہ بھی مفید قطعیت ویقین ہیں اور اس باب سے ہیں الخ (نیل الفرقدین ۱۳۶ و ۱۳۷) یہ بات حضرتؒ نے اکفار الملحدین ۵۲ میں بھی مختصراً لکھی ہے۔ ''مؤلف''!

حضرتؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے سادات حنفیہ جو خبر واحد سے کتاب پر زیادتی کا انکار کرتے ہیں وہ نسخ کے درجہ کی زیادتی مراد لیتے ہیں، ورنہ ظن کے مرتبہ کی زیادتی جتنی ہو سکتی ہے اس سے انکار نہیں ہے، لہٰذا اس سے مرتبہ وجوب کی زیادتی مثلاً ہو سکتی ہے، حضرتؒ کی یہ تحقیق اچھی تفصیل سے حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب مہاجر مدنی قدس سرہ نے مقدمہ فیض الباری ۳۵ و مابعد میں نقل کی ہے، جو اہل علم کے لئے قابل قدر تحفہ ہے۔

واقعاتِ خمسہ بابتہ سہو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرتؒ نے فرمایا:۔شیخ تقی الدین بن دقیق العید نے ایسے واقعات چار ذکر کئے ہیں، دو کا ذکر بخاری میں ہے۔(۱) ظہر میں پانچ رکعت پڑھیں۔(۲) چار والی نماز دو پڑھیں۔(۳) ابوداؤد(۱۴۶/۱) میں ہے کہ قعدۂ اولیٰ ترک ہوگیا۔(۴) نماز میں ایک آیت کی بھول ہوئی، نماز کے بعد حضرت ابن مسعودؓ سے سوال کیا، کیا تم نماز میں نہ تھے؟ عرض کیا، حاضر تھا، فرمایا:۔"پھر یاد کیوں نہیں دلایا؟" میں کہتا ہوں ایک پانچواں واقعہ بھی ہے کہ مغرب کی نماز میں ایک مرتبہ قعدۂ اولیٰ پر سلام پھیر دیا تھا، امام بخاریؒ نے سہو کی حدیث کئی مرتبہ ذکر کی ہیں اور مختلف تراجم قائم کر کے ان سے متعدد مسائل کا استنباط کیا ہے، لیکن ترجمہ وعنوان جوازِ کلام الناس کا کہیں قائم نہیں کیا، معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں انہوں نے حنفیہ کی موافقت کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

تحری الصواب کا امر نبوی! حضور علیہ السلام نے جو فرمایا کہ جب تمہیں تعدادِ رکعات وغیرہا میں شک لاحق ہو تو صواب وصحیح بات کو سوچ بچار کر کے متعین کرو، اور پھر اسی کے مطابق اپنی نماز پوری کرلو، اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں شک کی الگ الگ صورتوں میں تین حکم ہیں اگر پہلی مرتبہ شک ہوا تو پھر سے نماز پڑھے، اور نہ دل میں اچھی طرح سوچ کر غلبہ ظن پر عمل کرے، یہ بھی نہ ہو تو متیقن چیز یعنی کم کو صحیح سمجھے، پھر ہمارے مشائخ میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ وہ اس صورت میں سجدۂ سہو نہ کرے (کمافی الجوہرۃ النیرہ ودرالمختار نقلا عن السراج الوہاج) اور یہی قول اقرب ہے، لیکن اکثر کہتے ہیں کہ سجدہ کرنا چاہیے (کمافی الفتح) باقی تیسری صورت میں سجدۂ سہو قطعاً ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ تمام صورتوں میں اقل ہی کو اختیار کرے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ احادیث سے تائید ہمارے ہی مذہب کی نکلتی ہے، کیونکہ پھر سے نماز پڑھنے کی بھی روایت ہیں مثلاً مصنف ابن ابی شیبہ میں، اور تحری واخذ بالاقل کی بھی ہیں، جیسے مسلم شریف میں اور یہ بخاری میں، لہٰذا ہم نے سب احادیث پر عمل کیا اور شافعیہ نے صرف اقل والی پر کیا اور باقی سب کی تاویل کی، اور تحری صواب کو بھی اقل پر ہی محمول کر دیا حالانکہ لغت اس کے بالکل خلاف ہے اور اس کے اصل معنی کو لغو کر دینا درست نہیں، خصوصاً جبکہ شریعت میں غلبہ ظن کا اعتبار بہت سے ابواب میں موجود بھی ہے، لہٰذا اُس نوع کو یہاں غیر معتبر ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں، دوسرے ان کے مذہب پر ایک نوع کو اس کے حکم سے بالکلیہ خالی کر دینا لازم آئے گا، جو درست نہیں ہے۔

باب ماجاء في القبلة ومن لم يرا لاعادة على من سها فصلى الى غير القبلة وقد سلم النبي صلى الله عليه وسلم في ركعتي الظهر واقبل على الناس بوجهه ثم اتم ما بقي

(قبلہ کے متعلق جو منقول ہے اور جنھوں نے بھول کر غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے والے کے لئے اعادہ ضروری خیال نہیں کیا، اور بے شک نبی علیہ السلام نے ظہر کی دو رکعتوں میں سلام پھیر کر لوگوں کی طرف اپنا منہ کر لیا، اس کے بعد جو باقی رہ گیا تھا، اسے پورا کیا تھا۔)

(۳۹۰) حدثنا عمرو بن عون قال نا هشيم عن حميد عن انس بن مالك قال قال عمر رضي الله عنه وافقت ربي في ثلث قلت يا رسول الله لو اتخذنا من مقام ابراهيم مصلى اية الحجاب قلت يا رسول

الله لو امرت نسآئک ان یحتجبن فانه یکلمهن البر والفاجر فنزلت اية الحجاب واجتمع نسآء النبی صلی الله علیه وسلم فی الغیرة علیه فقلت لهن عسیٰ ربه ان طلقکن ان یبدله ازواجاً خیراً منکم مسلمات فنزلت هذه الاٰیة

(۳۹۱) حدثنا عبدالله بن یوسف قال انا مالک عن عبدالله بن دینار عن عبدالله بن عمر قال بینا الناس بقبآء فی صلوٰة الصبح اذجآء هم اٰت فقال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قدانزل علیه اللیلة قراٰن وقدا امران یستقبل الکعبة فاستقبلوها وکانت وجوههم الی الشام فاستداروا الی الکعبة

(۳۹۲) حدثنا مسدد قال نا یحیی عن شعبة عن الحکم عن ابراهیم عن علقمة عن عبدالله قال صلی النبی صلی الله علیه وسلم الظهر خمساً فقالوا ازید فی الصلوٰة قال وماذاک قالوا صلیت خمساً فثنیٰ رجله وسجد سجدتین

ترجمہ! حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا، میں نے اپنے پروردگار سے تین باتوں میں موافقت کی (ایک مرتبہ میں نے کہا، کہ یارسول اللہ ﷺ کاش! ہم مقام ابراہیم کو مصلّی بناتے، پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِیْمَ مُصَلّٰی اور حجاب کی آیت (بھی میری خواہش کے مطابق نازل ہوئی) کیونکہ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ کاش! آپ اپنی بی بیوں کو پردہ کرنے کا حکم دے دیں اس لئے کہ ان سے ہر نیک وبد گفتگو کرتا ہے پس حجاب کی آیت نازل ہوئی، اور (ایک مرتبہ نبی ﷺ کی بیبیاں آپ پر نسوانی جذبہ وغیرت کے تحت جمع ہوئیں، تو میں نے ان سے کہا کہ اگر حضور علیہ السلام طلاق دے دیں گے، تو عنقریب آپ کا پروردگار تم سے اچھی بی بیاں آپ کو بدلے میں دے گا، جو حکم بردار ہوں گی، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

ترجمہ! حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) لوگ (مقام) قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ یکایک ان کے پاس ایک آنے والا آیا، اس نے کہا کہ رسول خدا ﷺ پر آج کی رات ایک آیت نازل کی گئی ہے، آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرلیں، یہ سن کر سب لوگوں نے کعبہ کی طرف منہ کرلئے (اس سے قبل) ان کے منہ شام کی طرف تھے۔

ترجمہ! حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) ظہر میں پانچ رکعتیں پڑھیں، صحابہ نے عرض کیا کہ کیا نماز میں (کچھ) زیادتی کردی گئی؟ آپ نے فرمایا، وہ کیا، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے پانچ رکعتیں پڑھیں، عبداللہ کہتے ہیں، پس آپ نے پیر موڑ کر دو سجدے کیے۔

تشریح! امام بخاریؒ چونکہ جہل ونسیان کو عذر ٹھیرانے میں زیادہ وسیع النظر ہیں، اس لئے یہاں مستقل باب قائم کر کے بتلایا کہ سہو ونسیان کی وجہ سے اگر ایک شخص غیر سمتِ قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھ لے گا تو اس کی نماز درست ہوجائیگی جس طرح ان کے نزدیک نجس کپڑے میں بھی بھول سے نماز پڑھ لے تو نماز ہوجاتی ہے، حنفیہ کے یہاں اس قدر توسع نہیں ہے البتہ قبلہ سے انحراف میں حنفیہ کے نزدیک بھی توسع ہے، چنانچہ حالتِ نماز میں حدث طاری ہو تو قبلہ سے پیٹھ پھیر کر وضو کے لئے جاسکتا ہے، اور آکر باقی نماز پوری کرلے گا، بشرطیکہ مسجد سے باہر قریب جگہ وضو کی ہوتے ہوئے دور نہ جائے کیونکہ وضو تو بہر حال مسجد سے باہر ہی کرے گا اور اگر یوں ہی خیال ہوا کہ حدث لاحق ہوگیا ہے، پھر کچھ دور جا کر یقین یا ظنِ غالب عدم وجود حدث کا ہوا تو لوٹ کر باقی نماز پڑھے گا، بشرطیکہ مسجد سے باہر نہ نکلا ہو، اگر مسجد سے نکل کر صحیح خیال آیا تو پوری نماز پھر سے پڑھنی پڑھے گی، اسی طرح اگر خیال کیا کہ نماز پوری ہوگئی اور لوٹنے کے بعد یاد آیا کہ کچھ نماز باقی رہ گئی ہے تب بھی واپس ہوکر باقی نماز پڑھ لے گا، بشرطیکہ مسجد سے باہر نہ ہوا ہو۔ (فتح القدیر ۲۷۱/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ فیض الباری ۲/۲۴۲ سطر ۲۳ میں عبارت بشرط ان لا یخرج من المسجد بے محل درج ہوگئی ہے۔ کما لا یخفی، نیز واضح ہو کہ ساری مسجد کا حکم محلِ واحد کا ہے۔

محقق عینیؒ نے لکھا: عنوان باب میں جو حدیث ذکر ہوئی اس کے ترجمہ سے مطابقت بہ لحاظ اس کے ہے کہ نماز بھول کر غیر قبلہ کی طرف بھی درست ہوسکتی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے بھولے سے دو رکعت پر سلام پھیر کر لوگوں کی طرف توجہ فرمائی تھی اور اس صورت میں بھی وہ حکماً نماز کے اندر ہی تھے۔

اس کے بعد محقق عینیؒ نے لکھا کہ یہ تعلیق قصہ ذی الیدین والی حدیثِ ابی ہریرہؓ کا ٹکڑا ہے اور ابن بطال اور ابن التین نے جو اس کو حدیث ابن مسعودؓ کا جزو سمجھا ہے وہ ان کا وہم ہے کیونکہ حدیث ابن مسعودؓ کے کسی طریقِ روایت میں یہ نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام نے دو رکعت پر سلام پھیرا تھا، پھر لکھا:۔

پہلی حدیث الباب کے ترجمہ سے مطابقت اس طرح ہے کہ واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى میں مقام ابراہیم سے مراد کعبہ معظمہ ہے جو ایک قول ہے اور باب بھی قبلہ سے متعلق ہے، یا مراد کل حرم ہے، جو آفاق والوں کے حق میں قبلہ ہے، اور اگر مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہو جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے تو مطابقتِ ترجمہ بہ لحاظ متعلقاتِ قبلہ ہوگی، خود قبلہ کے لحاظ سے نہ ہوگی۔

دوسری حدیث الباب کی مطابقت ترجمہ سے ظاہر ہے کیونکہ اس میں کعبہ معظمہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تھا، اور ان لوگوں نے پہلے نماز قبلہ منسوخہ کی طرف پڑھی تھی جو غیر قبلہ تھا اور ناواقفیت کے سبب سے وہ بھولنے والے کے حکم میں تھے، اسی لئے نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا گیا۔

تیسری حدیث الباب کی مطابقت بھی واضح ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے سہو کی صورت میں نماز کا اعادہ نہیں فرمایا اور آپ نے سلام کے بعد لوگوں کی طرف توجہ فرمائی، پھر جب پہلی ہی نماز پر بنا کی تو معلوم ہوا کہ کعبہ سے پشت کرنے کی حالت میں بھی آپ حکماً نماز ہی میں تھے، اگر نماز سے خارج ہوجاتے تو سابقہ نماز پر بنا نہ کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ جو خطاءً قبلہ سے انحراف کرے گا اس کی نماز درست ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں (عمدہ ۲/۳۱۸)

نطقِ انور! حضرتؒ نے فرمایا:۔ قوله الظهر خمسا، ایسی صورت میں حنفیہ کے نزدیک چوتھی رکعت پر بیٹھنا ضروری ہے، ورنہ فرض نماز نفل بن جائے گی، لیکن شافعیہ کے مسلک پر اس کی ضرورت نہیں، اور نماز بہرِ صورت فرض کے طور پر صحیح ہوجائیگی، ہمارا جواب یہ ہے کہ مسئلہ اجتہادی ہے کسی کے پاس دلیلِ شرعی نہیں ہے، البتہ ہمارے پاس تفقہ کے لحاظ سے قوی دلیل موجود ہے، وہ یہ کہ دینِ محمدی میں نماز تین قسم کی ہیں، دو رکعت والی، تین رکعت والی، اور چار رکعت والی، اور ظاہر ہے کہ نماز کے دو یا چار ہونے کا تحقق جو متواتراتِ دین سے ہے صرف قعدہ سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ بھی فرض اور ضروری ہوگا کیونکہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوگا، اسی لئے حنفیہ نے کہا کہ ایک رکعت سے کم کا رفض وترک جائز ہے، بخلاف اس کے پوری رکعت ہوجانے پر نماز کا اہتمام فرض ہوگا، کیونکہ وہ متواتراتِ دین سے ہے یعنی شریعت نے اس کو معتد بہ امر قرار دیا ہے جس کو ترک نہیں کرسکتے کہ اس سے دین کے ایک متواتر و مسلم امر کی توڑ پھوڑ یا اس کو بے حیثیت کرنا لازم آتا ہے۔

علامہ نووی نے اقرار کیا ہے کہ یہ واقعہ نسیان والا اور بات کرنے کا بدر سے کچھ قبل کا ہے، لہٰذا یہ تو مسلم ہوا کہ نسخِ کلام کی صورت سب کے نزدیک ثابت ہے، اختلاف صرف تاریخ میں ہے کہ کب ہوا؟ لہٰذا حدیث ذی الیدین میں اس کا عذر پیش کرنا محض نفعِ مذہب کے لئے نہیں ہے بلکہ ایسے ثابت شدہ امر کے باعث ہے جو سب کو تسلیم ہے۔

قوله فثنى رجله وسجد سجدتين۔ پر فرمایا:۔ اگر کہا جائے کہ جب کلام اس وقت نماز کے اندر جائز ہی تھا تو سجدۂ سہو کی کیا ضرورت تھی؟ میں کہتا ہوں وہ نماز کے اندر غیر اجزاء صلوٰۃ کی دخل اندازی کے باعث تھا، اس باب کو اگرچہ علماء نے ذکر نہیں کیا، مگر غالباً اس

وقت مسئلہ یہی رہا ہوگا کہ کلام وغیرہ سے عدم فساد صلوٰۃ کے ساتھ اس کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جاتی ہوگی۔

حدیث الباب اور مناقب وموافقات سیدنا عمرؓ

یہاں پہلی حدیث الباب میں حضرت عمرؓ کی موافقات کا ذکر ہوا ہے، کرمانی شرح بخاری میں ہے کہ **وافقت ربی بمعنی وافقنی ربی** ہے کہ میرے رب نے میری موافقت کی، رعایت ادب کے لئے موافقت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، اور بعض حضرات نے ۲۱ چیزوں میں موافقت ذکر کی ہے جیسا کہ اس کو علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں نقل کیا ہے (حاشیہ بخاری ۱/۵۸)

حافظ نے لکھا:۔ ترمذی میں حدیث ابن عمرؓ ہے کہ کبھی بھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا جس میں دوسرے لوگوں نے ایک رائے دی ہو اور حضرت عمرؓ نے دوسری، مگر یہ کہ قرآن مجید حضرت عمرؓ ہی کی رائے کے موافق اترا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بہ کثرت موافقت ان ہی کی ہوئی ہے لیکن نقل کے مطابق تعیین کے ساتھ پندرہ چیزوں میں موافقت ہمارے علم میں آئی ہے (فتح ۱/۳۴۱)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تعداد کا اہتمام غالباً وحی قرآن مجید کی موافقات کے پیش نظر رہا ہے، ورنہ حسب ارشاد حضرت ابن عمرؓ مطلق وحی نبوت کی موافقت بہ تعدادِ کثیر پائی گئی ہے اور ان سب کے بھی شمار کی طرف توجہ کی جاتی تو عدد بہت بڑھ جاتا اس کے بعد مناسب ہے کہ حضرت عمرؓ کے کچھ مناقب اور پھر آپ کی موافقات کا بیان کیا جائے، واللہ الموفق!

مناقب امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی تعالیٰ اللہ عنہ

محدَّث ومکلَّم ہونا! حضرت ابو ہریرہؓ سے بخاری ومسند احمد میں، اور حضرت عائشہؓ سے مسلم، ترمذی، نسائی ومسند احمد میں حدیث ہے کہ تم سے پہلی امتوں میں محدث ہوتے تھے، پس اس امت میں اگر کوئی ہے تو وہ عمرؓ ہیں، اور بخاری میں دوسری جگہ حضرت ابو ہریرہؓ سے اس طرح سے حضور علیہ السلام کا ارشاد نقل ہوا کہ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جن سے کلام کیا جاتا تھا بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں اگر میری امت میں ایسا کوئی ہے تو وہ عمرؓ ہیں، اور حدَّثون کے معنی ملہمون کے ہیں کہ ان کے دلوں میں ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے القاء ہوتا تھا، یا ظاہری معنی رکھے جائیں تو وہ بھی صحیح ہیں کہ ان سے فرشتے باتیں کرتے تھے جو اگرچہ بدرجہ وحی انبیاء نہ تھیں، تاہم وہ بھی بہت بڑی فضیلت تھی علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا:۔ محدَّث ان کے یہاں وہ شخص ہوتا تھا کہ جس کا ظن وگمان صادق ہوتا تھا، اور درحقیقت ان کے دل میں ملأ اعلیٰ کی چیزیں ڈالی جاتی تھیں، گویا وہ اس سے کہی جاتی تھیں، پھر حضور علیہ السلام کا ارشاد مذکور بطور تردد کے نہ تھا کیونکہ یہ امتِ محمدیہ تو افضل الامم ہے جب پہلی امتوں میں ایسے ہوتے تھے تو اِس امت میں تو بدرجہ اولیٰ ان سے تعداد ومرتبہ میں زیادہ ہوں گے، لہٰذا آپ کا ارشاد بطور تاکید ویقین کے ہے، جیسے کہتے ہیں کہ میرا اگر کوئی دوست ہے تو وہ فلاں شخص ہے، جس سے مقصد اس کی کمالِ صداقت کا اظہار ہوا کرتا ہے، نہ کہ تردد وشک یا نفی صداقت (مرقاۃ شرح مشکوۃ ۵/۵۳۱)

حدیث میں محدَّث سے مراد اہل الہام ہیں، جن کے دل میں کوئی چیز القاء کی جائے، پھر وہ اس چیز کو اپنی حدس وفراست کے نور سے معلوم کر کے خبر دیتے ہیں، بعض نے کہا کہ مراد مصیب ہیں کہ جو گمان کریں درست نکلتا ہے گویا وہ ان کو بتلا دیا گیا ہے بعض نے کہا کہ ان سے فرشتے باتیں کرتے ہیں، بخاری میں مکلمون کی روایت بھی ہے یعنی صواب ان کی زبانوں پر جاری ہوتا ہے اور اسی لئے حضرت عمرؓ نے **وافقتُ ربی** فرمایا (مجمع البحار ۱/۲۴۴)

ارشادات حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ

حضرتؒ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں خلفائے راشدین کے کمالات ومناقب اور استحقاقِ خلافتِ خاصہ نبویہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے، جو

دوسری کتابوں میں موجود نہیں ہے وہ سب ہی علماءِ کے مطالعہ کی خاص چیز ہے، مگر ہم یہاں کچھ اجزاء بہ سلسلہ محدّثیت حضرت عمر رضی تعالیٰ اللہ عنہ نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:۔خلفائے راشدین جوہرِ (نفس) انبیاء علیہم السلام کے مشابہ تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو رسولِ اکرم علیہ کے دل کو سب بندوں کے دلوں سے بہتر پایا، لہٰذا ان کو برگزیدہ کیا، اور رسالت بخشی، پھر دوبارہ بندوں کے دلوں کو دیکھا تو آپ کے اصحاب کے دلوں کو اور بندوں سے بہتر پایا، لہٰذا ان کو اپنے نبی کا وزیر بنایا، اور علامہ ابوعمرؒ نے حضرت عباسؓ کا قول نقل کیا کہ آیت قل الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفیٰ میں برگزیدہ بندوں سے مراد صحابہ کرام ہیں، اور بخاری و مسلم میں حضرت عمرؓ کو اس امت کا محدّث فرمایا گیا ہے، نیز ترمذی میں روایتِ حضرت عائشہؓ ہے کہ ایک روز رسول اکرم علیہ گھر میں تشریف فرما تھے، باہر کچھ شور سنا گیا تو آپ نے دیکھا کہ ایک حبشی عورت کچھ کھیل کھیل رہی ہے اور بچے اس کے گرد جمع ہیں، حضور نے فرمایا:۔ عائشہ! آؤ اور دیکھو، چنانچہ میں گئی حضور کے پیچھے کھڑی ہو کر شانہ مبارک سے اس کا کھیل دیکھنے لگی، آپ نے کئی بار پوچھا کہ تم ابھی سیر نہیں ہوئیں؟ میں ہر دفعہ کہہ دیتی تھی کہ ابھی نہیں تا کہ دیکھوں حضور کے دل میں میری کتنی قدر ہے، پھر یکایک وہاں حضرت عمرؓ آ نکلے تو سب لوگ اس حبشی عورت کے پاس سے بھاگ گئے، اور اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں شیاطینِ جن وانس کو دیکھتا ہوں کہ عمر سے بھاگتے ہیں، اس کے بعد میں بھی گھر میں لوٹ آئی (ازالہ ۱۲۶ر۱)

دارمی میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا، جب آپ نبی بنائے گئے تو کیسے معلوم کیا کہ میں نبی ہوں، آپ نے جواب دیا کہ میرے پاس دو فرشتے آئے، ایک زمین پر اتر گیا، اور دوسرا آسمان و زمین کے درمیان معلّق رہا، ایک نے دوسرے سے کہا کہ جن کی نبوت کا فرمان ملاءِ اعلیٰ میں جاری ہوا ہے کیا یہ وہی ہیں؟ دوسرے نے کہا ہاں! اس نے کہا اچھا! ان کو ایک آدمی کے ساتھ وزن کرو چنانچہ مجھے ایک آدمی کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں اس سے وزنی نکلا، پھر اس سے کہا کہ دس آدمیوں کے ساتھ وزن کرو تو میں ان سے بھی وزنی نکلا، پھر سو آدمیوں کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں ان سے بھی بڑھ گیا، پھر ایک ہزار کے ساتھ وزن کیا گیا تو ان سے بھی وزنی نکلا، اور گویا میں اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ پلّہ کے ہلکے ہونے کے باعث وہ سب لڑھکے جاتے ہیں، اور اس فرشتے نے کہا کہ اگر ان کو تمام امت کے ساتھ بھی وزن کرو گے تب بھی یہ ہی وزنی رہیں گے۔

دوسری روایت احمد بن مردویہ نے حضرت ابن عمرؓ سے اس طرح نقل کی کہ ایک روز رسول اکرم علیہ آفتاب نکلنے کے بعد باہر تشریف لائے اور فرمایا:۔ فجر سے قبل میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے بہت سی مقالید و موازین (کنجیاں اور ترازو) دی گئیں ہیں، پھر دیکھا کہ ایک پلّہ میں مجھے رکھا گیا اور دوسرے میں میری امت[1] کو، تو میں سب سے وزنی نکلا، اس کے بعد ابوبکرؓ لائے گئے، اور ان کو ساری امت کے ساتھ وزن کیا گیا، تو وہ سب سے وزنی نکلے، پھر عمرؓ لائے گئے، اور سب امت سے وزن میں بڑھ گئے، پھر عثمان لائے گئے اور وہ بھی سب امت سے وزنی نکلے، اس کے بعد وہ ترازو آسمان پر اٹھالی گئی، ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اوّل تو حضور علیہ السلام کے لئے فضلِ کلی حاصل ہے جو لازمہ نبوت ہے، پھر یہی خواب بعینہٖ خلفاء کے بارے میں دیکھا گیا تو اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کسی شخص کی خلافت کے بارے میں ارادۂ الٰہیہ قائم ہوتے ہی اس کو بھی فضلِ کلی تمام رعیت پر حاصل ہو جاتا ہے، گو ہنوز اس کو خلافت نہ ملی ہو، اور خلفاء کا اپنی رعیت سے عنداللہ افضل ہونا اور علمِ خداوندی میں برتر ہونا خلافت خاصہ کو لازم ہے اور اس کے ہمراہ وہ افضیلت جو بوجہ سوابق اسلامیہ یا بوجہ اوصافِ خلقیہ مثل حسنِ سیاست وغیرہ کے ہو وہ الگ چیز ہے جو عادتِ الٰہی کے موافق خلیفہ بننے کی حقیقت کو لازم ہے واللہ تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال (ازالۃ الخفاء ۱۲۹/۱)

---

[1] غالباً مراد ساری امتِ دعوت واجابت ہے، جس میں اولین و آخرین اور کفار و مومنین سب شامل ہیں اور گویا جس طرح نبی اپنے وقت میں اکیلا ساری امت سے زیادہ وزندار ہوتا ہے، اسی طرح اس کے خلفاءِ راشدین اور سلاطین وائمہ عدل بھی روئے زمین کے سارے لوگوں پر بھاری، غالب، منصور من اللہ اور خلفاء اللہ فی الارض کے مرتبہ عالیہ سے سرفراز ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!" مؤلف"

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت سیدنا عمرؓ کے تذکرہ میں ایک عنوان ''رسالہ تصوف وسلوک'' بھی قائم کیا ہے جس میں واضح کیا کہ حقیقتِ تصوف کی (جس کو شرع نے ''احسان'' سے تعبیر کیا ہے) تین اصل ہیں (۱) اعمالِ خیر کے ذریعہ یقین پیدا کرنا، جو بغیر اخلاص و اکثارِ اعمال، اور بلا خشوع وخضوع و ترکِ حدیثِ نفس کے حاصل نہیں ہوسکتا (۲) اس یقین سے طبیعت نفس وقلب کے درمیان سے مقامات کا پیدا ہونا، جن میں سے دس اعلیٰ واصولِ مقامات توبہ، زہد، صبر، شکر، رجاء، خوف، توکل، رضا، تفقر محبت ہیں، جب یقین بطورِ جبلّت قلب پر مستولی ہو جاتا ہے اور چاروں طرف سے قلب کو گھیر لیتا ہے تو لامحالہ رجاء وخوف وغیرہ کا تعلق صرف ذاتِ الٰہی سے قائم ہو جاتا ہے اور اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہو جاتا ہے، ان مقاماتِ مذکورہ کے علاوہ وہ بھی ہیں جن کی بشارت رسول اکرم ﷺ نے بعض صحابہ کو دی ہے مثلاً صدیقیت، محدثیت، شہیدیت، حواریت وغیرہ، اس سے معلوم ہوا کہ جو یقین وجبلت قلب ونفس کے درمیان سے پیدا ہو صرف اسی کو مقام سلوک کا درجہ دیں گے، لہٰذا اگر کسی شخص کے دل پر یقین مستولی وغالب نہ ہو تو اس کی تمام صفات صرف ذاتی وطبعی ہوں گی، مقاماتِ سلوک سے نہیں (۳) قلب ونفس پر یقین مستولی ہونے پر ہر بات کو یقین کے ساتھ پیش کرنا اور اس کے ہر اقدام میں استقلالِ عظیم کا رونما ہونا، ان تینوں اصول کا حامل ہوتا ہے، اس سے کراماتِ خارقہ اور تربیتِ مریداں وغیرہ احوال ظاہر ہوتے ہیں، اور چونکہ حضرت عمرؓ اس امتِ مرحومہ میں علوم تصوف کے لحاظ سے اعلم صوفیہ تھے اس لئے آپ نے تمام مباحث وعلوم تصوّف کی قولاً وفعلاً وضاحت فرمائی ہے اور بعد وفاتِ نبوی امتِ مرحومہ کی پوری تربیت فرمائی ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضارہ

دوسرے یہ کہ نفسِ ناطقہ کو دو قوتیں عطا کی گئی ہیں، قوتِ عاقلہ اور قوتِ عاملہ، جب پہلی قوت کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ مقام وحی سے سرفرازی کا موجب ہوتی ہے، اور جب دوسری قوت کامل ہوتی ہے تو مقام عصمت حاصل ہوتا ہے، اگر کسی امتی کے نفس ناطقہ میں یہ دونوں قوتیں جمع ہو جاتی ہیں تو ان سے ثمراتِ کثیرہ پیدا ہوتے، اور اس وقت یہ صاحبِ نفس مرشدِ خلائق خلیفہ برحق رسول اکرم ﷺ اور مظہر رحمت الٰہی ہوتا ہے پس قائم مقام وحی محدثیت وموافقتِ وحی ہے اور کشفِ صادق وفراستِ المعیہ نائبِ عصمت ہے، ایسے شخص کے سایہ سے بھی شیطان بھاگتا ہے نیز ان دونوں کے اجتماع سے شہیدیت ونیابت پیغمبر علیہ السلام بھی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ کو محدثیت کا مقام حاصل تھا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے اس کی خبر اور بشارت دی ہے اور یہ خبر مشہور ہے، نیز حضرت عقبہ بن عامر نے یہ الفاظ روایت کئے ہیں، **لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب** (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے) یہ روایت سنن ترمذی[1] ومسند احمد میں ہے۔

---

[1] اس سے بتلایا گیا کہ حضرت عمرؓ کے اندر انبیاء علیہم السلام کے اوصاف اور مرسلین کے اخلاق وملکات تھے، اس حدیث کو علاوہ ترمذی کے امام احمد، حاکم، ابن حبان وطبرانی نے بھی اوسط میں روایت کیا ہے، کذا فی الفتح (تحفۃ الاحوذی ۳۱۵/۴)

باب مناقب عمر بخاری میں حدیث **لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن فی امتی منھم احد فعمر۔** کے بعد نقل ہے کہ حضرت ابن عباسؓ آیت **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث الا اذا تمنی** پڑھا کرتے تھے یعنی ولا محدث کی زیادتی کے ساتھ، حافظؒ نے لکھا کہ حضرت عمرؓ کے ذکر کی تخصیص کا سبب یہ ہے کہ آپ سے بہ کثرت موافقاتِ قرآن مجید کا صدور حضور اکرم ﷺ کے زمانہ مبارکہ میں تو ہوا ہی ہے آپ کے بعد بھی بہت سی مرتبہ اصابتِ رائے کا ثبوت ہوا ہے (فتح ۳۷/۷) بعد والی اصابت میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا قائم کرانا ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے اس کی ابتداء اور تکمیل کرائی، ورنہ اس وقت بہت بڑا اختلاف اور فتنہ رونما ہو جاتا، اور یہ بھی حضور علیہ السلام کی پیش گوئی کے مطابق ہوا ہے کیونکہ آپ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں فرمایا تھا جب تک تم موجود ہو کوئی فتنہ لوگوں کی پریشانی کا موجب نہ ہوگا اور یہ بھی حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت سے فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا، چنانچہ اسی طرح واقع بھی ہوا، اور داخلی وخارجی ہر قسم کے فتنوں کی یورش میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا چلا آرہا ہے پھر قیامت تک ان میں زیادتی ہی ہوتی رہے گی، **اللھم اعذنا من شر الفتن کلھا وثبت اقدامنا وانصرنا فانک خیر الناصرین۔** آمین ''مؤلف''

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ جو بات کہتے تھے، قرآن مجید میں بھی اسی کی تصدیق اُترتی تھی اور فرمایا کہ ہم سب کا خیال یہ تھا سکینت لسانِ عمرؓ پر جاری ہوتی ہے، یعنی آپ کے دل سے زبان پر وہ باتیں آتی ہیں، جن سے دوسروں کے قلوب ونفوس سکون وطمانیت حاصل کرتے ہیں (مرقاۃ ۵/۵۴۷) اور فرمایا:۔ ہم سمجھتے تھے کہ حضرت عمرؓ کو شیطان گناہ وخطا کی ترغیب دینے سے ڈرتا ہے، یعنی اس کی جرات نہیں کرسکتا، حضرت ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ اگر صحابہ کرام میں کسی امر پر اختلاف ہوتا تو قرآن مجید میں وہی اترتا تھا جو حضرت عمر فاروقؓ کہتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو حضرت عمرؓ کے دل وزبان پر جاری کردیا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت میں ابوبکر وعمرؓ کا مرتبہ کوکبِ دری کی طرح روشن وممتاز ہوگا (ابوداؤد وغیرہ) بھیڑیئے اور بیل کی باہم گفتگو والا قصہ بیان کرکے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس قصہ کی صحت تسلیم کرتا ہوں اور ابوبکرؓ وعمرؓ بھی تسلیم کرتے ہیں (حالانکہ اس وقت یہ دونوں وہاں موجود بھی نہ تھے) اسی طرح حضور علیہ السلام کا جنت میں حضرت عمرؓ کے محل کو دیکھنا، اور خواب میں اپنا بچا ہوا دودھ ان کو عنایت کرنا اور خواب میں حضرت عمرؓ کو ٹخنوں تک نیچا خوب بڑا کرتہ پہنے ہوئے دیکھنا، وغیرہ بھی ان کی خصوصی فضیلت ومنقبت کو ظاہر کرتی ہیں، یہ بھی فرمایا کہ جب تک یہ تم میں رہیں گے تم فتنوں سے محفوظ رہو گے اور خود حضرت عمرؓ کو خطاب فرمایا کہ تمہارے اور فتنہ کے درمیان بند دروازہ حائل ہے، یہ اور دوسرے غیر محصور فضائل یہ تواتر معنوی ثابت ہیں اور متواترتِ دین میں سے ہیں (ازالۃ الخفاء ۲/۲۹۱ تا ۲/۲۹۵ اردو ترجمہ شائع کردہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

نورِ یقین کا استیلاء

جب نورِ یقین قوت عاملہ پر اس درجہ مستولی وغالب ہوجاتا ہے کہ انسان کی قوتِ بہیمیہ وسبعیہ مسخر ومغلوب ہوجاتی ہے تو اُس نورِ یقین کے ثمرات ونتائج ظاہر ہوتے ہیں مثلاً امرالٰہی کے اتباع میں سخت ہونا خلق اللہ پر شفیق ومہربان ہونا، کتاب اللہ کے احکام سامنے آتے ہی خلاف ارادہ سے رک جانا، لذاتِ نفسانیہ سے بے رغبتی کرنا، وغیرہ اور حضرت عمرؓ کو اس قسم کا نورِ یقین حاصل تھا، جس پر احادیث کثیرہ دلالت کرتی ہے، فرمایا:۔ **رحم اللّٰہ عمر یقول الحق و ان کان مراتر کہ الحق و مالہ من صدیق**" (اللہ تعالیٰ عمر پر رحم کرے، حق بات ضرور کہہ گزرتے ہیں اگرچہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو، حق گوئی نے ان کو سب سے الگ تھلگ سا کردیا ہے جیسے ان کا کوئی دوست نہیں" یعنی دنیاداروں میں سے، ورنہ اہلِ ایمان واخلاص تو آپ سے محبت کرتے ہی تھے) اسی نورِ یقین کے باعث حضرت عمرؓ نے ایلاء کے واقعہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں رباح کی معرفت یہ بھی کہہ دیا تھا کہ حضور کہیں یہ خیال نہ فرمائیں کہ حفصہ کی سفارش لے کر آیا ہے، واللہ، اگر حضور مجھے اس کی گردن مارنے کو کہیں گے تو میں اس سے بھی تامل نہ کروں گا۔ جیسا کہ مسلم شریف وغیرہ میں ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۳۰۷)

دوسری صورت یہ ہے کہ نورِ یقین کا غلبہ واستیلاء قوتِ عاقلہ پر ہوجاتا ہے، متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کو یہ مقام بھی حاصل تھا، چنانچہ آپ کو اس امتِ محمدیہ کا محدَّث فرمایا گیا کہ قرآن یا حدیث آپ کی رائے کے مطابق اترتی تھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ قرآن یا حدیث آپ کی رائے سے حرف بحرف مطابق ہوئی ہو، اس لئے اگر قرآن وحدیث میں کسی قدر اضافہ اور زائد فائدہ بھی نازل ہوا ہو تو یہ امر موافقت ومطابقت کے مخالف نہیں ہے مثلاً حضرت عمرؓ کی خواہش تھی کہ ازواجِ مطہرات کو حجاب میں رکھا جائے حتی کہ حاجاتِ ضروریہ کے لئے بھی نکلنے کی ممانعت ہوجائے، اس پر آیتِ حجاب نازل لیکن حاجاتِ ضروریہ کے لئے نکلنے کو مستثنیٰ رکھا گیا حضور علیہ السلام نے بدلالتِ لفظ یا بدلالتِ معنی جان لیا کہ اصل مقصودِ وحی حجاب ہے، جس کی حضرت عمرؓ نے خواہش کی تھی اور بول وبراز سے روکنے میں حرج ہے، یہ فائدہ حضور علیہ السلام نے زیادہ بیان فرمادیا، جسے حضرت عمر رضی تعالیٰ اللہ عنہ نہیں سمجھ سکے تھے، لہٰذا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مسئلہ حجاب میں آپ کی موافقت نہیں ہوئی ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۳۲۹)

موافقتِ وحی! حدیث الباب ۳۹۰ میں اس کا ذکر ہے اور اس کی عظمتِ شان واہمیت کے پیشِ نظر ہم اس کو مستقل عنوان کے تحت ذکر کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ!

جنت میں قصرِ عمرؓ! حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ میں نے دیکھا کہ جنت میں داخل ہوا، وہاں رمیصاء زوجہ ابی طلحہ کو دیکھا، پھر کسی کے چلنے

کی آہٹ سُنی، پوچھا کون ہے؟ تو بتلایا کہ بلال ہیں، پھر ایک محل دیکھا جس کے ایک جانب صحن میں ایک عورت کو وضو کرتے دیکھا، میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے، انہوں نے بتلایا کہ حضرت عمرؓ کا ہے، میں نے ارادہ کیا کہ اندر جا کر محل کی سیر کروں، لیکن عمر کی غیرت کا خیال کر کے اُلٹے پاؤں لوٹ آیا، حضرت عمرؓ یہ[1] سن کر رو پڑے اور عرض کیا:۔ یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، کیا میں آپ کے لئے غیرت کر سکتا ہو؟ فتح الباری ۳۱/۷ میں دوسری روایت کے حوالہ سے ہے کہ آپ نے آگے یہ بھی کہا کہ مجھے جو ہدایت حق تعالیٰ نے عنایت فرمائی وہ تو آپ ہی کے طفیل میں ہے اور جو کچھ عزت و سربلندی عطا ہوئی وہ بھی آپ کے سبب ہے۔

مرقاۃ ۵۴۴/۵ میں یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے جب صبح کو یہ خواب بیان کیا تو حضرت بلال کو بلا کر دریافت کیا تم مجھ سے پہلے کس عمل کی وجہ سے جنت میں پہنچ گئے کہ میں گزشتہ رات وہاں داخل ہوا تو آگے آگے چلنے کی تمہارے قدموں کی آہٹ سُنی[2]، پھر میں ایک چوکور سونے سے تعمیر شدہ محل پر پہنچا تو وہاں کے لوگوں (فرشتوں) سے پوچھا یہ محل کس کا ہے؟ انہوں نے بتلایا کی ایک عربی کا ہے، میں نے کہا:۔ میں بھی تو عربی ہوں، کہا ایک قریشی کا ہے، میں نے کہا میں بھی تو قریشی ہوں، ٹھیک بتلاؤ کہ کس کا ہے؟ انہوں نے کہا امتِ محمدیہ میں سے ایک شخص کا ہے، آپ نے فرمایا میں خود محمد ہوں، صاف طور سے بتلاؤ کہ یہ محل کس کا ہے؟ تب انہوں نے کہا کہ عمر بن الخطاب کا ہے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری عادت ہے کہ اذان کے بعد دو رکعت ضرور پڑھتا ہوں، اور جب وضو ساقط ہو جاتا ہے تب بھی وضو کر کے دو رکعت پڑھ لینا اپنے ذمہ لازم جیسا کر لیا ہے، آپ نے فرمایا یہ مرتبہ ان ہی دونوں کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

مماثلت ایمانیہ نبویہ

یعنی حضرت ابوبکر و عمرؓ کو نبی اکرم ﷺ کے ایمان و یقین کے ساتھ خصوصی مماثلت و مشابہت کا شرف عظیم حاصل تھا، چنانچہ بخاری و مسلم و دیگر کتب صحاح میں یہ واقعہ نقل ہوا ہے کہ ایک روز آپ نے قصصِ اولین[2] میں سے یہ قصہ بھی بیان فرمایا کہ ایک چرواہا اپنی بکریوں میں تھا، بھیڑیا آیا اور ایک بکری کو لے گیا، چرواہے نے تلاش کر کے اس کو پالیا، بھیڑیا اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا، اب تو تم مجھ سے اسے چھڑا کر لیجا سکتے ہو، مگر جب درندوں کی بادشاہی کا دن آئے گا تو ان کو ہم سے کون چھڑائے گا، اس وقت تو صرف ہم ہی ان کے محافظ[3] وغیرہ سب کچھ ہوں گے،

---

[1] مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ ہم سب حاضرین مجلس بھی روئے، فتح الباری ۳۱/۷ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کا رونا یا تو زیادتی خوشی کے سبب تھا، یا شوقِ جنت کے لئے تھا یا بطور خشوع و تواضع کے تھا، اور غالباً دوسرے لوگوں کا رونا بھی جنت و نعیم جنت اور حصول رضائے خداوندی کے شوق کی فراوانی کے سبب ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

[2] بخاری باب فضل الطہور ۱۵۴ میں اس طرح ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت بلالؓ سے فرمایا:۔ تم نے اسلام لانے کے بعد کون سا عمل سب سے زیادہ امیدِ مغفرت و رضائے خداوندی کا کیا ہے، جس کے سبب میں نے جنت میں اپنے آگے آگے چلنے کی تمہاری نعلین کی آواز سنی ہے انہوں نے عرض کیا میں نے اس سے زیادہ پر امید کوئی عمل کیا کہ جب بھی دن رات کے کسی حصے میں کوئی وضو کیا تو اس سے جتنی بھی نماز مقدر تھی وہ ضرور پڑھی ہے۔

حافظؒ نے لکھا کہ امام بخاری اس حدیث کو ذکر بنی اسرائیل میں بھی لائے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ قصہ قبل اسلام کا ہے، اگرچہ بھیڑیئے کے کلام کرنے کا ایسا ہی واقعہ بعض صحابہ کے ساتھ بھی پیش آیا ہے، چنانچہ ابونعیم نے دلائل میں اہبان بن اوس سے نقل کیا کہ میں اپنی بکریوں میں تھا، بھیڑیا آیا اور ایک بکری پر حملہ آور ہوا، میں اس پر چیخا تو بھیڑیا اپنی دم بچھا کر بیٹھ کر مجھ سے کہنے لگا:۔ جس دن تو اس کا دھیان و خیال نہ کر سکے گا (کہ اپنے ہی فکر و غم میں مدہوش ہوگا) اس کی حفاظت کون کرے گا؟ تو مجھے میری اُس رزق سے محروم کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے پیدا کیا ہے" میں نے تعجب سے اپنی ہتھیلی پر ہاتھ مارا کیا اور کہا:۔ واللہ:۔ میں نے اس سے زیادہ عجیب ماجرا نہیں دیکھا، اس نے کہا واہ! اس سے زیادہ عجیب تو یہی ہے کہ رسول خدا ﷺ ان کھجوروں کے باغات کے درمیان رونق افروز ہیں جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں اس کے بعد اہبان بن اوسؓ نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ مبارک میں پہنچے اور حضور کو اس واقعہ کی خبر دی، اور اسلام لائے۔ (فتح ۱۷/۷)

[3] حافظؒ نے لکھا:۔ یعنی اس وقت درندے، بکریوں کو پکڑیں گے تو ان کو ہم سے چھڑانے والا کوئی نہ ہوگا، اس وقت تم ان سے بھاگو گے (یعنی شرور و فتن میں ایسے مبتلا ہو گئے کہ بکریوں کی حفاظت کی طرف دھیان بھی نہ دے سکو گے اور وہ یوں ہی آوارہ پھریں گے) اور ہم سے زیادہ قریب ہوں گے، ہمارا ہی ان پر ہر قسم کا کنٹرول و اختیار ہوگا، جتنی چاہیں گے، کھائیں گے اور جتنی چاہے دوسرے وقت کے لئے بچائیں گے الخ (فتح ۱۸) بہائم کی گفتگو کرنے کا ایک واقعہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر فرمایا کہ ایک شخص اپنی گائے یا بیل کو ہنکا کر لے جا رہا تھا اور اس پر بوجھ لاد رکھا تھا، وہ جانور بولا کہ میں اس کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں، راوی حدیث نے کہا کہ لوگوں نے یہ سن کر تعجب کے ساتھ سبحان اللہ کہا، اس پر نبی اکرم علیہ نے فرمایا کہ میرا تو اس وقعہ کے حق ہونے پر ایمان ویقین ہے اور ابوبکر وعمر کو بھی اس پر ایمان ویقین حاصل ہے" حافظؒ نے لکھا کہ یہ حدیث بروایت ابی سلمہ مزارعتہ میں بھی گزری ہے اور اس میں ابوسلمہ کا یہ قول بھی مروی ہے کہ اس قصہ کے بیان کے وقت حاضرین وسامعین میں ابوبکر وعمرؓ موجود بھی نہ تھے گویا حضور علیہ السلام نے ان دونوں کے صدقِ ایمانی وقوتِ یقین پر بھروسہ کر کے ایسا ارشاد فرمادیا تھا، اور یہی بات اس امر کے زیادہ مناسب بھی ہے کہ اس واقعہ کو ان دونوں کے مناقب میں ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد حافظؒ نے لکھا کہ ابن حبان کی روایت میں راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ ہی سے دونوں قصوں کے آخر میں یہ بھی ہے کہ لوگوں نے کہا" ہم بھی اس پر ایمان لاتے ہیں جس پر رسول خدا علیہ ایمان لائے ہیں" پھر حافظ نے لکھا:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خوارقِ عادات پر تعجب کا اظہار جائز ہے (کیونکہ کچھ صحابہ یا سب نے اولاً اظہارِ تعجب کیا تھا) اور معارف کے ادراک وفہم میں لوگوں کا تفاوت اور فرق مراتب بھی معلوم ہوا (کہ کچھ لوگوں نے یا سب نے ہی اولاً اظہار تعجب کیا، اگرچہ آخر میں سب ہی کامل اطمینان ویقین کے مرتبہ پر فائز ہوگئے، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (فتح ۱۸/۷)

بشارۃ علم! بخاری ومسلم میں حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں نے خواب دیکھا کہ دودھ پیا اتنا کہ اس کی وجہ سے تروتازگی کے اثرات اپنے ناخنوں تک میں محسوس کئے، پھر وہ باقی دودھ عمر کو دیا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر سمجھی تو آپ نے فرمایا علم، حافظؒ نے لکھا کہ ایک حدیث میں یہ بھی اضافہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا:۔ وہی علم جو حق تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے جو آپ کے سیر ہونے کے بعد بچا تو اس کو حضرت عمرؓ نے لے لیا، حضور نے فرمایا تم نے ٹھیک سمجھا، اس صورت میں ایسا ہوا ہوگا کہ کچھ صحابہ نے تعبیر حضور علیہ السلام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تاریخ اسلام میں اور بھی بہت معروف ومشہور ہے جو "یوم الاباقر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تاریخ طبری اور تاریخ ابن الاثیر میں ہے کہ قادسیہ کے مشہورِ عالم تاریخی واقعہ سے قبل حضرت سعدؓ نے عاصم بن عمرو کو میسان کی فتح کے لئے روانہ کیا، عاصم وہاں پہنچے تو دشمن قلعہ میں داخل ہو کر محفوظ ہوگئے، مسلمانوں کو سامان رسد کی دقت پیش آئی اور دودھ گوشت کا ملنا بھی دشوار ہوگیا، عاصم نے ہر چند کوشش کی مگر گائے بکریاں کہیں سے دستیاب نہ ہوئیں اتفاق سے ایک بن کے کنارے پر اہل فارس میں سے ایک شخص ملا، جو ایک چرواہا تھا، اس سے پوچھا کہ دودھ اور بار برداری کے مویشی کہاں ہیں؟ تو اس نے کہا کہ مجھے خبر نہیں ہے، لیکن اسی وقت بن کے اندر سے ایک بیل نے بلند آواز سے کہا کہ "دشمنِ خدا نے جھوٹ کہا ہم تو یہاں موجود ہیں، یہ سنتے ہی عاصم اس بن میں داخل ہوگئے، سب گائے بیلوں کو ہانک لائے اور لشکر پر تقسیم کردیا، اس واقعہ کو تفصیل ودلائل کے ساتھ "اشاعتِ اسلام معروف بہ دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" میں بھی ذکر کیا گیا ہے، دیکھو ۱۰۹ الخ اس موقع پر پتھروں اور درختوں کا حضور علیہ السلام کو سلام کرنا اور استوانہ حنانہ کا آپ کے فراق میں رونا جو احادیث صحاح بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں مروی ہیں اور اشاعت اسلام میں بھی ۱۲۲ وغیرہ میں مذکور ہیں، اس مضمون کی تائید کے لئے کافی ہیں، نیز حضرت عمرؓ نے اپنے اسلام سے قبل بچھڑے میں سے حضور علیہ السلام کی بعثت کی بشارت سنی تھی، یہ بھی بخاری میں ہے، اور قربِ قیامت میں یہود سے جو مسلمانوں کی بڑے پیمانہ پر لڑائی ہوگی، اس میں پتھروں کے پیچھے یہودی چھپیں گے اور وہ پتھر مسلمانوں کو بتلائیں گے کہ یہودی یہاں چھپا ہے اس کو قتل کرو۔ (بخاری ۵۰۷ وغیرہ)

رہا یہ کہ جانوروں نے خود کو قربانی کے لئے اپنی خوشی سے کیسے پیش کردیا تھا، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ابوداؤد ومسند احمد میں حدیث ہے کہ حجتہ الوداع میں ۱۰ ذی الحجہ کو قربانی کی تو ہر اونٹنی حضور اکرم علیہ سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتی تھی کہ پہلے مجھے ذبح فرمائیں۔

بذل المجہود ۳/۹۳ میں لکھا:۔ اس سے معلوم ہوا کہ بے زبان حیوانات بھی حضور سے محبت کرتے تھے اور خدا کے راستے میں موت کو آپ کے مبارک ہاتھوں کے ذریعہ پسند کرتے تھے، اور یہ (ظاہر میں سب کے سامنے ان کا آپ سے قریب ہونے کی سعی کرنا) آپ کے بڑے اہم معجزات میں سے ہیں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ کیا عجیب ہے کہ ہر قربانی کا جانور اسی طرح ہر امتی کے ہاتھوں ذبح ہونے کو بھی اسی طرح پسند کرتا ہو بلکہ حلال ذبیحہ کے جانور بھی، کیونکہ اس طریقہ سے وہ خدا کے احکام کی تعمیل میں اپنی جان جان آفریں کے حوالے کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ فضیلت ان کو موتِ طبعی اور دوسرے طریقوں پر مرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔

لہ بخاری ۷/۵۱ اور بخاری ۳۱۲/۱ (ابواب المزارعتہ) میں سے ہے کہ اس پر سوار ہو کر چلا رہا تھا (ممکن ہے تھک کر سوار بھی ہوگیا ہو) اور بخاری ۴۹۳ (ذکر بنی اسرائیل) میں اس طرح ہے کہ ایک دن نبی اکرم علیہ نماز صبح کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، اور بیان کیا کہ ایک شخص اپنے بیل کو ہنکائے لئے جا رہا تھا پھر اس پر سوار ہوا اور مار کر چلانے لگا، تب اس نے کلام کیا، یہاں برعکس روایت ۵۱۷ بقرہ کا قصہ قصہ ذئب سے مقدم ہے اور بخاریؒ ۵۲۱ میں اختصار ہے کہ فقط قصہ ذئب کا ذکر ہے۔

پوچھی ہوگی اور کچھ نے خود جو تعبیر سمجھی تھی، اس کو آپ کے سامنے پیش کیا ہوگا۔ (فتح ۳۲/۷)

قوت عمل! بخاری ومسلم میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کنویں پر ہوں، جس پر ڈول پڑا ہے، میں نے اس سے پانی نکالا جتنا خدائے تعالیٰ کی مشیت میں تھا، پھر اس سے ابوبکر بن ابی قحافہ نے ایک دو ڈول نکالے جس میں کمزوری ظاہر ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، پھر وہ ڈول بڑا ہوگیا (چڑسہ کی طرح جو چمڑے کا بناتے ہیں بڑے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے کے لئے) ابن الخطاب نے اس سے پانی نکالا، میں نے کسی بڑے قوی شخص کو نہیں دیکھا، کہ اس نے ان کے برابر ڈول کھینچے ہوں، یہاں تک کہ لوگوں نے خوب سیر ہوکر پانی پیا، اور اونٹوں کو بھی پلایا اتنا کہ اس کنوئیں کے چار طرف پانی کی کثرت کی وجہ سے اونٹوں نے اپنے بیٹھنے کی جگہ بنالی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ابوالطفیل سے مندرجہ ذیل خواب کی بھی نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔ میں آج خواب میں پانی کھینچ رہا تھا کہ بھوری وسیاہ بکریاں میرے پاس آکر جمع ہوگئیں، پھر ابوبکر آئے انہوں نے ایک یا دو ڈول آہستہ آہستہ کھینچے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، پھر عمر آئے اور ڈول بڑا ہوگیا، انہوں نے حوض کو پانی سے بھر دیا، جس سے سب لوگ سیراب ہوگئے، میں نے ان سے بہتر کسی کو پانی کھینچتے نہیں دیکھا، سیاہ بکریوں سے میں نے عجم اور بھوری بکریوں سے عرب کی تعبیر لی ہے۔ (ازالہ ۱/۵۸۱)

حسب تحقیق محدثین ان خوابوں سے اشارہ ان سیاسی حالات وخدمات کی طرف ہے، جو خلافتِ صدیقی وخلافتِ فاروقی میں ظاہر ہوئے، واللہ اعلم!

اسلام عمر کے لئے دعاءِ نبوی

مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباسؓ وحضرت عائشہؓ سے دعاءِ نبوی مروی ہے کہ ''یا اللہ! اسلام کو عمر بن الخطاب سے عزت بخش یا تائید عطا کر، حاکم نے اس روایت کو شرطِ شیخین پر بتلایا، اگرچہ ان دونوں نے اس کی تخریج نہیں کی، علامہ ابن ربیع نے مختصر المقاصد الحسنہ للسخاوی میں لکھا کہ حدیث اللھم اید الاسلام باحب ھذین الرجلین الیك بابی جھل اور بعمر بن الخطاب کی روایت امام احمد وترمذی نے کی ہے اور ترمذی نے اس کو حسن صحیح غریب کہا، لیکن یہ جو مشہور ہے ''اللھم اید الاسلام باحد العمرین '' اس کی مجھے کوئی اصل نہیں معلوم ہوئی صاحب مرقاۃ نے لکھا کہ اللھم اعز الاسلام بعمر کے مضمون حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کو از قبیلہ فعززنا بثالث یا زینو القرآن باصواتکم سمجھنا چاہیے، اور اس کو نوعِ قلب فی الکلام سے بھی قرار دے سکتے ہیں جیسے عرضت الناقة علی الحوض میں ہے اور اسی لئے زینو الاصواتکم بالقرآن بھی وارد ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ اُس ابتدائی دور اخفاءِ دین سے ترقی کر کے اعلاءِ دین کی نوبت حضرت عمرؓ ہی کے ذریعہ آئی، چنانچہ کلام الٰہی میں ارشاد ہوا، یایھا النبی حسبك الله ومن اتبعك من المؤمنین، کہ حضرت عمرؓ نے چالیس کا عدد پورا کر دیا، اور پھر آپ ہی کے ذریعہ آخر میں بھی بہ کثرت فتوحاتِ بلاد اور وسیع پیمانہ پر اشاعتِ اسلام کی صورت ظاہر ہوئی، اور ان دونوں زمانوں کے درمیانی عرصہ میں آپ کی سختی وشدت بمقابلہ منافقین ومشرکین بھی خوب ظاہر ہوئی، جس کو اشداء علی الکفار سے بیان کیا گیا ہے، اور جو کچھ خلافتِ صدیقی میں کارہائے نمایاں انجام پائے اور مرتدین کے ساتھ جہاد وغیرہ ہے، وہ سب بھی حضرت عمرؓ کی اعانت ومشورہ ہی سے ہوئے ہیں اور جو کچھ بھی نزاعی صورتیں پیش آئیں اور آپس کی مخالفتیں اور جھگڑے لڑائیاں وہ سب حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ظاہر ہوئے ہیں، آپ کی زندگی میں کسی داخلی یا خارجی فتنہ نے سر نہیں اٹھایا، اور غالباً اسی لئے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا:۔ ''**لو کان بعدی نبی لکان عمر الخطاب**'' اور آپ کے اسلام لانے پر حضرت جبرائیل علیہ السلام اُترے اور فرمایا اے محمد! آسمان والوں نے عمر کے اسلام سے بڑی خوشی منائی ہے'' (دارقطنی وابوحاتم) مرقاۃ ۵/۵۳۸!

اعلان اسلام پر کفار کا ظلم و ستم برداشت کرنا

حضرت عمرؓ اسلام لائے تو آپ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا''یا رسول اللہ'' کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ نے جواب دیا، ہاں ضرور ضرور، جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس کی قسم کہ تم حق پر ہو، زندگی میں بھی اور موت پر بھی، پھر عرض کیا کہ ایسا ہے تو پھر چھپا ہوا اسلام کیسا؟ قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، آپ ہمیں باہر نکل کر اسلام ظاہر کرنے کی اجازت دیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے ہمارے دو گروہ بنا دیئے، ایک میں حضرت حمزہؓ (آپ کے چچا تھے جو تین روز پہلے اسلام لائے تھے) اور دوسرے میں میں تھا پھر ہم مسجد حرام میں پہنچ گئے، اور میں نے قریش کو دیکھا کہ گویا ان پر ایسی بڑی مصیبت آپڑی ہے کہ اس جیسی کبھی نہ آئی تھی، اور اسی دن سے حضور علیہ السلام نے مجھے''فاروق کا خطاب دیا کہ حق تعالیٰ نے میری وجہ سے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا (مرقاۃ ۵۳۸/۵) مسند احمد وترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام لاتے ہی مسجد حرام میں جا کر سب کے سامنے نماز ادا کی، (اس سے پہلے سب مسلمان چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔)

ابن اسحاق کی روایت بواسطہ حضرت ابن عمرؓ اس طرح ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام لانے کے بعد پوچھا کہ قریش کا کون سا شخص ایسا ہے جو کسی بات کو جلد مشہور کر دیتا ہے، معلوم ہوا جمیل بن معمر جمحی، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں اس وقت چھوٹا تھا، میں بھی ساتھ ہو گیا، آپ نے اس کے پاس جا کر کہا کہ دیکھو! میں اسلام لے آیا ہوں اور محمد ﷺ کے دین میں داخل ہو گیا ہوں، جمیل نے خاموشی سے اس بات کو سنا اور فوراً اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے چل دیا حضرت عمرؓ بھی ساتھ ہو لئے، وہ جا کر کعبہ کے دروازہ پر کھڑا ہوا اور نہایت بلند آواز سے قریش کو پکار کر اپنے گرد جمع کر لیا، اور سنایا کہ عمر بن الخطاب بے دین ہو گیا ہے، حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ ساتھ کہا کہ یہ جھوٹا ہے، میں بے دین نہیں ہوا بلکہ مسلمان ہو گیا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ سنتے ہی سارے کافروں نے ان پر ہجوم کیا اور میرے والد (حضرت عمرؓ) کافروں کو مارنے لگے اور کافر میرے والد کو، یہاں تک کہ دوپہر کا وقت ہو گیا اور بالآخر میرے والد تھک کر ایک طرف بیٹھ گئے، اور وہ سب لوگ آپ کے پاس کھڑے ہوئے اور پھر مارنا شروع کیا، میرے والد نے کہا کہ جو تم سے ہو سکے کرو، میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر ہم لوگ تین سو بھی ہوتے تو یا تو ہم مکہ کو تمہارے لئے خالی کر دیتے یا تم مکہ ہمارے لئے خالی کر دیتے۔ اسی اثنا میں قریش کا ایک بوڑھا شخص آیا اور وہ حیرہ کی چادر اور تہبند اور ایک عمدہ قمیص پہنے ہوئے تھے اس نے کفار کو سمجھایا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو، ایک شخص نے اپنے لئے جو چاہا کیا تمہارا اس میں کیا حرج ہے، اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ بنی عدی (حضرت عمرؓ کے قبیلہ والے) اپنا آدمی تمہارے حوالے کر دیں گے کہ تم اس کو قتل کر ڈالو، لہذا اس کو چھوڑ دو (ازالۃ الخفاء ۱۶۱/۱) یہ شخص عاص بن وائل سہمی تھا، اور اسی قصے میں دوسری روایت سے یہ بھی منقول ہے کہ اس نے آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا تا کہ پھر کوئی آپ کو ایذا نہ دے، مگر حضرت عمرؓ ہی کا بیان ہے کہ چند روز تو اس طرح گزرے مگر میں جب شہر میں جگہ جگہ دیکھتا کہ دوسرے مسلمانوں کو ستایا جا رہا ہے، اور ان کو مارا پیٹا جاتا ہے تو میں اس کو خاموش نہ دیکھ سکا، اور میں نے اپنی ضمانتی عاص بن وائل سے کہہ دیا کہ آپ اپنی ذمہ داری ختم کر دیں میں خدا کی مدد سے ان سب کا مقابلہ کر لوں گا، اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ظلم سے ضرور چھڑاؤں گا۔

دفاعی جہاد! اس قصہ سے معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ کی ۱۳ سالہ زندگی میں اگرچہ مسلمانوں نے کفار کے مقابلہ میں کوئی اقدامی جہاد نہیں کیا، مگر دفاعی جہاد برابر کرتے رہے یعنی دوسروں کی ایذا رسانیوں اور ظلم و ستم کے مقابلہ میں اپنی ڈیفنس اور مدافعت وحق خود حفاظتی کا استعمال ضرور کیا ہے، اور یہ فرض مسلمانوں پر بہر صورت عائد رہتا ہے کوئی وقت اور کوئی حالت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے جب بھی کوئی ایک شخص یا

بہت سے لوگ کسی مسلمان مردعورت کی جان ومال وآبرو پر حملہ آور ہوں تو اس کا دفاع (ڈیفنس) جس طرح بھی ممکن ہو کرنا فرضِ عین ہے کیونکہ ہماری جان ومال وآبرو ہمارے پاس خدا کی امانت ہیں، جو ہر مسلمان مردوعورت سے اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے میں خرید کر ہمیں دے رکھی ہیں اوران کی حفاظت کا فرض ہم پر لازم کیا ہے، لہٰذا ان پر اگر کوئی حملہ کرے تو اس وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہم پوری طرح دفاع کرسکتے ہیں یا نہیں بلکہ صرف خدا پر بھروسہ کر کے جتنا بھی ہوسکے کرے، ایسے وقت میں خدا کی غیبی امداد ضرور ضرور اس کو حاصل ہوگی، برخلاف اس کے کہ اگر حملہ آور کے مقابلہ میں بزدلی، لاچارگی یا خوشامد وغیرہ دکھلائی جائے گی تو یہ خدا کے عتاب وغضب کا سبب ہوگی اوراس کی مدد سے بھی محرومی ہوگی، پھراس سے نہ دین سالم رہے گا نہ دنیا حاصل ہوگی۔

پھراس وقت تو ساری دنیا نے سلف ڈیفنس، حقِ خوداختیاری، رائے اور مذہب کی آزادی وغیرہ کو بطور حقوق انسانیت کے تسلیم کر لیا، اگر کسی جگہ اِن حقوق کو سلب کیا جائے تو ساری دنیا سے بھی اس کے لئے اخلاقی امداد حاصل کی جاسکتی ہے۔

اقدامی جہاد! اگر دنیا کے کسی خطہ میں لوگوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جارہا ہو یا ان کو حقوقِ انسانیت سے محروم کیا جارہا ہو تو دوسرے یا اقتدار لوگوں کا انسانی ومذہبی فریضہ ہے کہ ایسے لوگوں کی امداد کریں، اورجس صورت سے بھی ممکن ہو ان کو ظالموں کے پنجہ سے رہا کرائیں اوران کو پورے حقوق دلائیں اوراس کے بغیر چین سے نہ بیٹھیں کیونکہ "الخلق عیال اللہ" ساری دنیا کی مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ اگر خاندان کے کسی ایک فرد کو بھی مشقِ ستم بنایا گیا تو باقی لوگوں سے ضرور اس کا مواخذہ ہوگا جو ان کے معاملہ میں کوتاہی یا غفلت برتیں گے، اور سیاسی غفلتوں اور غلط کاریوں کا بدلہ اس دنیا میں بھی دیا جاتا ہے، تاریخ اس پر شاہد ہے، ایسا جہاد ابتداءِ آفرینش عالم سے لے کر اب تک ہرآسمانی مذہب کا ایک اہم جزو رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، اسلام نے جہاں مذاہب سابقہ کے تمام دوسرے اعمال واحکام کی تکمیل کی ہے، جہاد کے بارے میں بھی نہایت مکمل ومفصل ہدایات دی ہیں، جو دنیاوی جنگوں اور لڑائیوں کی برائیوں سے پاک وصاف ہیں، یہ سب ہدایات قرآن وحدیث، فقہ کی کتاب السیر اور کتب سیر وتاریخ میں موجود ہیں، ہر دور کے علماءِ اسلام نے ان کو صحیح صورت میں پیش کیا ہے، اور یہ سمجھنا اور کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ کسی دور کے اہلِ علم واہلِ قلم نے جہاد سے انکار کردیا ہو یا کہا ہو کہ ہمارے یہاں جہاد نامی کوئی چیز نہیں ہے، ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دور میں بھی جب اسلامی جہاد غلامی، تعدد ازدواج وغیرہ پر اعتراضات اٹھائے گئے تو ہندوستان کے تمام علماءِ نے بالعموم اور علمائے دیوبند نے بالخصوص ان کے منہ توڑ جوابات دیئے، اخبارات ورسائل اور مستقل کتابوں کی شکل میں بھی بہت کچھ لکھا گیا، اس سلسلہ میں صاحبِ تفسیر حقانی، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی وغیرہ کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ اور اکابرِ دیوبند میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تصانیف رسالہ القاسم والرشید کی خدمات، اور دارالعلوم دیوبند اور نیز دیگر صدہا مدارسِ اسلامیہ عربیہ کے درسِ تفسیر وحدیث کو کیونکر زوایۂ خمول میں ڈالا جاسکتا ہے جہاں پر ان سب مسائل کو پوری تحقیق وتفصیل کے ساتھ پڑھایا جاتا رہا ہے اور مخالفوں کے اعتراضات کو پوری قوت کے ساتھ دلائل عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں برابر رد کیا جاتا رہا ہے، پھر خاص طور سے جہاد کے بارے میں تو اکابرِ دیوبند اور دوسرے علماءِ ہند نے انگریزوں کی عظیم تر جابر وقاہر طاقت کے معاملہ میں عملی طور سے بھی وہ کچھ کردکھایا جس کی اس دور میں نظیر کم ہی ملے گی، ہندوستان میں اگر مغربی فلسفہ اور حکومت متسلطہ سے مغلوب یا متاثر ہو کر چند لوگوں نے اسلامی عقائد میں ترمیم کی یا اہلِ مغرب کے اعتراضات کو وزنی سمجھ کر ان کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا تو اوّل تو وہ تعداد میں بہت تھوڑے تھے دوسرے وہ اہلِ قلم تو ضرور تھے مگر اہلِ علم قطعاً نہ تھے، کیونکہ علومِ دین میں ان کو کوئی بھی درجہ وامتیاز حاصل نہ تھا، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اس دور کی تصویر مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرے تو اس کو کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جاسکتا:۔

جنگ کے میدان میں شکست کھا کر، انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے دورِ اوّل میں مسلمانوں کے اہل علم واہل قلم نے مغربی فلسفہ کو حق مان کر اسلامی عقائد میں ترمیم کرنا شروع کی، مغربی تہذیب کو بجاودرست سمجھ کر اسلامی تہذیب کی شکل بگاڑنے اور اس کے اندر نئے پیوند لگانے کا سلسلہ جاری کیا، اور اسلام پر اہل مغرب کے اعتراضات کووزنی سمجھ کر ان کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کرلیاان چیزوں پر نگاہ کرنے کے بجائے ہمارے یہاں کے اہل علم اور اہل قلم نے سرے سے اس بات کا انکار ہی کردیا کہ ہمارے یہاں جہاد نامی بھی کوئی چیز ہے، اسی طرح جب اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہوا تو ہمارے یہاں کے اہل علم واہل قلم نے فوراً اس بات کا انکار کردیا کہ اسلام میں غلامی کا بھی کوئی قانون ہے، اسی طرح جب ہمارے تعدد ازواج پر اہل مغرب کی طرف سے اعتراض کیا گیا تو ہمارے یہاں کے اہل علم اور اہل قلم اس پر شرمندہ ہوکر طرح طرح کی معذرتیں پیش کرنے لگے، لیکن اب ہمارے اندر ایسے محققین خدا کے فضل سے موجود ہیں جو اس طرح کی ہر کج فہمی کا استیصال کرنے اور مسلمانوں کو غلط فہمیوں سے بچانے میں کامیاب ہورہے ہیں، (جواب خطبہ استقبالیہ لندن از علامہ ابوالاعلیٰ مودودی، مورخہ ۱۵دسمبر ۶۸ء شائع شدہ تجلی ماہ جون ۷۰ء)

اس وقت بالکل خلافِ توقع ایک چیز سامنے آئی، اس لئے یہ سطور زبانِ قلم پر آگئیں، ورنہ علامہ مودودی کے بیشتر علمی افادات اور دینی وملی خدمات کی اہمیت وافادیت کے ہم خود بھی کھلے دل سے مقر ومعترف ہیں، چونکہ اوپر کے مضمون میں صحیح علم وفضل کے وارثِ علماءِ حق کا کہیں بھی کوئی ذکر نہیں کیا گیا، اور مطلقاً اُس دور کے اہل علم واہل قلم کی طرف ایک ہی بات غلط منسوب کردی گئی، تو اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ جیسے ایک سوسال کے اُس دور میں صحیح وسچی بے لاگ بات کہنے والے اہل علم واہل قلم کا کوئی وجود نہ تھا اور اس پوری مدت کے گزر جانے پر اب ہمارے اندر خدا کے فضل سے محققین پیدا ہوئے ہیں، خصوصیت سے باہر کی دنیا میں تو اس طرح کی بات سے اور بھی زیادہ غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت ومدافعت کفار

حضرت عمرؓ سب مسلمانوں کی بالعموم اور حضور اکرم ﷺ کی بالخصوص حفاظت اور مدافعت کفار ومشرکین کا اہتمام فرماتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حدیث دفعِ کفار روایت کی ہے یعنی حضرت ابوبکر وعمرؓ کا آں حضرت ﷺ سے کفار کو دفع کرنا، اور یہ ان کے بڑے مناقب میں سے ہے (ازالۃ الخفاء ۲۱۲/۱)

بیہقی میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ مکہ معظمہ کی وادی اضم میں تشریف لے گئے، جہاں قریش کا مشہور بہادر پہلوان رُکانہ بکریاں چرایا کرتا تھا، آپ تنہا تھے، اُس نے غصہ میں کہا کہ اگر تم سے قرابت نہ ہوتی تو آج میں تمہارا قصہ ہی پاک کردیتا، تاہم آؤ ہم دونوں مقابلہ کریں اور تم اپنے خدا سے مدد مانگو اور میں اپنے لات وعزیٰ کو مدد کے لئے پکاروں، اگر تم نے مجھے پچھاڑ دیا تو میں دس بکریاں انعام دوں گا، آپ نے اس کو پچھاڑ دیا اور سینہ پر سوار ہوگئے، اس نے تین بار کشتی لڑی اور چت ہوگیا اور تیس بکریاں انتخاب کرنے کو کہا، آپ نے فرمایا مجھے بکریوں کی ضرورت نہیں، البتہ یہ چاہتا ہوں کہ تم توحید ورسالت کا اقرار کرلو، اس نے کہا کہ کوئی اور معجزہ دکھلاؤ، آپ نے قریب کے ایک بڑے کیکر کے پیڑ کی طرف اشارہ کیا کہ خدا کے حکم سے میرے پاس آجاؤ، فوراً ہی اُس درخت کے دو حصے ہوگئے اور آدھا درخت ان دونوں کے درمیان آکھڑا ہوا، رُکانہ نے کہا اچھا! اب اس کو واپس کردو، آپ نے فرمایا، اگر ایسا ہوا تب تو میری تصدیق کروگے؟ کہا ہاں! ضرور کرونگا آپ نے درخت کو حکم دیا کہ اپنی جگہ واپس ہوجائے تو وہ فوراً واپس ہوگیا۔

رُکانہ نے کہا کہ اب میرے پاس کوئی عذر نہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ شہر کی عورتیں اور بچے کہیں گے کہ رُکانہ، محمد سے مرعوب ہوگیا، آپ تیس بکریاں چھانٹ کر ریوڑ میں سے لے لیں، آپ نے فرمایا مجھے تمہاری بکریوں کی ضرورت نہیں، اسی اثناء میں حضرت ابوبکر وعمرؓ آپ کو مکہ

معظمہ میں نہ پاکر سخت پریشان ہوکر تلاش میں نکل چکے تھے، اور ٹیلوں پر چڑھ چڑھ کر نظریں دوڑاتے تھے کہ آپ کو دیکھ لیں، جب آپ کو واپس آتے دیکھا تو دوڑ کر حاضر خدمت ہوئے، اور عرض کیا کہ آپ کو اس طرح تنہا اس وادی میں نہ آنا تھا کہ یہاں رُکانہ جیسا عدوئے اسلام بکریاں چرانے آتا ہے، آپ نے فرمایا:۔ اطمینان رکھو، جس ذاتِ برتر نے مجھے نبوت سے سرفراز کیا، وہ میری حفاظت بھی کرتی ہے الخ (سیرت کبریٰ ۲/۵۶۸)

عمیر[1] بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا، وہ اور صفوان بن امیہ حجر (حطیم بیت اللہ) میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کررہے تھے، صفوان نے کہا خدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں رہا، عمیر نے کہا سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہوکر جاتا اور محمد کو قتل کرکے آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے، صفوان نے کہا تم قرض کی اور بچوں کی فکر بالکل نہ کرو، ان کا میں ذمہ دار ہوں، عمیر نے گھر آکر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا، وہاں حضرت عمرؓ ایک جماعتِ مسلمین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جنگِ بدر کے حالات بیان کررہے تھے کہ آپ کی نظر عمیر پر پڑی کہ گلے میں تلوار ڈالے مسجد نبوی کے دروازہ پر اونٹ سے اترا، آپ نے کہا یہ دشمنِ خدا خبیث عمیر بن وہب آرہا ہے، ضرور کوئی شر لے کر آیا ہے، اسی نے ہماری قوم میں جنگ کرائی ہے اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے، اور آپ کو عمیر کی آمد سے آگاہ کیا، آپ نے فرمایا کہ اس کو میرے پاس لاؤ! حضرت عمر فاروقؓ عمیر کا گلا دبائے ہوئے حضور کے پاس لے کر آئے، آپ نے فرمایا عمر! چھوڑ دو اور عمیر سے فرمایا میرے قریب آجاؤ۔ پھر پوچھا کس ارادہ سے آئے ہو؟ جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں، فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیر یہ سُن کر حیران

---

[1] استیعاب ۲/۴۳۵ میں حضرت عمیرؓ کے حالات اس طرح لکھے ہیں:۔ قریش میں بڑے مرتبہ و عزت والے تھے، بدر میں کافروں کے ساتھ ہوکر مسلمانوں سے لڑے، اور احد سے پہلے مسلمان ہوکر کفار سے لڑے، پھر فتح مکہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ تھے،

بدر کے دن قریش سے انصار کے بارے میں کہا میں سانپوں کی شکل وشمائل والے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، جو بھوک پیاس کی وجہ سے مرتے نہیں اور جب تک اپنی برابر ہم میں سے نہیں مار ڈالیں گے لڑائی سے باز نہ آئیں گے، لہٰذا اپنے روشن اور خوبصورت چہروں کو ان کے مقابلے پر لے جا کر اپنی گت خراب مت کرو، قریش نے کہا، چھوڑ و ایسی باتیں نہ کرو یہ وقت تو اپنی قوم کو جوش دلانے کا ہے وہ کام کر۔

اس پر عمیر سب سے پہلے اپنے گھوڑے سے اُتر کر میدان جنگ میں کود پڑا اور لڑائی شروع ہوگئی، وہ قریش کے بڑے بہادروں میں تھا اور ہر لحاظ سے ان کے شیاطین میں سے ایک شیطان سمجھا جاتا تھا، اس نے ہی ہمت کرکے عسکرِ نبوی کے اردگرد ایک چکر بھی لگایا تھا کہ لشکر کی تعداد کا اندازہ کرے، بدر کی لڑائی میں اس کا بیٹا وہب قید ہوگیا تھا، پھر عمیر حضور اکرم ﷺ کے ارادہ قتل کے ساتھ مدینہ منورہ گیا تھا کہ موقع دیکھ کر اچانک آپ پر حملہ کرے، اور یہ سازش مکہ معظمہ میں صفوان بن امیہ کے ساتھ ہوئی تھی، جس کی خبر حضور علیہ السلام کو ہوگئی تھی عمیر مدینہ پہنچا تو مسجد نبوی کے دروازہ پر حضرت عمرؓ کو پایا، آپ نے اس کو گردن سے پکڑ کر حضور علیہ السلام کے پاس پہنچایا، اور عرض کیا کہ یہ شیطان قریش بُرے ارادہ سے آیا ہے، حضور نے فرمایا، عمر! اس کو چھوڑ دو اور اپنے پاس بلا کر اپنے جسدِ اطہر سے لپٹا لیا، پھر اس سازش کا ذکر کیا، جس کو سُن کر عمیر اسلام لے آئے رضی اللہ تعالیٰ اور مکہ معظمہ واپس جا کر صفوان کے پاس نہ گئے، حضرت عثمانؓ کی ابتداءِ دورِ خلافت تک زندہ رہے ان کے صاحبزادے وہب بن عمیرؓ کچھ دن پہلے اسلام لا چکے تھے، حضرت عمرؓ نے جو چار بہادر جلیل القدر صحابہ حضرت عمرو بن العاصؓ فاتحِ مصر کی امداد کے لئے بھیجے تھے، یہ ان میں سے ایک تھے، دوسرے حضرات زبیر بن العوام، خارجہ بن حذافہ، بسر بن ارطاۃ (یا مقداد) تھے، ایک غیر قوی سند سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے عمیرؓ کے لئے اپنی چادر مبارک بچھائی تھی، اور فرمایا تھا کہ ماموں باپ کے مرتبہ میں ہیں، لیکن ان کے صاحبزادے وہبؓ کے لئے حضور ﷺ کا چادر مبارک بچھانے کا اعزاز بہ کثرت اور مشہور روایت سے ثابت ہے، یہ بھی مروی ہے کہ جب عمیرؓ اسلام کے بعد مکہ معظمہ پہنچے تو صفوان سے نہیں ملے اور سیدھے اپنے گھر چلے گئے، اسلام ظاہر کیا اور دوسروں کو بھی دعوت دی، یہ بات صفوان نے سُنی تو کہا کہ میں نے اس کے پہلے میرے پاس نہ آنے ہی سے سمجھ لیا تھا کہ اُلٹ گیا ہے اور صابی ہوگیا ہے لہٰذا اب اس سے نہ کبھی کلام کروں گا، نہ اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کوئی امداد کروں گا، اس کے بعد حجر بیت اللہ میں صفوان کو حضرت عمیر نے دیکھا اور پکارا تو اس نے اعتراض کیا، اس پر حضرت عمیرؓ نے اس سے کہا:۔ تم ہمارے بڑے سرداروں میں سے تھے، اس بات پر غور کرو کہ ہم پتھروں کو پوجتے اور ان کے نام پر قربانی کرتے تھے، کیا یہ کوئی دین کی بات ہوسکتی ہے؟ لہٰذا میں تو توحید و رسالت کو مان چکا'' صفوان یہ سن کر بھی کچھ نہ بولا۔ ''مؤلف''

ہوگیااور بےاختیار بولا کہ آپ ضرور نبی برحق ہیں، بخدا میرے اور صفوان کے سوااس معاملہ کی کسی فرد کو بھی خبر نہ تھی۔

قریش مکہ نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سُنی تو وہ بھی حیرت میں پڑ گئے اور حضرت عمیرؓ نے مکہ معظمہ واپس جا کر اسلام کی دعوت پھیلائی، اور ایک مجمع کثیر کو اس کی روشنی سے منور کیا (سیرۃ النبی ۳۳۵/۱ بحوالہ تاریخ طبری ۱۳۵۴ وازالۃ الخفاء ۹۷/۲)

غزوۂ احد کے موقع پر جب کچھ دیر کے لئے افراتفری مچی اور گھمسان کی لڑائی میں اپنے پرائے کی بھی تمیز نہ رہی، حضور اکرم علیہ السلام تک بھی کفار پہنچ گئے تھے تو اس وقت بھی آپ کے اردگرد رہنے والوں میں حضرت ابوبکر وعمرؓ وغیرہ ۱۲ صحابی رہ گئے تھے جیسا کہ بخاری ۴۲۶ باب ما یکرہ من التنازع والاختلاف فی الحرب، اور ۶۵۵ کتاب التفسیر میں ہے کہ آپ کے پاس سے بہ کثرت صحابہ کرام گھمسان کی لڑائی کی وجہ سے دور ہوگئے بجز ۱۲ صحابہ کے، مورخ کبیر محقق عینیؒ نے اس حدیث کی شرح میں مورخ بلاذری کا قول نقل کیا کہ مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر، عمر، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، زبیر بن العوام اور ابوعبیدۃ بن الجراح، حضور علیہ السلام کے ساتھ اپنی جگہ پر ثابت قدم رہے تھے اور انصار میں سے حباب بن المنذر، ابودجانہ، عاصم بن ثابت بن ابی الافلح، حارث ابن الصمہ، اسید بن حضیر، سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کہا گیا ہے کہ سہیل بن حنیف رہ گئے تھے (عمدہ ۲۸۳/۱۴ طبع منیریہ) علامہ محدث قسطلانیؒ نے لکھا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ آپ کے صحابہ میں سے ایک جگہ ثابت رہنے والے ۱۴ صحابی تھے، سات مہاجرین میں سے جن میں ابوبکرؓ بھی تھے اور سات انصار میں سے تھے، علامہ محدث زرقانیؒ نے اس کی شرح میں قول مذکور کی نسبت محمد بن سعد کی طرف ظاہر کی، اور اوپر کے نام ذکر کئے، پھر لکھا کہ جن لوگوں نے ان حضرات میں حضرت علیؓ کا ذکر نہیں کیا، وہ اس لئے کہ انہوں نے حضرت مصعبؓ کی شہادت ہونے پر حضور کے پاس سے جا کر جھنڈا سنبھال لیا تھا، لہٰذا ان لوگوں نے ''ثابتین'' میں ان کا نام ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ کے پاس اس روز تیس صحابہ تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی زبانِ قال وحال سے حضور علیہ السلام کو یقین دلا رہا تھا کہ پہلے میرا چہرہ آپ کے چہرہ مبارک پر قربان ہوگا، اور پہلے میری جان آپ کی جان پر قربان ہوگی، آپ پر ہمیشہ کے لئے سلامتی نچھاور ہو، ہم آپ کو اپنے جیتے جی رخصت نہ ہونے دیں گے، پھر علامہ قسطلانیؒ نے لکھا کہ حدیث بخاری میں حضور علیہ السلام کے ساتھ ۱۲ صحابہ کا ثابت قدم رہنا ذکر کیا گیا ہے (شرح المواہب ۳۵/۲ بخاری ۴۲۶ میں غیر اثنی عشر رجلا کے حاشیہ میں قسطلانیؒ شرح بخاری سے بھی منہم ابوبکر و عمر الخ نقل کیا گیا ہے۔

حافظؒ نے لم یبق مع النبی علیہ السلام **فی تلک الایام الذی یقاتل فیھن غیر طلحۃ و سعد** کی شرح میں لکھا کہ روایت غیر ابی ذرؒ میں فی بعض تلک الایام کا لفظ مروی ہے جو زیادہ واضح ہے، اور ان کا انفراد بہ لحاظ بعض مقامات کے ہے کیونکہ اس غزوہ میں حالات مختلف قسم کے پیش آئے ہیں (فتح ۲۵۳/۷)

سیرۃ النبی ۳۸۷/۱ میں ان جاں نثاروں کا عدد گیارہ ذکر کیا اور جن کے ناموں کی تخصیص کا بغیر حوالہ کے ذکر کیا، ان میں حضرت عمرؓ کا اسم گرامی نہیں ہے، پھر صحیح بخاری کی صرف اُس روایت کو نقل کیا، جس میں فقط حضرت طلحہ وسعدؓ کا ذکر ہے باقی دونوں مذکورہ بالا روایاتِ بخاری کا کوئی ذکر نہیں کیا جن میں بارہ صحابہ کا حضور علیہ السلام کے پہلو میں ثابت قدم رہنا مروی ہے، یہ حال ہماری محققانہ کتابوں کا ہے۔

آگے اسی صفحہ میں حضرت عمرؓ کے بارے میں بعض اربابِ سیر نے وہ بات بھی نقل کر دی ہے جو کسی طرح بھی حضرت عمرؓ کے مرتبہ عالیہ کے شایانِ شان نہیں، پھر جبکہ یہی واقعہ بخاری میں بھی مذکور ہے اور اس میں حضرت عمرؓ کا نام نہیں ہے، تو اس کی نقل سے اور بھی زیادہ احتیاط کرنی تھی،

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا:۔ غزوۂ احد میں حضرت عمرؓ کو نمایاں فضائل حاصل ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ جب حضور علیہ السلام اور مسلمان قلعہ بندی کے طور پر پہاڑ پر چڑھ گئے تو حضرت عمرؓ نے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ایک جماعتِ مہاجرین کے ساتھ کفار کا مقابلہ کر کے ان کو دفع کیا اور ان کو اوپر چڑھنے سے روکا اور جو وہاں چڑھ گئے تھے ان کو وہاں سے اترنے پر مجبور کر دیا، ذکرہ فی السیر۔

دوسرے یہ کہ جنگ اُحد سے واپسی کے وقت ابوسفیان کہنے لگا کہ "اے ہبل! تیرا نام بلند ہو" تو حضور علیہ السلام کے ارشاد پر حضرت عمرؓ نے اسلامی جوش کے ساتھ بلند آواز سے اعلاءِ کلمۃ اللہ کیا اور کہا "اللہ اعلیٰ واجل" کہ خدا ہی سب سے زیادہ بلند و برتر ہے، تیسرے یہ کہ ابوسفیان نے حضور علیہ السلام اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کو پکارا[1] جس سے معلوم ہوا کہ کفار بھی ان دونوں کے بعد آپ ہی کو مسلمانوں کا سب سے بڑا فرد سمجھتے تھے، ابوسفیان نے جاتے وقت یہ بھی کہا کہ چلو برابری ہوگئی، بدر میں ہمارا نقصان زیادہ ہوا تھا، اب تمہارا زیادہ ہوگیا، اس پر حضرت عمرؓ نے ہی جواب دیا کہ برابری کیسی؟ ہمارے مقتولین تو جنت میں جاتے ہیں، اور تمہارے جہنم میں،

تمام سوال و جواب کے بعد ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کو اپنے پاس نیچے بلایا، حضور علیہ السلام نے اجازت دی کہ جا کر سنو، کیا کہتا ہے، حضرت عمرؓ گئے تو کہنے لگا، ہمارا آج کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہم نے محمد کو قتل کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا، اے دشمن خدا تو جھوٹ کہتا ہے وہ تو تیری ساری باتیں سن رہے ہیں اور ہم میں موجود ہیں، ابوسفیان نے کہا، ہم تو اسی خیال میں تھے لیکن تم میرے نزدیک ابن قمیہ سے زیادہ صادق القول ہو، جس نے کہا تھا کہ میں نے محمد کو قتل کر دیا ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۷۹)

غزوۂ خندق میں بھی حضرت عمرؓ نے اہم خدمات انجام دیں، اول یہ کہ حضور علیہ السلام نے آپ کو اپنی محافظت کے لئے مقرر کیا تھا اور جس جانب سے آپ کو محافظت کے لئے مقرر کیا تھا، اس جگہ بطور یادگار ایک مسجد بھی بن گئی تھی، جو اب تک موجود ہے دوم یہ کہ حضرت عمرؓ و حضرت زبیرؓ نے ایک روز جماعتِ کفار پر حملہ کیا، یہاں تک کہ ان کو منتشر و پریشان کر دیا، سوم یہ کہ بوجہ مشغولیت حضرت عمرؓ کی نمازِ عصر فوت ہوگئی جس کا ان کو بہت زیادہ افسوس ہوا تو حضور علیہ السلام نے ازرہِ شفقت اپنے آپ کو بھی حضرت عمرؓ کے ساتھ محسوب کیا اور اس طرح ان کے تاسف کی مکافات کی بخاری میں یہ واقعہ ہے (۲/۸۰)

غزوۂ بنی المصطلق میں مقدمۃ الجیش پر حضرت عمرؓ ہی تھے، اور آپ نے کفار کے ایک جاسوس کو پکڑ کر حالات معلوم کرنے کے بعد قتل کر دیا تھا، جس سے کفار کے دلوں پر رعب بیٹھ گیا۔

غزوۂ حدیبیہ میں صلح نامہ کے وقت حضرت عمرؓ کی اسلامی حمیت و غیرت خاص طور سے نمایاں ہوئی اور آیت کریمہ فانزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہ وعلی المومنین والزمھم کلمۃ التقویٰ آپ کے حق میں نازل ہوئی اور مراجعت، میں حب مدینہ طیبہ کے پاس پہنچ کر سورۂ فتح نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر سُنائی (۳/۸۱)

غزوۂ فتح مکہ میں بھی حضرت عمرؓ کو بہت سے فضائل حاصل ہوئے الخ (۲/۸۵)

غزوۂ حنین میں جب کچھ دیر کے لئے مسلمانوں کے لشکر میں انتشار و انہزام کی صورت پیش آئی، تو اس وقت جو ۱۰-۱۲ آدمی سرورِ دو عالم محمد ﷺ کے ارد گرد ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہے، ان میں حضرت ابوبکر و عمرؓ بھی تھے، پھر کچھ دیر کے بعد تو سارے ہی مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر کفار کے مقابلہ میں ڈٹ گئے تھے (فتح الباری ۸/۳۱)

---

[1] شرح المواہب ۲/۳۶ میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب دونوں فریق میدانِ جنگ سے ہٹ گئے، تو جاتے ہوئے ابوسفیان نے مسلمانوں کو للکار کر کہا:۔ کیا تم لوگوں میں محمد موجود ہیں؟ حضور علیہ السلام نے جواب دینے سے روک دیا، تین مرتبہ اس نے یہی پوچھا اور مسلمان خاموش رہے پھر بولا، کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ (یعنی حضرت ابوبکرؓ) اس کو بھی تین بار کہا، اور حضور علیہ السلام نے اس کے جواب سے بھی روک دیا، پھر بولا، کیا تم میں ابن الخطاب ہیں؟ یہ بھی تین بار سوال کیا، اور جواب نہ پا کر گھوڑے پر سواری ہی کی حالت میں اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا، دیکھو! یہ سب تو مارے جا چکے ہیں، اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے یہ سن کر حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے اور حضور علیہ السلام سے اجازت لے کر جواب دیا کہ اے خدا کے دشمن! تو نے جھوٹ کہا جن کا تو نے ذکر کیا ہے وہ سب زندہ موجود ہیں، اور تجھے آئندہ بھی سبق دینے کے لئے باقی ہیں حافظؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے حضرت ابوبکر و عمرؓ کا جو مرتبہ اور خاص مقام حضور علیہ السلام کی نظر میں تھا وہ معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دشمنانِ اسلام کی نظر میں بھی ان دونوں کا ہی مقام سب سے بلند تھا اور وہ جانتے تھے کہ اسلام کا قیام اور ترقی وغیرہ ان دونوں سے وابستہ ہے، اسی لئے ابوسفیان نے ان تینوں کے علاوہ کسی کے بارے میں سوال نہیں کیا (۲/۳۷)

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا:۔غزوۂ حنین میں بھی حضرت عمرؓ کو بہت سے فضائل نصیب ہوئے، جن میں سے یہ بھی ہے کہ روایاتِ مہاجرین میں سے ایک جھنڈا آپ کو بھی حضورِ اکرم ﷺ نے عنایت فرمایا تھا۔(ازالۃ الخفاء ۸۶؍۲)

حضرت عمرؓ کا جامع کمالات ہونا

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا:۔حضرت عمرؓ کی مثال ایک ایسے عالیشان محل کی ہے جس کے بہت سے دروازے ہوں اور ہر دروازے پر ایک صاحبِ کمال بیٹھا ہو، مثلاً ایک پر اسکندر اور ذوالقرنین جیسے بیٹھے ملک گیری، جہاں بانی، اجتماعِ لشکر، اور ہزیمتِ اعداء اور سطوت وجبروت وغیرہ قائم کرنے کا درس دے رہے ہوں دوسرے پر مہربانی ونرمی، رعیت پروری، عدل وانصاف وغیرہ کا سبق نوشیرواں عادل جیسے دے رہے ہوں، تیسرے پر علم فتاویٰ واحکام کی رہنمائی کے لئے امام اعظم ابوحنیفہ یا امام مالکؒ بیٹھے ہوں، چوتھے پر مرشدِ کامل مثل سیدنا عبدالقادرؒ یا خواجہ بہاؤالدینؒ ہوں، پانچویں پر کوئی محدث مثل ابوہریرہؓ یا ابن عمرؓ ہو، چھٹے پر قاری ہم پلہ نافع وعاصم ہوں، ساتویں پر حکیم مثل جلال الدین رومیؒ یا شیخ فریدالدین عطارؒ ہوں، اور لوگ اس محل عالیشان کے چاروں طرف جمع ہوں، اور ہر حاجت مند اپنی حاجت اس کے صاحبِ فن سے طلب کرتا اور کامیاب ہوتا ہو، نبوت ورسالت کے مرتبہ عالیہ کے بعد اس فضیلت سے زیادہ اور کون سی فضیلت ہوسکتی ہے؟ الخ (ازالۃ الخفاء ۲۹؍۲/۴)

حضرت عمر کا انبیاء علیہم السلام سے اشبہ ہونا

آنحضرت ﷺ نے اس امر کی بھی خبر دی کہ حضرت عمر فاروقؓ استعدادِ نبوت اور قوتِ علمیہ وعملیہ دونوں رکھتے تھے، حدیثِ نبوی سے قوتِ علمیہ کا ثبوت اللہ تعالیٰ کا ان کی زبان پر نطق کرنا، اور ان کا محدث ہونا ہے اور خواب میں دودھ پینا اور آپ کی رائے کا وحی سے موافق ہونا ہے وغیرہ وغیرہ۔

قوتِ عملیہ کا ثبوت، شیطان کا حضرت عمرؓ کے سایہ سے بھاگنا، رؤیائے قمیص میں حضور علیہ السلام کا حضرت عمرؓ کو اتنی بڑی قمیص پہنے دیکھنا جو چلتے وقت زمین پر گھسٹتی تھی، یہ خصوصیت تلو وحی کی ہے، پس جب نبوت ختم ہوگئی تو ضروری ہے کہ ایسا شخص خلیفہ ہو جو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو، نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ عمر سے بہتر شخص پر آفتاب نے طلوع نہیں کیا، لہٰذا ضروری تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کسی نہ کسی وقت بہترین شخص اور خلیفہ وقت ہوتے، اور حضور علیہ السلام نے آپ کے لئے دعا فرمائی تھی "عش حميد ادمت شهيدا" اگر خدانخواستہ حضرت عمرؓ غاصب، جابر وظالم ہوتے تو یہ دعا کیونکر صحیح ہوتی (ازالۃ الخفاء ۴۸؍۱/۵)

معیت ورفاقت نبویہ

بخاری ومسلم میں حدیث ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے جنازے پر آکر حضرت علیؓ نے ان کو خطاب کر کے فرمایا:۔خدا آپ پر رحم کرے، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دونوں صاحبوں کے ساتھ کرے گا کیونکہ میں نے حضورِ اکرم ﷺ کو بہ کثرت یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں اور ابوبکر وعمرؓ اس طرح تھے، میں نے اور ابوبکر وعمرؓ نے فلاں کام کیا، اور ابوبکر وعمرؓ فلاں جگہ کے لئے ساتھ گئے، میں اور ابوبکر وعمرؓ فلاں جگہ داخل ہوئے، میں اور ابوبکر وعمرؓ فلاں جگہ سے باہر نکلے، (مشکوٰۃ ۵۵۹)

بیعت رضوان کے وقت حضرتِ عمرؓ کی معیت

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آں حضرت ﷺ کا اخذِ بیعت کے وقت حضرت عمرؓ کو منتخب کرنا یہ بھی بہت بڑی دلیل آپ کی فضیلتِ عظیمہ کی ہے (ازالۃ ۹۵؍۱/۵)

حافظ ابن کثیرؒ نے مسلم شریف کی روایت نقل کی کہ حدیبیہ کے مقام پر جس وقت چودہ سو صحابہ کرام سے کیکر کے درخت کے نیچے بیعتِ رضوان جہاد، عدم فرار اور موت پر لی گئی تو حضرت عمرؓ نبی اکرم ﷺ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے، (ابن کثیر ۱۸۷/۱) اور نووی شرح مسلم میں یہ حدیث ۱۲۹/۲ پر ہے (دیکھو باب استحباب مبایعۃ الامام الجیش عند ارادۃ القتال)

استعدادِ منصبِ نبوت

ترمذی شریف میں حدیث ہے کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوسکتا تو عمر بن الخطاب ہوتے، محدثِ کبیر ملا علی قاریؒ نے لکھا کہ یہ باب عدالت وسیاست وغیرہ کے لحاظ سے ہے، میزان میں اہل حدیث سے اس کی تضعیف منقول ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اس کی تقویت حدیثِ الجامع سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ عمرؓ سے بہتر کسی شخص پر سورج طلوع نہیں ہوا (رواہ الترمذی والحاکم فی مستدرکہ عن ابی بکر مرفوعاً) اور بغوی نے فضائل میں روایت کی کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت ابوسفیانؓ کی بیٹی کو پیغام نکاح دیا تو صحابہ نے کہا کہ یہ لوگ اس رشتہ کو قبول کریں تو بہتر ہے کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا "مدینہ کی دونوں وادیوں میں عمر سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے" حدیث لو کان بعدی نبی لکان عمر کو ابن جوزی نے بھی نقل کیا، امام احمد وحاکم نے اپنی صحیح میں اور طبرانی نے بھی روایت کیا، نیز بعض طرق میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں۔ لولم ابعث لبعثت یاعمر (مرقاۃ ۵۳۹/۵)

حضرت عمرؓ وامرھم شوری بینھم کے مصداق

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا:۔ سورۂ شوریٰ کی آیت والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوۃ میں اشارہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف ہے کہ آپ کا مشہور وصف تصدیق تسلیم وانقیاد اور اقامتِ صلوٰات میں بلند پایہ تھا، اسی لئے حضور علیہ السلام کی نیابتِ امامت کا شرف حاصل کیا اور دوسرے جملہ امرھم شوری بینھم سے اشارہ حضرت عمرؓ کی طرف ہے کہ آپ کا مشہور وصف شوریٰ تھا آپ کے پورے زمانہ خلافت میں کوئی امر بدوں مشورۂ علماءِ صحابہ نافذ نہیں کیا جاتا تھا، اسی لئے ملّتِ اسلامیہ کے سب سے بڑے اجماعی مسائل وہ ہیں جن پر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اجماع ہو چکا ہے، اور تیسرے جملہ ومما رزقناھم ینفقون سے اشارہ حضرت عثمانؓ کی طرف ہے اور چوتھا جملہ والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون حضرت علیؓ پر منطبق ہوتا ہے کیونکہ آپ کے عہد خلافت میں بغاوت وقتال ہوا ہے آگے پانچویں جملہ وجزاء سیئۃ میں حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی اور چھٹے جملہ ولمن انتصر بعد ظلم سے اشارہ خلافتِ معاویہؓ کی طرف ہے، ساتویں جملہ انما السبیل الخ سے اشارہ جوانانِ بنی امیہ کی طرف ہے، جن کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری امت کی تباہی قریش کے چند جوانوں کے ہاتھ سے ہوگی، پھر آٹھویں جملہ ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور سے اشارہ علماءِ اخیار کی طرف ہے، جن کے رئیس وسر دفتر حضرت علی بن حسین تھے، آپ نے اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ حضور اکرم ﷺ نے خلیفہ وقت پر تلوار اُٹھانے کو منع فرمایا ہے، سکوت وخاموشی اختیار کی اور باوجود کراہت کے اطاعت قبول کی (ازالۃ الخفاء ۴۶۹/۱)

حضور علیہ السلام کا مشورۂ شیخین کو قبول کرنا

آں حضرت ﷺ نے فرمایا:۔ جس مشورہ میں تم دونوں جمع ہو جاتے ہو، میں تمہاری رائے کے خلاف نہیں کرتا (رواہ احمد) اور مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کیا آپ نے ابوہریرہؓ کو اپنی نشانی نعلین شریفین دے کر یہ اعلان کرنے کو بھیجا ہے کہ جو بھی دل سے توحید ورسالت کی شہادت دیتا ہو، اس کو وہ جنت کی بشارت دیدیں؟ حضور نے فرمایا ہاں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول

اللہ! ایسا نہ کیجئے ورنہ لوگ آپ کے اس فرمان پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ دیں گے، اس لئے آپ انھیں عمل کرنے دیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ اچھا! انھیں عمل کرنے دو۔ (ازالہ ۱/۵۹۴)

حضرت عمرؓ کا اجدواجود ہونا

اسلم مولی عمرؓ سے حضرت ابن عمرؓ نے اپنے والد حضرت عمرؓ کے حالات معلوم کئے تو انہوں نے کچھ حالات بیان کئے جوان کو خاص طور سے معلوم تھے، اس پر حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ سے زیادہ دین کے معاملہ میں عملی کوشش کرنے والا اور علم ویقین کے منازل طے کرنے میں ان سے بڑا شہسوار نہیں دیکھا، ابتداء سے آخر عمر تک ان کا یہی حال رہا۔ (بخاری ۵۲۱)

مرقاۃ ۵/۵۴۳ میں اجود کی تشریح احسن فی طلب الیقین سے کی ہے اور فتح الباری وعمدہ میں اموال کی سخاوت لکھی ہے حضرت عمرؓ نے جس طرح اموال کو عام لوگوں پر تقسیم کیا اور ساری قلمرو کے غربا مساکین اور حاجت مندوں کی بلا تخصیص مذہب وملت غنی ومستغنی بنانے کی کوشش کی اور خود ساری لذات وراحتوں سے کنارہ کش رہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

حکم اقتداءِ ابی بکر وعمرؓ

حضور علیہ السلام نے ایک روز ارشاد فرمایا:۔ مجھے نہیں معلوم کتنے دن اور تم میں رہوں گا لہٰذا تم میرے بعد کے اصحاب ابوبکر وعمر کی پیروی کرنا (ترمذی) صاحب مرقاۃ نے لکھا کہ اس حدیث کی روایت امام احمد وابن ماجہ نے بھی کی ہے اور حافظ حدیث ابوالنصر القصار نے یہ زیادتی بھی روایت کی ہے کہ یہ دونوں خدائے تعالیٰ کی طرف سے دراز کی ہوئی رسی ہیں، جوان دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لے گا، وہ ایسا ہے مضبوط ومستحکم سہارا تھام لے گا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

(گویا لااکراہ فی الدین قدتبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لہا" کی طرف اشارہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم!) (مرقاۃ ۵/۵۳۹)

حضرت عمرؓ کا لقب فاروق ہونا

حضرت عمرؓ کا خود بیان ہے کہ میرا جب شرح صدر ہوا اور اسلام کی طرف کشش ہوئی تو جس ذات سے مجھے سب سے زیادہ بغض وعناد تھا وہ میرے لئے دنیا ومافیہا سب سے زیادہ پیاری ومحبوب ہوگئی، یعنی ذات اقدس نبوی علے صاحبہا الف الف تحیات وتسلیمات، چنانچہ میں بے تاب ہوکر فوراً حضور کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے دار ارقم سے باہر آکر میرے کپڑوں کو پکڑا اور مجھے ایک جھٹکا دیا، جس کے بعد میں بے صبر ہوکر اپنے گھٹنوں کے بل گر گیا آپ نے فرمایا:۔ عمر! کیا تم اپنی روش سے باز نہیں آئے؟ میں نے فوراً ہی کلمہ شہادت پڑھا، جس پر سارے مجمع نے بلند آواز سے تکبیر کہی، جس کی آواز مسجد کے لوگوں نے سُنی، پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اپنی زندگی میں بھی اور مرتے وقت بھی؟ آپ نے فرمایا، کیوں نہیں، خدا کی قسم تم حق پر ہو زندگی میں بھی اور مرتے دم بھی میں نے کہا پھر چھپنے کی کیا ضرورت؟ (یعنی جبکہ ہم مریں گے تب بھی حق پر ہی مریں گے، آپ کو مبعوث کرنے والے کی قسم ہم تو ضرور باہر نکل کر اسلام کو ظاہر کریں گے، اس پر حضور ﷺ نے ہماری دو ٹولی بنادیں، ایک میں حضرت حمزہؓ دوسری میں میں تھا، اور اسی دن حضور نے مجھے "فاروق" کا لقب دیا کہ میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق وباطل کو الگ الگ کیا،

دوسرا قصہ یہ ہے کہ ایک منافق مسلمان کا ایک یہودی سے جھگڑا ہوا، یہودی نے کہا کہ میں اپنا فیصلہ نبی اکرم پر رکھتا ہوں، جو بھی وہ

فیصلہ کریں، منافق نے کہا میں کعب بن الاشرف پر رکھتا ہوں، پھر وہ دونوں حضور علیہ السلام کو حاکم بنانے پر راضی ہوگئے، اور آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا، منافق اس فیصلے سے راضی نہ ہوا اور کہا کہ ہم تو عمر کو حَکَم بناتے ہیں، یہودی نے سارا قصہ حضرت عمرؓ کو سنایا کہ اس طرح بعد کو یہ شخص نبی اکرم کو حکم بنانے پر رضا مند ہوا تھا مگر اب ان کے فیصلہ کو رد کر رہا ہے اور آپ کو حکم بناتا ہے حضرت عمرؓ نے اس منافق سے پوچھا کیا ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا اچھا ٹھیرو! میں ابھی آتا ہوں اور گھر میں سے تلوار لا کر اس منافق کو قتل کر دیا، اور فرمایا کہ میرا فیصلہ تو ایسے شخص کے لئے یہی ہے جو خدا اور اس کے رسول کا فیصلہ قبول نہ کرے، حضور اکرم ﷺ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا، میرا خیال نہ تھا کہ عمر ایک مومن کے قتل پر جراءت کریں گے، اس پر یہ آیت اتری "الم تـرالي الذين يزعمون انهم آمنوا بما انزل اليك وما انـزل مـن قبـلك يريدون ان يتحا كموا الي الطاغوت" اور پھر آپ نے اس شخص کے قصاص کا حکم ختم کر کے حضرت عمرؓ کو اس کے ظلماً قتل کے الزام سے بری قرار دیا اور اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا، لہٰذا ان کا نام "فاروق" رکھا گیا۔ (مرقاۃ ۵۳۸/۵ و ۵۳۹/۵)

جنگ بدر میں مشرک ماموں کو قتل کرنا

حضرت عمرؓ کی اسلامی غیرت اور پختگی ایمان کا یہ بھی ایک بڑا ثبوت ہے کہ آپ نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے حقیقی ماموں کی قرابت کا بھی خیال نہیں کیا، اور جب وہ مقابلہ پر آگئے، تو ان کو قتل کر دیا، ان کا نام عاصی بن ہاشم بن مغیرہ تھا، سیرۃ النبی ۳۲۹/۱ میں ان کا نام عاص بن ہشام غلط درج ہوا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے نانا کا نام ہاشم بن مغیرہ تھا، اور آپ کی والدہ کا نام حنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ تھا، اس کو بھی حنتمہ بنت ہشام ابن مغیرہ غلط لکھتے ہیں، ہاشم بن مغیرہ اور ہشام بن مغیرہ دونوں حقیقی بھائی تھے، لہٰذا حضرت عمرؓ کی والدہ حنتمہ ابوجہل کی چچیری بہن تھیں، حقیقی بہن نہ تھیں، علامہ محدث ابن عبدالبرؒ نے لکھا کہ جس نے ام عمر کا نام حنتمہ بنت ہشام کہا، غلطی کی ہے۔ (استیعاب ۴۱۵/۲)

دوسری طرف یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ نے خود فرمایا کہ میں نے بدر میں اپنے خال (ماموں) کو قتل کیا تھا، ملاحظہ ہو الروض الانف ۱۰۳/۲ لہٰذا آپ کے مقتول حقیقی ماموں عاصی بن ہاشم بن مغیرہ تھے، جو آپ کی والدہ کے حقیقی بھائی تھے، لہٰذا سیرت ابن ہشام ۱۰۳/۲ اور الروض ۱۰۳/۲ اور تاریخ ابن خلدون ۸۶/۱ میں مقتولین بدر کے ذیل میں عاصی بن ہشام کا نام درست نہیں ہے، اور الروض ۱۰۴/۲ میں تو خود بھی ہاشم کو حضرت عمرؓ کا نانا لکھا ہے، جب ہاشم نانا تھے تو ان ہی کا بیٹا تو حضرت عمرؓ کا ماموں ہو سکتا ہے، اس طرح الروض کی ہی دونوں عبارتوں میں تعارض موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

شائع شدہ اہم کتب سیر کا ذکر

"سیرۃ کبریٰ" تالیف علامہ رفیق دلاوری میں اس واقعہ کی تصحیح کی طرف توجہ کی گئی ہے، اور موجودہ کتب سیرت میں وہ نہایت عمدہ اور قابل قدر ہے، افسوس ہے کہ اس کی تالیف ناقص رہ گئی رحمۃ للعالمین بھی بعض اعتبارات سے عمدہ اور قابل قدر ہے مگر بعض اہم امور کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً غزوات کی تفصیل وغیرہ۔

سیرۃ النبی کے اندر خلاف توقع بہت سی جگہ تحقیق کا حق ادا نہیں کیا گیا، اور مضامین کی غلطیاں بھی ہیں، کاش! اس کی نظر ثانی حضرت سیّد صاحب آخر عمر میں کر لیتے جبکہ انہوں نے اس کے بعض مضامین سے رجوع بھی کر لیا تھا، اور ان کی زندگی میں بڑا انقلاب آچکا تھا۔

یہ رجوع کی تحریر ابتداءِ محرم ۶۲ھ کی ہی جو معارف جنوری ۴۳ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کا ذکر انوار الباری میں مع اقتباس عبارت رجوع کے پہلے ہو چکا ہے، اس سے تقریباً ایک سال دس ماہ بعد والے ایک مکتوب (مورخہ کیم ذی قعدہ ۶۳ھ کا اقتباس "معارف

القرآن" مؤلف محترم مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی دام فیضہم میں شائع ہوا، وہ یہ ہے:۔

حضرت سیّد صاحبؒ کے ارشادات

دوسری چیز یہ ہے کہ جمہور اسلام جس مسئلہ پر اعتقادی وعملی طور پر متفق ہوں اس کو چھوڑ کر تحقیق کی نئی راہ نہ اختیار کی جائے، یہ طریق تواتر وتوارث کی بیخ کنی کے مرادف ہے، اس گناہ کا مرتکب کبھی میں خود ہو چکا ہوں، اور اس کی اعتقادی وعملی سزا بھگت چکا ہوں، اس لئے دل سے چاہتا ہوں کہ اب میرے عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی اس راہ سے نہ نکلے تا کہ وہ اُس سزا سے محفوظ رہے جوان سے پہلوں کو مل چکی ہے،

مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک فقرہ اس باب میں بہت خوب ہے، انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "کبھی حضرت شاہ ولی اللہ اور سرسید احمد خاں دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں مگر ایک سے ایمان پرورش پاتا ہے اور ایک سے کفر" اُس زمانہ کے اکثر لکھنے والے اس نکتہ سے تغافل برت رہے ہیں اور اس لئے خوف لگا رہتا ہے کہ ان سے ایمان کی بجائے کفر کو نشوونما کا موقع نہ ملے، سید سلیمان ندوی، یکم ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ (بہ شکریہ بینات ماہ ستمبر ۱۹۶۸ء کراچی)!

یاد آیا کہ حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں بزمانہ قیام کراچی وفات سے صرف ایک ہفتہ پیشتر راقم الحروف حاضر ہوا تھا، غالباً حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری دام فیضہم بھی ساتھ تھے، اور باتوں کے ساتھ احقر نے عرض کیا کہ آپ ندوہ میں جدید وقدیم کی آمیزش کا تجربہ کر چکے ہیں، اس پر فوراً برجستہ فرمایا کہ "جی ہاں! کیا ہے مگر ہر قدم پل صراط پر تھا" سبحان اللہ! ایک جملہ میں وہ کچھ کہہ دیا جو دفتروں میں نہ سماتا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ!

فوٹو کے جواز، عدم خلود جہنم کے عقیدہ متعدد چیزوں سے رجوع فرمالیا تھا، جو ۱۹۴۳ء کے معارف میں شائع ہوا، مگر بعض حضرات اب تک ان کے سابقہ مضامین شائع کررہے ہیں، اور ان کو شاید یہ علم بھی نہیں کہ سید صاحب ان کے بعض حصوں سے رجوع کر چکے ہیں، ابھی ۱۲ جون ۱۹۷۰ء کا ہفتہ روزہ "الجمعیۃ" دہلی دیکھا، جس میں تصاویر وفوٹو کے متعلق سید صاحبؒ کا طویل مضمون معارف ۲۷ء سے نقل کر کے شائع کیا ہے۔

اس دور کے تجدد پسند اہل قلم حضرات کو حضرت سیّد صاحب نور اللہ مرقدہ کی نصیحت مذکورہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے، صرف لکھنا اور بے سوچے سمجھے لکھتے چلے جانا، خواہ اس سے علوم سلف وخلف کے قلعے کے قلعے مسمار ہوتے چلے جائیں کوئی کمال نہیں ہے، واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

باب فتنہ کا ٹوٹنا! اس بارے میں حدیث بخاری پانچ جگہ آئی ہے باب الصلوٰۃ کفارۃ ۷۵ میں، پھر باب الصدقۃ تکفر الخطیئۃ ۱۹۳ میں، پھر باب الصوم کفارۃ ۲۵۴ میں پھر علامات النبوۃ ۵۰۷ میں، پھر باب الفتنۃ تموج کموج البحر ۱۰۵۱ میں اور الفاظ کا معمولی فرق اجمال وتفصیل کا ہے، حضرت ابووائل حضرت حذیفہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک روز ہم سب حضرت عمرؓ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے دریافت فرمایا تم میں سے کس کو فتنہ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد یاد ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا مجھے یاد ہے آپ نے فرمایا کہ اچھا بتاؤ تم بہت جری ہو سناؤ کس طرح سے ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ جو فتنہ آدمی کو اس کے اہل خانہ، مال، اولاد اور پڑوسی کے بارے میں پیش آتا ہے، اس کا کفارہ نماز، صدقہ، صوم، اور امر بالمعروف ونہی المنکر سے ہو جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا میں تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھتا، بلکہ اس فتنہ کے بارے میں پوچھتا ہوں، جو سمندر کی موجوں کی طرح جوش مارے گا حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا یا امیر المومنین! آپ کو اس سے ڈرنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کے اور اس کے درمیان بند دروازہ ہے، آپ نے پوچھا وہ دروازہ کھلے گا یا ٹوٹے گا، عرض کیا ٹوٹے گا، آپ نے فرمایا پھر تو وہ بند نہ ہو سکے گا، ہم نے کہا ہاں! بیشک ایسا ہی

ہے، پھر ہم نے حضرتِ حذیفہؓ سے پوچھا کیا حضرت عمرؓ اس دروازہ کو جانتے تھے کہ کون ہے؟ کہا ہاں! وہ اس دروازہ کو اس طرح یقین کے ساتھ جانتے تھے، جس طرح وہ جانتے تھے کہ کل کے دن سے پہلے رات آئے گی، اور میں نے جو بات ان سے کہی وہ کسی شک و مغالطہ والی بات نہ تھی، راوی کہتے ہیں کہ پھر ہماری جراءت یہ نہ ہوئی کہ حضرتِ حذیفہؓ سے یہ بھی پوچھ لیں کہ دروازہ سے کیا مراد ہے؟ لہٰذا ہم نے مسروق کے ذریعہ دریافت کرایا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ حضرت عمرؓ ہیں۔

تشریح! حافظؒ نے لکھا کہ فتنہ سے مراد ان سب امور کے حقوق ادا کرنے کے اندر کوتاہی کے ہیں جس کا کفارہ نماز وغیرہ دات کے ذریعہ ہو جاتا ہے کہ حسنات برائیوں کے وبال کو ختم کراتی رہتی ہیں پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان مذکورہ اعمال خیر میں سے ہر ایک اُن سب مذکورہ کوتاہیوں کا کفارہ کردے، یا ایک ایک چیز حسب ترتیب مذکورہ ایک ایک بُرائی کا کفارہ بنے، مثلاً نماز خانگی فتنہ کا کفارہ ہو، صدقہ مال کے فتنہ کا، روزہ اولاد کے فتنہ کا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فتنہ جار کا اور صغیرہ گناہوں کا کفارہ تو حسنات سے ہو ہی جاتا ہے، کبائر کے لئے البتہ توبہ ضروری ہے، علامہ ابن المنیر نے کہا:۔ اہل کا فتنہ یہ ہے کہ تعدد کی صورت میں کسی بیوی کی طرف زیادہ میلان یا ترجیح کا سلوک، اور حقوقِ واجب کی ادائیگی میں کوتاہی وغیرہ، مال کا فتنہ یہ ہے کہ اس میں مشغول ہو کر اداءِ عبادت میں کوتاہی کردے، اولاد کا فتنہ یہ کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دے، پڑوس کا فتنہ یہ کہ اس کے مال و جاہ وغیرہ پر حسد کرے، یا وہ فقیر ہو تو اس کے مقابلہ میں فخر کرے یا اس کی ضرورتوں کی خبر گیری نہ کرے وغیرہ، یہ بطور مثال ہے ورنہ اسباب فتنہ ان سب امور سے متعلق ناقابل شمار ہیں اور اسی طرح مکفرات بھی صرف یہی مذکور نہیں بلکہ دوسرے، بہت زیادہ ہیں۔

تموج پر حافظ نے لکھا:۔ اس مثال سے مراد صرف کثرت فتن نہیں بلکہ سخت ہیجان و اضطراب اور باہمی شدتِ مخاصمت و کثرتِ منازعت کی صورت اور اس کے نتائج باہم سب وشتم اور مار کاٹ کی صورتیں رونما ہونا ہیں، جس طرح سمندر کی موجیں ہیجان و طوفان کے وقت ایک دوسرے پر چڑھتی ہیں، اور باہم زیروزبر ہوتی ہیں۔

لا باس علیک منھا پر لکھا:۔ روایتِ ربعی میں یہ بھی زیادتی ہے کہ وہ فتنے دلوں پر اثر انداز ہوں گے، اور ان کو بگاڑنے کی صورت پیدا کریں گے، پھر جو قلب ان کا کوئی اثر نہ لے گا، اس پر سفید نکتہ لگے گا، یہاں تک کہ جتنے بھی فتنوں کی اس پر یورش زیادہ ہوگی وہ زیادہ ہی سفید ہوتا جائے گا، اور چکنے پتھر کی طرح کہ اس کو کسی فتنہ سے نقصان نہ ہوگا، اور جو قلب ان فتنوں سے دلچسپی لے گا اور ان کے رنگوں میں رنگا گیا، اس پر سیاہ نکتہ لگے گا، یہاں تک کہ وہ برابر اور زیادہ سیاہ ہی ہوتا جائے گا، اور اوندھے رکھے ہوئے پیالے کی طرح ہو جائے گا کہ کسی معروف اور بھلی بات کو بھلی نہ سمجھے گا اور نہ منکر اور بُری بات کو بُری خیال کرے گا، اس کے بعد میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ان فتنوں کے اور آپ کے درمیان تو مغلق دروازہ حائل ہے۔

ان بینک و بینھا بابا مغلقا پر لکھا:۔ یعنی ایسا بند دروازہ کہ! اس میں سے کوئی چیز آپ کی زندگی میں باہر نہیں آسکتی، ابن المنیرؒ نے کہا:۔ حضرت حذیفہؓ کے اثرِ مذکور سے معلوم ہوا کہ وہ حفاظتِ سر پر حریص تھے، اسی لئے حضرت عمرؓ کے سوال پر بھی صراحت سے اُن کا جواب نہیں دیا، صرف کنایہ و اشارہ پر اکتفا کیا، اور غالباً وہ ایسے امور میں اس کے لئے ماذون تھے، علامہ نوویؒ نے یہ بھی کہا کہ ممکن ہے حضرت حذیفہؓ یہ بھی جانتے ہوں کہ حضرت عمرؓ قتل کئے جائیں گے، لیکن انہوں نے آپ کے سامنے اس کا اظہار پسند نہ کیا ہوگا، کیونکہ حضرت عمرؓ خود بھی جانتے تھے کہ وہی باب ہیں، لہٰذا حضرت حذیفہؓ نے بلا تصریحِ قتل اتنی بات کہہ دی جس سے مقصد حاصل ہو گیا، لیکن ربعی کے طریق روایت سے اس کے خلاف بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاید حضرت حذیفہؓ نے موت سے کنایہ بہ لفظ فتح کیا ہو اور قتل سے بہ لفظِ کسر، اسی لئے روایتِ ربعی میں ہے، کہ حضرت عمرؓ بھی ان کی بات کو سمجھ گئے چنانچہ فرمایا ''کسر الا ابالک'' یعنی وہ دروازہ ٹوٹے گا؟! تیرا باپ نہ ہو، ناگواری

کے وقت یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔ اگر چہ ربعی کے باقی الفاظِ روایت سے وہی بات نکلتی ہے جو ہم نے دوسری روایات کی روشنی میں پہلے بیان کی ہے کیونکہ اس میں یہ بھی ہے:۔ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ وہ دروازہ ایک شخص ہے، جو قتل ہوگا یا اپنی طبعی موت سے مرے گا، پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ جملہ درحقیقت حضرت حذیفہؓ کی بات پر اور اپنے متعلق سمجھنے پر نہیں، بلکہ ان نصوصِ صریحہ کے باعث ہوگا، جن میں اس امت کے اندر فتنوں کے رونما ہونے اور آپس کے جھگڑوں اور نزاعات کے برپا ہونے کی خبر دی گئی ہے جو قیامت تک برابر پیش آتے رہیں گے، کتاب الاعتصام میں حدیث جابر بھی آنے والی ہے، جو او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض کی تفسیر ہے، پھر آخر میں حافظ نے لکھا:۔ معنی روایتِ حضرت حذیفہؓ کی تائید روایتِ حضرت ابوذرؓ سے بھی ہوتی ہے (رواہ الطبرانی باسناد ثقات) کہ وہ حضرت عمرؓ سے ملے تو آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دبایا، جس پر انہوں نے کہا کہ اے قفلِ فتنہ! میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے! اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کر کے لوگوں سے کہا تمہیں کسی فتنہ سے واسطہ نہ پڑے گا جب تک یہ تم میں ہیں، بزار کی روایت میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ نے حضرت عمرؓ کو یا غلق الفتنہ کہہ کر پکارا، تو آپ نے اس کا سبب پوچھا حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ آپ ایک دن ہمارے سامنے سے گزرے جبکہ ہم لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے، تو حضور نے فرمایا یہ غلق الفتنہ ہے، یہ جب تک تم میں رہیں گے تمہارے اور فتنہ کے درمیان سخت بند کیا ہوا دروازہ حائل رہے گا۔ (فتح ۶/۳۹۳)

قول عمر اذا کسر لا یغلق ابدا (حضرت عمرؓ کا فرمانا کہ جب دروازہ توڑا جائے گا تو پھر کبھی بند نہ ہو سکے گا، بخاری باب الفتن ۱۰۵۱) اور بخاری باب الصوم ۲۵۴ میں ابدا کی جگہ الی یوم القیامۃ ہے کہ قیامت تک اس دروازہ کے بند ہونے کی توقع نہیں، حافظؒ نے لکھا:۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات اس طرح سمجھی کہ توڑنا غلبہ سے ہوتا ہے، اور غلبہ فتنوں ہی کے اندر ہوا کرتا ہے، اور خبر نبوی سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ امت کے اندر جھگڑے ہوں گے، اور یہ بھی کہ ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، جیسا کہ شداد کی حدیث میں ہے کہ "میری امت میں جب تلوار چل پڑے گی تو پھر روزِ قیامت تک نہ رُکے گی" اس حدیث کی تخریج طبری نے کی ہے اور ابن حبان نے تصحیح کی ہے اور خطیب نے روایت کی کہ ایک روز حضرت عمرؓ (اپنی زوجہ مطہرہ) ام کلثوم بنت سیدنا علیؓ کے پاس گئے، دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: یہ یہودی (کعب الاحبار) آپ کو ابوابِ جہنم کا ایک باب بتلاتا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا ماشاء اللہ، پھر گھر سے نکل کر کعب بلوایا، وہ آئے اور کہا یا امیر المومنین! قسم بخدا ذی الحجہ کا مہینہ ختم نہ ہوگا کہ آپ جنت میں داخل ہو جائیں گے، آپ نے فرمایا یہ کیا کبھی جنت میں کہتے ہو کبھی جہنم میں؟! کعب نے کہا ہماری کتابِ الٰہی میں آپ کا ذکر ہے کہ آپ جہنم کے ایک دروازہ پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روکتے ہیں، لہٰذا جب آپ کی وفات ہو جائے گی تو پھر وہ اس میں داخل ہو جائیں گے" (فتح ۱۳/۴۸)

سریہ عمر بن الخطابؓ! آپ کے مناقب عالیہ میں سے یہ بھی ہے کہ سرایا نبویہ میں سے ایک سریہ آپ کے نام سے منسوب ہوا، جو تُربہ کی طرف ۷ھ میں گیا تھا، حضرت عمرؓ نے وہاں پہنچنے کے لئے عجیب طریقہ اختیار کیا کہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو آپ کا رعب اتنا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے بھاگ نکلے، اور حضرت عمرؓ ان کے مقام پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا (سیرۃ النبی ۱/۶۰۲)

رعب فاروقی اور صورت باطل سے بھی نفرت

ترمذی شریف میں ہے کہ حضور علیہ السلام کسی غزوہ سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے، تو ایک کالے رنگ والی جاریہ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے نذر مانی تھی آپ صحیح سلامت تشریف لائینگے تو میں آپ کے سامنے دف بجاؤں گی، اور گاؤں گی، آپ نے فرمایا اگر تم نے نذر مان لی تھی تو خیر پورا کرلو، ورنہ نہیں، اس پر وہ دف بجانے لگی، پھر حضرت ابوبکرؓ آگئے، تب بھی بجاتی رہی، حضرت علیؓ آئے، تب بھی بجاتی

رہی، پھر حضرت عثمانؓ آ گئے، تب بھی بجاتی رہی، ان کے بعد جب حضرت عمرؓ آئے تو اس نے آپ کے ڈر سے دف کو نیچے ڈال دیا اور اس پر بیٹھ گئی، حضور علیہ السلام نے یہ دیکھا تو فرمایا اے عمر! تم سے تو شیطان بھی ڈرتا ہے۔

علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ میرے نزدیک بہتر توجیہ اس کی یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے تو نذر کی وجہ سے اور بظاہر دوسری کسی خرابی نہ ہونے کے باعث روکنا ضروری نہ سمجھا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ایسی بات کو بھی پسند نہ کرتے تھے، جو طریق باطل سے ظاہری مماثلت و مشابہت رکھتی ہو اگرچہ وہ حق بھی ہو اور حدِ اباحت میں ہی ہو، اس توجیہ کی تائید اسود بن سریع کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ میں ایک دفعہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے حمدِ خداوندی میں کچھ شعر کہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ مدح کو پسند کرتے ہیں، اپنے اشعار سُناؤ، میں سُنانے لگا، اسی اثنا میں ایک شخص نے آنے کی اجازت چاہی، آپ نے اسکی وجہ سے مجھے خاموش کر دیا (جیسے بلی کو کچھ اشارہ ہش بش کر کے روک دیا کرتے ہیں) وہ شخص اندر آیا اور کچھ دیر بات کر کے واپس چلا گیا، میں نے اپنے اشعار پھر سُنانے شروع کر دیئے، وہ پھر آیا تو آپ نے مجھے پھر روک دیا، میں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون تھا جس کے لئے آپ نے مجھے روک دیا، آپ نے فرمایا یہ شخص باطل کو ناپسند کرتا ہے، یہ عمر بن الخطاب ہیں (اخرجہ احمد) حضور علیہ السلام نے اس کو باطل فرمایا، حالانکہ ان اشعار میں سب بات حق تھی اور حمد و مدحِ خداوندی تھی، اس لئے کہ وہ جنسِ باطل سے تھی کیونکہ شعر کی جنس تو ایک ہے (**وما علمناه الشعر وماینبغی له** اور **والشعر من مزامیر ابلیس** وغیرہ) اور اسی قبیل سے وہ قصہ بھی ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ کے لئے حریرہ پکایا اور آپ کے پاس لے کر گئی، تو اس وقت حضرت سودہ بھی موجود تھیں او. رسول اکرم ﷺ درمیان تھے، دوسری طرف وہ بیٹھی تھیں، ایک طرف میں تھی، میں نے ان سے بھی کہا کہ کھالو، انہوں نے انکار کیا تو میں نے کہا یا تو کھاؤ ورنہ میں تمہارے منہ پر مل دوں گی، انہوں نے پھر بھی انکار ہی کیا تو میں نے حریرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے منہ پر خوب لیپ ردیا، حضور علیہ السلام یہ ماجرا دیکھ کر ہنسے، اور پھر حضرت سودہؓ کے لئے اچھی طرح موقع دینے کے لئے اپنی ران مبارک پشت کر کے ان سے فرمایا، تم بھی بدلہ لو اور ان کے منہ پر ملو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس پر بھی حضور ﷺ ہنسے، اتنے میں حضرت عمرؓ آئے اور یا عبداللہ یا عبداللہ پکارا، حضور نے خیال فرمایا کہ وہ اندر آئیں گے، تو ہم دونوں سے فرمایا، اٹھو! اپنے اپنے منہ دھولو، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، میں ہمیشہ حضرت عمرؓ سے ڈرتی رہی، کیونکہ حضور علیہ السلام کو ان کا لحاظ کرتے دیکھا (مرقاۃ ۵۴۰/۵)

شیاطینِ جن وانس کا حضرت عمرؓ سے ڈرنا

ترمذی شریف حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور علیہ السلام گھر میں تشریف رکھتے تھے، ہم نے باہر شور اور بچوں کی آوازیں سُنیں، آپ باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک حبشی عورت ناچ رہی ہے اور اس کے چاروں طرف بچے جمع ہیں. آپ نے فرمایا عائشہ آؤ، دیکھو! میں گئی اور آپ کے مونڈھے اور سر مبارک کے درمیان اپنی ٹھوڑی رکھ کر اس کا تماشہ دیکھنے لگی، آپ نے کئی بار پوچھا کیا جی نہیں بھرا؟ اور میں ہر دفعہ نہیں کہتی رہی، تاکہ دیکھوں حضور کے دل میں میری کتنی قدر ہے، اتنے میں حضرت عمرؓ آ گئے، اور سب لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ شیاطینِ جن وانس سب ہی عمر سے بھاگتے ہیں اس وقت میں بھی گھر میں لوٹ آئی۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ اس حدیث سے حضور علیہ السلام کی غیر معمولی اخلاقی عظمت اور غلبہ صفتِ جمال کا ثبوت ملا، اور ساتھ ہی حضرت عمرؓ پر غلبہ صفتِ جلال کا ہونا معلوم ہوا۔

نیز ابن السمان نے الموافقہ میں حضرت عائشہؓ سے ایک روایت دوسری بھی نقل کی ہے (جو ان دونوں سابقہ روایات کی طرح

ہے) کہ ایک انصاری عورت آئی اور کہا میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر حضور علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوں گی تو آپ کے سر پر دف بجاؤں گی، میں نے حضور علیہ السلام سے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا اس سے کہہ دو کہ اپنی (نذر یا قسم پوری کرلے) وہ دف لے کر حضور علیہ السلام کے سر پر کھڑی ہوگئی، ابھی دو تین بار ہی دف پر چوٹ لگائی تھی کہ حضرت عمرؓ نے اندر آنے کی اجازت چاہی، تو دف تو اس کے ہاتھ سے گر گیا، اور خود حضرت عائشہؓ کے پاس پردہ میں سرک گئی، انہوں نے پوچھا کیا ہوا؟ کہا حضرت عمرؓ کی آواز سن کر ڈر گئی، اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا، شیطان تو عمرؓ کی آہٹ سے بھی بھاگتا ہے۔ (مرقاۃ ۵۴۱/۵)

شیطان کا حضرت عمرؓ کے راستہ سے کترانا

بخاری و مسلم نسائی وغیرہ میں ہے کہ ایک روز حضرت عمرؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں آنے کی اجازت چاہی تو اس وقت آپ کے پاس قریش کی عورتیں بیٹھی تھیں، جو آپ سے باتیں کر رہی تھیں، اور نفقہ میں اضافہ کا مطالبہ کر رہی تھیں، ان کی آوازیں بلند تھیں، حضرت عمرؓ کی آواز سن کر جلد ہی سب پردہ کے پیچھے چلی گئیں، حضرت عمرؓ اندر پہنچے تو حضور علیہ السلام ہنسنے لگے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، کیا بات ہوئی؟ آپ نے فرمایا: مجھے ان سب پر ہنسی آگئی کہ ابھی تو سب میرے پاس جمع تھیں، تمہاری آواز سنتے ہی پردہ کے پیچھے بھاگ گئیں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ سے تو ان کو اور بھی زیادہ ڈرنا چاہیے، پھر حضرت عمرؓ نے ان سب جمع ہونے والیوں سے خطاب کیا کہ اے اپنی جانوں کی دشمنو! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو اور حضور ﷺ سے نہیں ڈرتیں، انہوں نے کہا، ہاں! یہی بات ہے، کیونکہ تم رسول اکرم ﷺ سے زیادہ سخت اور درشت مزاج ہو، حضور علیہ السلام نے فرمایا اے عمر! اور کہو! یعنی ان کی بات کا خیال نہ کرو اور جو کچھ بھی اس موقع کے مناسب مزید باتیں کہنی ہیں وہ کہہ دو، تا کہ ان کی اصلاح ہو وغیرہ) قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ شیطان جس راستہ پر تمہیں چلتا دیکھتا ہے، ضرور اس سے کترا کر دوسرے راستے پر چلا جاتا ہے۔

محدث علامہ قسطلانیؒ (شارحِ بخاری) نے لکھا کہ وہ جمع ہونے والی عورتیں آپ کی ازواجِ مطہرات حضرت عائشہؓ، حفصہ، ام سلمہ، زینب بنت جحش وغیرہ تھیں، علامہ قسطلانیؒ (حافظ ابن حجر) نے لکھا کہ وہ ازواجِ مطہرات تھیں اور احتمال ہے کہ دوسری قریشی عورتیں بھی ساتھ ہوں (جو اپنے معاملات وشکایات پیش کرنے آئی ہوں گی) لیکن زیادہ نفقہ کا مطالبہ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ صرف ازواجِ مطہرات تھیں، علامہ داؤدی نے کہا کہ یستکثرن کا مطلب بڑھ چڑھ کر باتیں کرنا ہے (جو شکوے شکایات کے موقع پر عورتوں کی عادت ہے) مگر یہ احتمال روایتِ مسلم کے خلاف ہوگا، جس میں صراحت ہے کہ وہ نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کر رہی تھیں، لہٰذا استکثار کا مطلب متعین ہوگیا۔

علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا کہ یکلمنه ویستکثرنه قرینہ اسی امر کا ہے کہ وہ صرف ازواجِ مطہرات سے تھیں، جو حضور علیہ السلام سے بے تکلف تھیں، اور اسی وقت (عارضی طور[1] سے) جذبات سے مغلوب ہو کر آپ کے بلند ترین مقام نبوت ورسالت کے پاس ولحاظ سے غافل ہو کر صرف اپنے مطالبہ کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں، آوازیں بلند ہوئیں، اس پر اشکال ہوا ہے کہ قرآن مجید میں تو مسلمانوں کو حضور علیہ

---

[1] اس قسم کے چند واقعات اور بھی ازواجِ مطہرات کی زندگی میں ملتے ہیں، جو بشری مقتضیات کے تحت عارضی ووقتی طور سے پیش آئے، اُن کی وجہ سے طلاقِ رجعی، تحریم، ایلاء، وغیرہ کی بھی عارضی صورتیں موجود ہیں، بقول علامہ ملا علی قاریؒ ان سے حضور علیہ السلام کے خلقِ عظیم اور جلال کے مقابلہ میں جمال کا غلبہ ثابت ہوتا ہے اور امت کے لئے ان واقعات سے بہت کچھ سبق اور ہدایت بھی ملتی ہے لیکن جن لوگوں نے ایسے واقعات کو نمایاں کر کے غلط رنگ میں پیش کیا ہے وہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور ان لوگوں کی علمی خام کاری کی بڑی دلیل ہے اسی طرح اس دور کے بعض اہلِ قلم نے صحابہ کرام کی عظیم شخصیتوں کو موضوع بحث بنا کر ایک بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھول دیا ہے، جس سے اب نام کے کمیونسٹ مسلمانوں نے بھی فائدہ اٹھا کر مذہب کی بنیادیں متزلزل کرنے کا بیڑہ اٹھالیا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے حضرتِ عمر فاروقؓ ایسی موقر ومسلّم عظیم ترین اسلامی شخصیت کو بھی لعن وطعن کا ہدف بنالیا ہے، جن کا ہم اس وقت تفصیلی تعارف پیش کر رہے ہیں، والی اللہ المشتکیٰ

السلام کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنے کی ممانعت ہے، حافظ نے دوسرے غیر پسندیدہ جوابات نقل کر کے لکھا کہ ممکن ہے ازواجِ مطہرات میں سے بعض کی آواز خلقی طور سے بلند ہو، یا ممانعت صرف مردوں کو ہو، عورتوں کے لئے کم درجہ کی ہو، یا اس وقت عارضی طور سے سوال و جواب کے اندر آواز بلند ہوگئی ہو، جس کا انہوں نے عمداً ارادہ نہ کیا ہو، یا حضور علیہ السلام کے عفو و کرم پر بھروسہ کر کے ایسا کر بیٹھی ہوں، پھر خلوت کے اندریوں بھی بعض چیزیں گوارا کر لی جایا کرتی ہیں، جو جلوت میں ناگوار ہوتی ہیں۔

علامہ محدث ملا علی قاری حنفیؒ نے جواب دیا کہ اشکال تو جب ہو کہ ان کی آواز کا حضور علیہ السلام کی آواز سے بلند ہونے کا کوئی ثبوت ہو اور ممانعت اسی کی ہے، لہٰذا مراد یہ ہے کہ اُس وقت اپنی عام عادت کے خلاف انہوں نے اپنی آوازوں کو نسبۃً بلند کر دیا تھا، اور انھیں آپ کے خلقِ عظیم کی وجہ سے بھروسہ ہوگا کہ اتنے سے حضور پر ناگواری کا کوئی اثر نہ ہوگا، لہٰذا جب ناگواری نہیں تو معصیت بھی نہیں۔

علاّمہ موصوف نے آخر میں لکھا:۔ اس حدیث سے حضرت عمرؓ کی بہت بڑی منقبت نکلتی ہے تاہم اس سے ان کی عصمت ثابت نہیں ہوتی (جو لازمہ نبوت و رسالت ہے) کیونکہ غیر نبی کو اُن وساوس سے مامون نہیں قرار دیا جا سکتا جو غفلت کا موجب بن سکتے ہیں (گویا یہ شان صرف نبی ہی کی ہے کہ وہ ہمہ وقت غفلت سے مامون ہوتا ہے)

علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا کہ **مالقیک الشیطان** الخ میں حضرت عمرؓ کی دینی صلابت اور ہزل و لایعنی امور سے ہٹ کر صرف کام کی باتوں اور خالص حق پر ہی ہمیشہ دھیان و توجہ دینے کا حال بتلایا گیا ہے، اسی لئے وہ حضور علیہ السلام کی پیشی میں گویا حق کی تلوار تھے، جب حضور علیہ السلام نے چاہا وہ چلی اور جب روکا رک گئی، اس طرح حضرت عمرؓ کا شیطان پر غلبہ و تسلط بھی، درحقیقت حضور علیہ السلام ہی کا غلبہ و تسلط تھا، اور حضرت عمرؓ کی مثال شاہی درباروں کے مارشل کی تھی، جس کے ذریعہ بادشاہ تادیبی یا تعزیری احکام نافذ کرتا ہے (آج کل پارلیمنٹ و اسمبلی میں بھی مارشل ہوتا ہے جو صدر اجلاس کے حکم سے تادیبی و تعزیری کارروائی کرتا ہے۔)

علامہ نوویؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے الفاظِ مذکورہ مظاہر پر محمول ہیں، اور واقع میں حضرت عمرؓ کے رعب و ہیبت کی وجہ سے شیطان اس راستہ سے دور ہو جاتا تھا، جس پر آپ چلتے تھے۔

حافظؒ نے لکھا کہ اوسطِ طبرانی میں حدیثِ حفصہؓ ان الفاظ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد سے شیطان جب بھی ان کے سامنے آتا ہے تو منہ کے بل گر جاتا ہے (فتح الباری ۳۴/۷ و مرقاۃ ۵۴۲/۵)

حضرت عمرؓ کا لذاتِ دنیوی سے احتراز! حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک روز میرے ہاتھ میں درہم دیکھا، پوچھا کیا کرو گے؟ میں نے کہا گوشت لاؤں گا، فرمایا کیوں؟ میں نے کہا گھر میں سب لوگوں کا گوشت کھانے کو جی چاہتا ہے آپ نے فرمایا:۔ کیا خوب! جب بھی تمہارا کسی چیز کو جی چاہے تو بس کھا لیا کرو گے، ایسا کرو گے تو کہیں قیامت کے دن تمہیں خدا کی طرف سے **اذھبتم طیباتکم** نہ سننا پڑے، کہ تم نے دنیا میں ہی ہماری نعمتوں میں سے اپنا حصہ پورا کر لیا، اور ان سے فائدہ اٹھا چکے (ازالۃ الخفاء ۳۷/۱)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ درحقیقت یہ آیت تو کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے، تاہم اس میں چونکہ کفار کے دنیا کے تنعم و راحت پسندی پر تعریض کی گئی ہیں، اس لئے اہل تقویٰ نے جائز تنعم و راحت پسندی سے بھی حتی الامکان احتراز کیا ہے،

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے بہت سی کھانے پینے کی طیبات سے سے احتراز برتا ہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ میں بھی کہیں ان لوگوں جیسا نہ ہو جاؤں جن کی حق تعالیٰ نے توبیخ و تقریع کی ہے، اور ابو مجاز نے کہا کہ بہت سی قومیں قیامت کے دن اپنی دنیا کے بھلے کاموں کا کچھ وجود و نشان نہ پائیں گی تو ان کو کہا جائے گا کہ تم نے ان کے عوض دنیا کی بہاروں اور لذتوں سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔ (ابن کثیر ۱۶۰/۴)

صاحب روح المعانیؒ نے لکھا:۔ حاکم وبیہقی نے روایت کی کہ حضرت عمرؓ نے حضرت جابرؓ کے ہاتھ میں درہم دیکھا، آپ کے سوال پر انہوں نے گوشت خریدنے کا ارادہ بتلایا تو فرمایا:۔ کیا یہ کچھ اچھی بات ہے کہ جب بھی جس چیز کو جی چاہا خرید لیا آیت اذھبتم طیباتکم سے تم کیوں غافل ہو جاتے ہو!

امام احمد، ابن مبارک، ابونعیم وغیرہ نے روایت کی کہ ایک دفعہ اہل بصرہ کا وفد حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے کھانے پر کسی دن تو گھی لگی روٹی ہوتی (بغیر سالن کے) کسی دن روٹی کے ساتھ زیتون کا تیل ہوتا، کبھی سالن کی جگہ گھی، کبھی دودھ، کبھی سوکھے ٹکڑے کٹوا کر پکوا لیتے، اور کبھی کسی دن تازہ گوشت کا سالن بھی ہوتا مگر بہت کم، اور حضرت عمرؓ نے ہم سے فرمایا:۔ واللہ میں تمہارے لذیذ کھانوں کراکر (سینے کا عمدہ گوشت) اسنمہ (کوہانِ شتر کا لذیذ گوشت) صلاء (بھنے ہوئے گوشت) صناب (رائی اور روغنِ زیتون سے بنی ہوئی چٹنی) اور سلائق (سبزیوں کی ترکاری) یا چپاتیوں کی لذت سے ناآشنا نہیں ہوں، مگر میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو ایسی ہی لذتوں کا دلدادہ ہونے پر عار دلائی ہے اور فرمایا اذھبتم طیباتکم الآیہ اس لئے مجھے یہ چیزیں پسند نہیں۔

علامہ موصوف نے مزید لکھا کہ یہ زہد صرف حضرت عمرؓ سے منقول نہیں بلکہ حضور علیہ السلام نے بھی ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ یہ میرے اہل بیت ہیں، اور مجھے پسند نہیں کہ یہ اپنے حصہ کی طیبات دنیوی زندگی میں استعمال کرلیں، پھر لکھا کہ دنیاوی زندگی کی طیبات کے بارے میں زہد کی احادیث بہ کثرت وارد ہیں اور رسول اکرم ﷺ کا حال اس کے بارے میں امت میں معلوم ومشہور ہے تاہم اسی کے ساتھ بحر میں حضرت عمرؓ کے حالات زہد بیان کر کے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ یہ سب بابِ زہد سے متعلق ہے ورنہ آیتِ اذھبتم طیباتکم کا نزول کفارِ قریش کے بارے میں ہوا تھا، اور مطلب یہ ہے کہ تم بھی ایمان لاتے تو یہ طیباتِ آخرتمہیں حاصل ہوتیں مگر تم کفر پر جمے رہے اور ایمان کی نعمت سے محروم ہوئے، اور جلدی کر کے اپنے حصہ کی طیبات (نعمتوں) سے دنیوی زندگی میں ہی فائدہ اٹھا لیا، پس یہ اشارہ ان کے عدمِ ایمان کی طرف ہے، اسی لئے اس پر عذاب کا استحقاق ذکر ہوا ہے (الیوم تجزون عذاب الھون) اگر آیت اہل کفر و ایمان سب کے لئے عام اور اپنے ظاہر پر ہوتی تو عذاب کا ترتب اس پر کیسے ہوتا؟ اور چونکہ اہلِ مکہ لذاتِ دنیوی میں بہت ہی زیادہ منہمک تھے اور ایمان وتعلیماتِ نبویہ سے اعراض کرتے تھے، اسی لئے اس کے بعد پہلے زمانہ کے عربوں کا بھی ذکر مناسب ہوا، جو ان موجودہ سے اموال وجاہ وغیرہ میں کہیں زیادہ تھے، لیکن کفر کی وجہ سے ان پر عذابِ الٰہی مسلط ہوا، فرمایا:۔ واذکر اخاعاد الایہ کہ ذرا ان اہلِ مکہ کو ہود علیہ السلام کا قصہ تو سنا دیجئے، جنھوں نے اپنی قوم عاد کو احقاف[1] کے مقام میں ڈرایا اور خدا کی توحید کی طرف بلایا تھا، مگر وہ کفر وشرک سے باز نہ آئے، کہا کہ ہم سے زیادہ قوت وشوکت والا دنیا میں کون ہے؟ بالآخر ان پر پہلے خشک سالی کا عذاب آیا، اور اس پر بھی متنبہ نہ ہوئے تو ہوا کا عذاب کہ مسلسل آٹھ دن تک آندھیوں کے طوفان اور جھکڑ چلے، جس سے وہ خود بھی ہلاک ہوئے اور ان کی بستیاں بھی نیست ونابود ہوگئیں (روح المعانی ۲۶/۲۴)

مزید افادہ! اس سلسلہ میں بحث تشنہ رہے گی اگر تفسیر مظہری کے افادات بھی ذکر نہ کیے جائیں، علامہ بغویؒ نے فرمایا:۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے تمتع لذاتِ دنیوی پر کفار کو توبیخ وملامت کی ہے، لیکن ثوابِ آخرت کی امید میں رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے بھی لذاتِ دنیوی سے اجتناب فرمایا ہے، بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بارگاہِ نبوی میں پہنچے دیکھا کہ آپ بوریئے پر لیٹے تھے، جس کے

---

[1] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ احقاف عمان ومہرہ کے درمیان تھا، ابن اسحٰق نے کہا کہ ان کے مساکن عمان سے حضرموت تک تھے، (روح المعانی ۲۶/۲۴ وتفسیر مظہری ۸/۴۱۱) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے حضرموت کے شمال میں اس طرح واقع لکھا کہ شرق میں عمان، شمال میں ربع خالی تھا، اور قوم عاد کے مفصل حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے (قصص القرآن ۱/۸۷) تفہیم القرآن ۴/۶۱۴ میں نقشہ کے ذریعہ اس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے اور ۴/۶۱۵ میں جدید معلومات سے بھی مستفید کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نشانات پہلوئے مبارک پر ظاہر تھے، تکیہ چمڑا کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری تھی، عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی امت کوبھی وسعت وآسائش ملے، روم وفارس والوں پر تو اللہ تعالیٰ نے بڑا انعام کیا ہے حالانکہ وہ اس کی عبادت بھی نہیں کرتے، یہ سن کر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔ ابن الخطاب! کیا تم ان باتوں کی فکر وخیال میں لگ گئے؟ ان لوگوں کے لئے تو ان کے حصّہ کی ساری طیبات اور نعمتیں دنیا ہی کی فانی زندگی میں دیدی گئی ہیں، دوسری روایت میں ہے کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ ان کے لئے دنیا اور تمہارے لئے آخرت ہو۔

بخاری ومسلم میں حضرت عائشہؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ متواتر دو دن تک کبھی بھی حضور علیہ السلام کے اہل بیت نے پیٹ بھر کر جو کی روٹی نہیں کھائی، بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو بکری کا گوشت کھا رہے تھے، ان کو بلایا تو کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا:۔ نبی اکرم ﷺ تو دنیا سے رخصت ہوئے اور کبھی جو کی روٹی سے بھی پیٹ نہیں بھرا۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ہم پر بعض مہینے ایسے بھی گزرتے تھے کہ چولھوں میں آگ نہ جلتی تھی، صرف کھجور اور پانی پر گزارہ کرتے تھے، البتہ اکثر انصاری عورتیں ہمارے یہاں دودھ بھیج دیا کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزاءِ خیر عطا فرمائے۔

حضرت ابن عباسؓ سے ترمذی، ابن ماجہ ومسند احمد میں روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ مسلسل کئی رات بھوکے پیٹ سوتے تھے اور آپ کے گھر والوں کے لئے رات کا کھانا نہ ہوتا تھا، اور ان کی غذا میں روٹی اکثر جو کی ہوتی تھی۔

ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رکھ کر گھر والوں کے لئے جو حاصل کئے، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام کی نو ازواجِ مطہرات تھیں، مگر کبھی کسی رات میں ان کے پاس پورا ایک صاع گیہوں وغیرہ کا موجود نہیں ہوا (ایک صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے)

نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو فرمایا:۔ تنعم (عیش وراحت پسندی) سے بچتے رہنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے متنعم نہیں ہوے، بیہقی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ جو اللہ کے دیئے ہوئے تھوڑے رزق پر راضی ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے عمل سے راضی ہوں گے، حدیث جابرؓ میں ہے" تمہارے دلوں میں اس امر کا جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوتا کہ خود بھوکے رہ کر اپنے بھوکے پڑوسی اور چچازاد بھائی کا پیٹ بھرو، ایک روز حضرت عمرؓ نے پانی مانگا، پانی میں شہد ملا کر لایا تو فرمایا، یہ طیّب اور اچھا تو ہے لیکن میں تو اللہ عزوجل کا کلام سُنتا ہوں کہ اُس نے ایک قوم کے لذیذ ومرغوب چیزوں کے استعمال پر نکیر کی ہے، اور فرمایا، **اذھبتم طیباتکم الایہ**، لہٰذا میں تو ڈرتا ہوں کہیں ہماری نیکیوں کا بھی یہیں دنیا میں بدلہ نہ چکا دیا جائے، یہ کہہ کر آپ نے اس شربت کو واپس کر دیا۔

کتبِ تواریخ میں ہے کہ حضرت عمرؓ شام گئے تو ان کے سامنے ایسے عمدہ کھانے پیش کئے گئے، جو پہلے کبھی دیکھے بھی نہ تھے، آپ نے فرمایا:۔ یہ کیا؟! تمہیں معلوم نہیں کہ پہلے سارے مسلمان فقر وافلاس کی زندگی گزار گئے اور انہوں نے پیٹ بھر کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی! حضرت خالدؓ نے عرض کیا کہ انھیں جنت میں سب کچھ مل گیا، اس پر حضرت عمرؓ رو پڑے اور فرمایا:۔ اگر ہمارے حصّہ میں یہی کھوٹی پونجی دنیا کی رہی اور وہ سب جنت کی نعمتوں کے حقدار بن گئے، تب تو ہمارے اور ان کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہوجائیگا۔ (تفسیر مظہری ۴۰۹/۸)

حضرت حفص بن ابی العاص حضرت عمرؓ کی خدمت میں اکثر آتے تھے مگر کھانے کے وقت چلے جاتے، ایک روز آپ نے پوچھا کیا بات ہے تم ہمارے کھانے میں شرکت نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا! میرے گھر کا کھانا آپ کے گھر کے کھانے سے لذیذ ہوتا ہے، اس لئے میں اسی کو پسند کرتا ہوں، آپ نے فرمایا! افسوس تم لذیذ کھانوں پر دم دیتے ہو، کیا تم نہیں سمجھتے کہ میں بھی اگر اپنے گھر میں حکم دوں تو بکری کا سالم بچہ بریاں کیا جا سکتا ہے اور میدے کی روٹی، مویز منقی کی نبیذ بھی تیار ہوسکتی ہے مگر خدا کی قسم مجھے ڈر ہے کہیں اس کے سبب سے قیامت کے دن میری نیکیاں کم نہ ہو جائیں۔ (ازالۃ الخفاء ۱/۴۷۳ وکنز العمال ۶/۳۴۶)

(نوٹ) ازالۃ الخفاء میں حفص بن عمر غلط چھپ گیا ہے اور اس نام کے آپ کے کوئی صاحبزادے تھے بھی نہیں۔

فضائل عمرؓ! تکمیل بحث کیلئے ہم یہاں کنز العمال سے بھی حضرت عمرؓ کے کچھ فضائل ومناقب ذکر کرتے ہیں، کنز العمال کی قسم الاقوال وقسم الافعال میں بہت زیادہ بلکہ تمام کتب حدیث سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے جو مستقل طور سے ترجمہ ہو کر شائع ہو تو بہتر ہے:۔

(۱۴۱/۶) فرمایا (نبی اکرم ﷺ نے) ابوبکر وعمر اس دین اسلام کے لئے بمنزلہ سمع وبصر کے ہیں سر کے لئے۔

فرمایا:۔ میں نے ارادہ کیا کہ اپنے اصحاب کو بادشاہانِ دنیا کے پاس دعوت اسلام کے واسطے بھیجوں جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین کو بھیجا تھا، عرض کیا گیا کہ آپ ابوبکر وعمر کو کیوں نہیں بھیجتے، وہ تو ابلاغ اسلام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں؟ فرمایا ان سے میں مستغنی نہیں ہوں، ان کا مرتبہ دین اسلام کے لئے ایسا ہی ہے جیسے جسم کے لئے آنکھ اور کان کا،

فرمایا:۔ آسمان والوں میں سے میرے دو وزیر جبرئیل ومیکائیل ہیں، اور زمین والوں میں سے ابوبکر وعمرؓ ہیں۔

فرمایا:۔ (حضرت ابوبکر وعمرؓ سے) اگر تم دونوں کسی مشورہ میں ایک رائے پر اتفاق کر لو تو میں اس کے خلاف نہ کروں گا۔

فرمایا:۔ ابوبکر وعمرؓ میرے لئے ایسے ہی ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہارون تھے۔

فرمایا:۔ ابوبکر وعمرؓ آسمان وزمین والوں سے بہتر ہیں اور ان سے بھی جو قیامت تک آئیں گے۔

(۱۴۴/۴) فرمایا:۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ فرشتوں اور انبیاء میں تمہاری مثال کیا ہے، اے ابوبکر! تم تو فرشتوں میں میکائیل کی طرح ہو جو مخلوق کیلئے رحمت لے کر اُترتے ہیں اور انبیاء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہو کہ جب ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی اور ان کیساتھ بہت ہی ناروا سلوک کیا تب بھی فرمایا اے رب! جو میرا اتباع کرے وہ مجھ سے ہے اور جو نافرمانی کرے آپ غفور ورحیم ہیں، اور اے عمر! تمہاری مثال فرشتوں میں جبرئیل جیسی ہے، جو اعداءِ دین کے لئے شدت، سختی اور عذاب لے کر اُترتے ہیں، اور انبیاء میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ہو کہ فرمایا:۔ اے رب! روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑ۔

(۱۴۵/۶) فرمایا:۔ ابوبکر وعمرؓ کو برا نہ کہو کہ وہ بجز انبیاء ومرسلین کے تمام اولین وآخرین کہول اہل جنت کے سردار ہیں، اور حسن وحسین کو برا نہ کہو کہ وہ سب جوانانِ اہل جنت کے سردار ہیں، علی کو برا نہ کہو کہ جس نے ان کو برا کہا گویا مجھے برا کہا اور جس نے مجھے بُرا کہا گویا خدا کو بُرا کہا، اور جو خدا کو بُرا کہے گا، اس کو خدا عذاب دے گا۔

فرمایا:۔ عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے سارے لوگوں پر فخر کیا، اور خاص طور سے عمر بن الخطاب پر، اور آسمان میں کوئی فرشتہ ایسا نہیں جو عمر کی توقیر نہ کرتا ہو، اور زمین میں کوئی شیطان ایسا نہیں جو عمر سے بھاگتا نہ ہو۔

(۱۴۶/۶) فرمایا:۔ عمر بن الخطاب اہل جنت کے چراغ ہیں، عمر میرے ساتھ ہیں، اور میں عمر کے ساتھ، اور حق میرے بعد عمر ہی کے ساتھ ہوگا، جہاں بھی وہ ہوں۔

فرمایا:۔ مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا:۔ عمر کی موت پر اسلام گریہ کرے گا۔

فرمایا:۔ سب سے پہلے جس کو حق تعالیٰ سلام ومصافحہ کا شرف عطا کریں گے وہ عمر ہوں گے، اور سب سے پہلے ان ہی کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کریں گے۔

(۱۴۷/۶) فرمایا:۔ کسی معاملہ میں لوگوں نے کچھ کہا اور عمر نے بھی کہا، تو قرآن مجید میں عمر کے موافق ہی نزول ہوا۔

فرمایا:۔ اگر میں مبعوث نہ ہوتا تو عمر مبعوث ہوتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید وتوفیق خیر کے لئے دو فرشتوں کو مقرر کر دیا ہے، اگر وہ کسی وقت خطا بھی کریں تو ان کو اس سے صواب کی طرف پھیر دیں گے۔

فرمایا:۔اے عمر! اللہ تعالیٰ نے تم کو دنیا وآخرت دونوں کی خیر وفلاح کی بشارت دی ہے۔

(۶/۴۴۸) فرمایا:۔زمین وآسمان میں انبیاء کے بعد عمر سے بہتر پیدا نہیں ہوا۔

فرمایا:۔میری امت کیلئے فتنہ کا دروازہ بند رہے گا، جب تک عمران میں رہیں گے، جب وہ وفات پائیں گے تو امت کے لئے پے درپے فتنوں کی آمد شروع ہوجائیگی۔

(۶/۴۴۹) ام المومنین حضرت حفصہؓ اور دوسرے صحابہؓ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ اگر آپ اچھا کھائیں اور پہنیں تو بہتر ہوتا کہ کام پر قوت ملے اور لوگوں کی نظروں میں بھی زیادہ وقیع ہوں تو فرمایا تم سب میرے خیر خواہ ہو لیکن میں نے اپنے دونوں صاحب (رسول اللہ ﷺ وابوبکرؓ) کو زندگی کے ایک خاص نہج وطریقہ پر دیکھا ہے، اگر میں اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کروں گا تو منزل پر پہنچ کران سے نہ مل سکوں گا، اور حضرت حفصہؓ کو خاص طور سے خطاب کیا کہ تم خود ہی فیصلہ کرو، کیا تمہیں حضور علیہ السلام کی عسرت وتنگی معاش کے حالات یاد نہیں رہے، پھر ایک ایک بات کا ذکر کر کے ان کو خوب رلایا، اور فرمایا جب تم نے مجھ سے ایسی غیر متوقع بات کہہ دی ہے تو سن لو کہ واللہ! میں ضروران دونوں جیسی ہی سختی کی زندگی گزاروں گا، اس امید پر کہ شاید آخرت میں ان جیسی خوشگوار زندگی پاسکوں، اسی قسم کا اس سے زیادہ مفصل قصہ ۶/۴۴۹ میں بروایتِ حسن بصری ۵۵۷۔۲ والا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عراق وبلادِ فارس وغیرہ فتح ہوئی اور مالِ غنیمت ہر قسم کا مدینہ طیبہ پہنچا تو ان میں انواع واقسام زرد وسرخ رنگ کے حلوے اور مٹھائیاں بھی تھیں، حضرت عمرؓ نے ان کو ذرا سا چکھا اور فرمایا اچھا ذائقہ اور عمدہ خوشبو ہے لیکن اے مہاجرین وانصار! سمجھ لو کہ ان ہی کھانوں پر تم میں سے بیٹے باپ کو اور بھائی بھائی کو قتل کریں گے، پھر آپ نے وہ سب چیزیں شہداءِ وانصار کے پسماندگان میں تقسیم کرادیں، پھر مہاجرین وانصار نے جمع ہو کر باتیں کیں کہ اس شخص (حضرت عمرؓ) کو دیکھو کہ ملت کے غم میں کیا حال بنالیا ہے، نہ کھانے کی فکر ہے نہ پہننے کا ہوش ہے دربار کسریٰ وقیصر فتح ہوئے اور مشرق اور مغرب سے عرب وعجم کے وفود ان کے پاس آتے ہیں، ان کے بدن پر جبہ دیکھتے ہیں جس میں بارہ پیوند لگا رکھے ہیں، پس اگر اے اصحاب رسول اللہ ﷺ! تم سب اکابرِ امت ہو، حضور کے ساتھ زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے تم سب مل کر اگر ان سے کہو تو بہتر ہے کہ یہ اس جبہ کو بدل کر عمدہ نرم کپڑے کا جبہ بنالیں جس سے رعب قائم ہو اور کھانے کا بھی صبح وشام بہتر انتظام ہو، جس میں اکابر مہاجرین وانصار بھی شریک ہوا کریں، سب نے کہا، یہ بات تو حضرت عمرؓ سے حضرت علیؓ ہی جراءت وہمت کر کے کہہ سکتے ہیں وہ آپ کے خسر بھی ہیں، یا پھر آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کہہ سکتی ہیں جو حضور علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ ہیں، اس مشورہ کے بعد حضرت علیؓ سے عرض کیا گیا تو انہوں نے عذر کیا اور فرمایا اس کام کی جراءت ازواجِ مطہرات ہی کرسکتی ہیں کہ وہ امہات المومنین ہیں،

راوی قصہ حضرت احنف بن قیس کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ وحفصہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ ایک ہی جگہ بیٹھی تھیں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں اس بارے میں حضرت عمرؓ سے درخواست کروں گی، حضرت حفصہؓ نے فرمایا مجھے تو امید نہیں کہ وہ مانیں گے، بہرحال یہ دونوں گئیں، حضرت عائشہؓ نے اجازت لے کر بات کی کہ رسول اکرم ﷺ اس دنیا سے خدا کی رحمت ورضوان میں تشریف لے گئے، نہ انہوں نے خود دنیا کا ارادہ کیا نہ دنیا ہی انھیں اپنی طرف متوجہ کرسکی، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ بھی سننِ نبویہ کا احیاءِ کر کے، کذابین کا قتل کر کے، باطل پرست طاقتوں کا زور توڑ کر رعیت میں عدل اور مساوی تقسیم فرما کر گئے تو حق تعالیٰ نے ان کو بھی اپنی رحمت ورضوان کی طرف بلا لیا، انہوں نے بھی دنیا کا ارادہ نہیں کیا، اور نہ دنیا ان کو اپنی طرف کھینچ سکی، اب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر قیصر وکسریٰ کے ملک فتح کرائے اور مشرق ومغرب کے کنارے آپ کے لئے قریب کردیئے گئے، ان کے خزانے اور اموال آپ کے قبضہ میں دے دیئے اور اس سے بھی زیادہ ہم آئندہ امید کرتے ہیں، آپ کے پاس سلاطین عرب وعجم کے وفود آتے ہیں، ایسی صورت میں آپ کے بدن پر جبہ ہے جس میں بارہ

پیوند لگے ہیں، اگر آپ اس کو بدل کر نرم وعمدہ کپڑے کا جبہ بنوالیں، اس کا اثر دوسروں پر بہت اچھا پڑے گا، اور کھانے کا بھی نظم بہتر ہو، جس میں آپ کے پاس بیٹھنے والے مہاجر وانصار بھی شریک ہوا کریں، حضرت عائشہؓ کی یہ سب گفتگو سن کر حضرت عمر رونے لگے، اور بہت زیادہ روئے، پھر کہا میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تم بتا سکتی ہو کہ رسول اکرم ﷺ نے کبھی دس دن یا پانچ دن یا تین دن تک بھی مسلسل گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کے کھائی ہے یا کبھی آپ نے ایک دن کے اندر صبح وشام دونوں وقت کھانا کھایا ہو، تا آنکہ آپ حق سے جا ملے۔

حضرت عائشہؓ نے کہا نہیں

پھر آپ نے ان سے فرمایا: تم جانتی ہو کہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے کھانا کبھی ایسی تپائی پر لگایا گیا ہو جو زمین سے ایک بالشت اونچی ہو؟ آپ کھانے کے لئے فرماتے تو دستر خوان زمین پر بچھا دیا جاتا تھا، اور کھانے کے بعد حکم فرماتے تو اُٹھا لیا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ وحفصہؓ نے فرمایا، اسی طرح ہوتا تھا، پھر آپ نے دونوں سے فرمایا کہ تم رسول خدا ﷺ کی زوجاتِ مطہرہ اور امہات المومنین ہو، تم دونوں کا حق سب مومنوں پر ہے، اور خاص کر مجھ پر ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے دنیا کی رغبت دلانے کو آئیں، جبکہ مجھے خوب معلوم ہے کہ حضور علیہ السلام نے صوف کا جبہ پہنا تھا، جس کی سختی سے بسا اوقات آپ کی کھال پر خراش ہو جاتے تھے، تم بھی جانتی ہوں گی، انہوں نے فرمایا بیشک ایسا ہی تھا، پھر فرمایا تم یہ بھی جانتی ہوں گی کہ آپ اپنی عباء اکہری بچھا کر اس پر سورہے تھے، اور ایک کمبل تمہارے گھر میں تھا، جس سے دن میں بیٹھنے کے فرش کا اور رات میں بچھونے کا کام لیا جاتا تھا، ہم حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ کے پہلو پر بوریہ کے نشانات دیکھتے اور ہاں اے حفصہ! تم ہی نے تو مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک رات تم نے آپ کے بستر کی تہ ڈبل کردی تھی، آپ نے اس کی نرمی سے راحت پائی اور سو کر اذان بلال سے پہلے نہ اُٹھ سکے، تو تم سے فرمایا تھا اے حفصہ! تم نے آج کیا کیا کہ میرا بستر ڈبل کر دیا، جس سے میں صبح تک سوتا رہا (یعنی رات کو تہجد کے لئے بیدار نہ ہوسکا) مجھے دنیا سے کیا مطلب! تم نے نرم بستر بچھا کر کیوں خُدا کی یاد سے مجھے غافل کر دیا ہے؟!

اے حفصہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ حضور علیہ السلام کے اگلے پچھلے سارے گناہ بخشدیئے گئے تھے، پھر بھی بسا اوقات شام کے وقت بھوکے ہوتے اور اسی حالت میں عبادت کرتے ہوئے سو جاتے، اور ہمیشہ ہی یہ معمول رکھا کہ رکوع، سجود، بکاء وتضرع میں اپنے دنوں اور راتوں کے اوقات بسر فرماتے تھے، تا آنکہ حق تعالیٰ نے اپنی رحمت ورضوان کی طرف بلالیا' لہٰذا حضرت عمرؓ نے اپنے دونوں پیشرو صاحبوں کی اقتداء میں نہ کبھی عمدہ کھانا کھایا، نہ نرم کپڑا پہنا، نہ دو سالن جمع کئے بجز نمک وروغنِ زیتون کے، اور نہ کبھی مہینہ میں ایک بار سے زیادہ گوشت کھایا، آخر عمر تک یہی معمول رہا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ!

(۶/۳۴۰) حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ خدائے تعالیٰ کے مال میں میں نے اپنے کو بمنزلہ ولیِ یتیم کے سمجھا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو بقدر معروف کے لے سکتا ہوں اور جب مجھے مقدرت حاصل ہو تو اس کو واپس کردوں، اور اگر ضرورت نہ ہو تو اس کے لینے سے اجتناب کروں۔

قیس بن الحجاج کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر کو فتح کیا تو بونہ (جولائی؟) کا مہینہ آنے پر وہاں کے لوگوں نے اُن سے آکر کہا کہ ہمارے ملک کے دریائے نیل کے لئے ایک خاص رسم ہے کہ بغیر اس کی ادائیگی کے وہ جاری نہیں ہوتا، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ کہا کہ اس ماہ کی بارہ تاریخ گزرنے پر ایک کنواری لڑکی اس کے والدین کو راضی کر کے لے لیتے ہیں اور اس کو بہترین اعلیٰ قسم کے زیورات ولباس سے مزین کر کے دریائے نیل میں ڈال دیا کرتے ہیں، حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ یہ بات اسلام کے دورِ اقتدار میں تو نہیں کی جاسکتی، اسلام تو پہلے غلط رسومات کو مٹانے کے لئے آیا ہے وہاں کے لوگوں نے جولائی اگست وستمبر کے مہینوں میں انتظار کیا لیکن نیل کا پانی بند رہا، نہ تھوڑا جاری ہوا نہ زیادہ، تا آنکہ وہاں کے لوگوں نے وطن چھوڑ کر جانے کا ارادہ کرلیا، کیونکہ پانی نہ ملنے سے قحط کی صورت ہو جاتی، حضرت

عمرو نے یہ حال دیکھا تو حضرت عمرؓ کو خط لکھ کر سارے حال سے مطلع کیا، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ تم نے ٹھیک کیا، اسلام پہلے غلط چیزوں کو مٹانے کیلئے آیا ہے، میں ایک بطاقہ (چھوٹا رقعہ) تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، اس کو نیل کے اندر ڈال دینا، حضرت عمرؓ کا مکتوب گرامی پہنچا، اور بطاقہ مذکورہ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا:۔ عبداللہ امیر المومنین کی طرف سے اہل مصر کے نیل کی طرف امابعد! اے نیل! اگر تو اپنی طرف سے جاری ہوا کرتا تھا تو مت جاری ہو، اور اگر ذاتِ واحد وقہار تجھ کو جاری کیا کرتی ہے، تو ہم اسی ذاتِ واحد وقہار سے التجاء کرتے ہیں کہ تجھے جاری کردے، حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس بطاقہ کو یوم الصلیب سے ایک روز قبل نیل میں ڈال دیا، جبکہ اہلِ مصر وطن چھوڑ کر نکلنے کو بالکل تیار ہو چکے تھے، کیونکہ ان کی معیشت کا سارا دارومدار نیل کی روانی پر تھا (اسی کے پانی سے کاشت وغیرہ ہوتی تھی، کیونکہ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے حضرت عمرؓ[1] کے اس واقعہ کی برکت سے حق تعالیٰ نے یوم الصلیب میں نیل کا پانی اتنی بہتات اور تیزی سے جاری کر دیا کہ سولہ ہاتھ گہرا بہنے لگا، اور وہ پُرانی بُری رسم ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ (اس کے بعد سے آج تک نیل اسی طرح بہتا ہے)

حضرت عمرؓ ایک مرتبہ بنی حارثہ کی گڑھی میں تشریف لے گئے، وہاں محمد بن مسلمہ سے ملاقات ہوئی، آپ نے ان سے پوچھا میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کہا واللہ! میں آپ کو جیسا بہتر چاہتا ہوں ویسا ہی دیکھتا ہوں، اور ہر ایک جو آپ کیلئے خیر چاہتا ہے وہ بھی ایسا ہی دیکھتا ہے میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ (بیت المال کے لئے) اموال جمع کرنے میں آپ کامل قوت وتدبیر کے مالک ہیں، اور ساتھ ہی تورّع بھی کرتے ہیں کہ اپنے صرف میں کبھی نہیں لاتے، اور عدل وانصاف کے ساتھ ان اموال کو دوسرے مستحق لوگوں پر صرف کرتے ہیں، اگر آپ اس بارے میں کبھی بھی ناحق کرتے تو ہم آپ کو اس طرح سیدھا بھی کر دیتے جس طرح تیروں کو ان کے شکنجہ میں ڈال کر سیدھا کر دیا جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر تعجب وپسندیدگی کا اظہار کیا تو محمد بن مسلمہ نے پھر وہی کلمات دہرائے، اور پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ خدا کا بڑا شکر ہے، جس نے مجھے ایسی قوم میں خدمت کا موقع دیا جو میری غلطی پر مجھے سیدھا بھی کرسکتی ہے۔

(۶/۳۳۱) حضرت عمرؓ نے ''بقیع'' کے میدان وآراضی کو بیت المال کے گھوڑوں[2] کے واسطے، اور ''ربذہ'' کو صدقہ کے اونٹوں کے لئے محفوظ کر دیا تھا، اور ہر سال تیس ہزار اونٹ لوگوں کو ان کی ضرورتوں کے لئے دیدیا کرتے تھے (۶/۳۵۰) میں چالیس ہزار کی بھی روایت ہے۔ سائب بن یزید کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا بیت المال کے گھوڑوں کی رانوں پر ''جیش فی سبیل اللہ'' کا نشان دیا جاتا تھا۔

(۶/۳۳۲) حضرت عمرؓ ایک عرصہ تک تو خدماتِ خلافت کے ساتھ اپنے طور پر ہی معیشت کا بھی بوجھ اٹھاتے رہے اور بیت المال سے کچھ نہ لیا، لیکن جب خلافت کے کاموں سے وقت بچا ہی نہ سکے، اور گھر کے خرچ میں سخت پریشانی پیش آئی تو صحابہ کرام کو جمع کر کے مشورہ کیا، سب نے طے کیا کہ آپ بیت المال سے اپنا خرچ لیں تو پھر روزانہ دو درہم لینے لگے تھے، جس سے اپنا اور عیال کا گزارہ کرتے تھے

---

[1] حضرت عمرؓ کی دوسری بڑی کرامت کا ذکر کنز العمال ۶/۳۳۲ میں ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ کے درمیان ''یا ساریۃ الجبل'' کی صدا لگادی دو تین بار کہہ کر آگے خطبہ حسب عادت پورا کیا، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یہ آج آپ نے درمیان میں کیا کہا تھا؟ فرمایا:۔ میرے دل میں یہ بات گزری کہ مشرکین نے ہمارے بھائیوں کو شکست دیدی ہے اور وہ پہاڑ کی طرف سے بھی آکر حملہ کردیں گے جس سے مسلمان دونوں طرف سے پس جائیں گے، اس لئے میری زبان سے نکل گیا کہ پہاڑ کی طرف خیال کرو، ایک ماہ بعد جب فتح کی خبر لے کر شخص مدینہ طیبہ آیا تو اس نے بتلایا کہ ہم سب نے اُس دن جمعہ کو حضرت عمرؓ کی آواز سُن لی تھی، اور فوراً ہم نے پہاڑ کی طرف رُخ کر کے وہاں کے مورچے سنبھال لئے تھے اور خدا نے ہمیں فتح دی۔ ''مؤلف''

[2] گھوڑوں کی خاص طور سے پرورش وپرداخت فوجی ضروریات کے تحت کرتے تھے، کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے نو مقامات کو بڑا فوجی مرکز قرار دیا تھا، مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، دمشق، حمص، اردن، وفلسطین ان کے علاوہ تمام اضلاع میں بھی فوجی بارکیں چھاؤنیاں تھیں، جہاں تھوڑی فوج ہمیشہ رہتی تھی) ہر بڑے مرکز میں چار ہزار گھوڑے ہروقت پورے سازوسامان سے لیس رہتے تھے، اور موسم بہار میں تمام گھوڑے سرسبز وشاداب مقامات میں بھیج دیئے جاتے تھے، خود مدینہ کے قریب جو چراگاہ تیار کرائی تھی، اس کا ذکر اوپر ہوا ہے، اور بعض جگہ نظر سے گزرا کہ صرف مدینہ منورہ کی ہی چھاؤنی میں تیس ہزار گھوڑے تھے، واللہ تعالیٰ اعلم، حضرت عمرؓ کی فوجی وسیاسی خدمات کا کسی قدر قابلِ ذکر حصہ 'الفاروق' اور 'خلفائے راشدین' وغیرہ میں شائع ہوگیا ہے اور آپ کے فقہی مسائل کا تفصیلی تذکرہ ازالۃ الخفاء میں ہوا ہے ''مؤلف''

اور فرماتے تھے میرے لئے اس سے زیادہ موزوں نہیں، اپنے لئے ایک چادر اور ایک تہمد گرمیوں میں بناتے، اور تہمد پھٹ جاتا تو پیوند لگا لگا کر سال پورا کر لیتے، حضرت ابن عمرؓ نے بتلایا کہ جوں جوں ہر سال مسلمانوں اور بیت المال کے لئے اموال کی آمد بڑھتی گئی، اتنا ہی آپ اپنے کپڑے کی حیثیت بجائے بڑھانے کے اور کم کرتے جاتے تھے، حضرت حفصہؓ نے کچھ عرض کیا تو فرمایا: تم جانتی نہیں یہ میں مسلمانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کے مال میں سے لیتا ہوں، اور اتنا مجھے کافی ہے زیادہ کیوں لوں؟!

اہم فائدہ! اوپر جو ہم نے حضرت عمرؓ کی آواز امیرِ لشکرِ مسلمین ساریہ اور ان کے ساتھی مجاہدین تک پہنچنے کا واقعہ کنز العمال سے نقل کیا ہے حالانکہ وہ لوگ مدینہ طیبہ سے سینکڑوں میل دور کے فاصلہ پر تھے اور اس واقعہ کو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی محب طبری سے ازالۃ الخفاء ۳۳۷ میں نقل کیا ہے، یہ واقعہ مکاشفات و کراماتِ فاروقی میں سے ہے کہ آپ کی آواز بغیر کسی مادی آلہ کے اتنی دور پہنچ گئی، اور کبھی سُننے والے کی فضیلت وخصوصیت ہوتی ہے کہ وہ دھیمی آواز کو فاصلہ پر سُن لے، جس طرح رسول اکرم ﷺ نے نمازِ ظہر یا عصر میں اپنے ایک مقتدی کی قراءۃ سورۂ اعلیٰ سُنی اور نماز ختم کر کے پوچھا کہ میرے پیچھے سبح اسم ربك الاعلیٰ کس نے پڑھی؟ ایک شخص نے کہا کہ میں نے، اور میری نیت خیر وثواب حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھی، اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں! مجھے معلوم ہوا کہ کوئی میری قراءت میں گڑبڑ کر رہا ہے (فتح الملہم ۲/۳۴ج) یا مثلاً فرشتوں کے بارے میں وارد ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی کہو کیونکہ آسمانوں کے فرشتے بھی اس وقت آمین کہتے ہیں، اور جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ ساتھ ادا ہوگئی اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے، حافظؒ نے لکھا کہ مراد زمین کے فرشتے بھی ہو سکتے ہیں جو نماز جماعت میں شرکت کرتے ہیں، یا آسمانوں کے، یا سب کے سب مراد ہیں، کیونکہ روایات میں آسمانی فرشتوں کا بھی ذکر موجود ہے[1] (فتح الملہم ۲/۵۲ج)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واسطے جن وانس وطیور مسخر کر دیئے گئے تھے، اور ہوا کو بھی ان کا تابع فرمان کر دیا گیا تھا، ان کے

---

[1] آسمانی فرشتوں کا زمین پر نماز پڑھنے والوں کی آمین سُن کر آمین کہنا یہ بتلاتا ہے کہ سننے سُنانے کے بارے میں فاصلوں کی دوری کوئی معنی نہیں رکھتی اور آج کل اہل سائنس نے مادی آلات وذرائع سے جو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور لاسلکی پیغام رسانی وغیرہ کی ایجاد کی ہے وہ انبیاء اولیا اور فرشتوں کے بلا اسباب مادی سماع واسماع سے زیادہ حیرت زدہ نہیں ہے، کیونکہ ہمارے یہ فاصلے نسبۃً بہت ہی معمولی اور غیر اہم ہیں۔ مثلاً خیال کیجئے! ہماری زمین سے آسمانِ اوّل تک کا فاصلہ کتنا ہے سارے ستارے وسیارے جو اربوں کھربوں کی تعداد میں ہیں سب کے سب آسمانِ اوّل کے نیچے ہیں، اور سورج کی روشنی طلوع کے بعد ۸ منٹ میں زمین تک پہنچتی ہے جو ہم سے ۹ کروڑ ۲۹ لاکھ میل دور ہے اور ہم سے نزدیک ترین سیارہ کوکپ سنگ ہے جو ہم سے آٹھ نوری سال یعنی ۴۸۰ کھرب میل دور ہے اور اس کی روشنی ہم تک چار سال میں پہنچتی ہے اور بعض ستارے ایسے بھی ہیں جن کی روشنی ہزاروں لاکھوں اور کئی کروڑ برس میں زمین تک پہنچتی ہے، چنانچہ ایک ستارہ حال میں دریافت ہوا ہے جو زمین سے آٹھ سو مہاسنگ میل دور ہے مزید تفصیل نطق انور میں ملاحظہ کریں، غرض اتنا عظیم ووسیع فاصلہ تو صرف زمین اور آسمانِ اوّل کے درمیان ہے اور ہر دو آسمانوں کے درمیان بھی اتنا اتنا ہی فاصلہ ہے اور سب ہی آسمانوں کے فرشتے زمین پر آمین کہنے والوں کی آواز سُنتے ہیں، پھر حیرت ہے کہ ان امورِ غیبیہ پر ایمان لانے والے اور حق تعالیٰ کی اتنی لامحدود ووسیع ترین کائنات کی پیدائش، بقاوفنا پر قدرت اور پورے نظام کے ہزاروں، لاکھوں برس سے کامل ومکمل باضابطگی کے ساتھ چلانے والے کے وجود پر یقین رکھنے والے آج چاند کے سفر پر حیرت کر رہے ہیں حالانکہ وہ زمین سے صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے اور خلائی نظام کے اندر اس کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ ہماری نمازوں کی فاتحہ والی دعائیں کتنی عظیم اہمیت رکھتی ہیں کہ اگر ہم ان کو پوری توجہ قلب کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں پیش کریں اور آخر میں آمین کہیں تو زمین وآسمانوں کے لاتعداد فرشتے بھی اپنی سفارشِ قبول کو شامل مسل کر دیتے ہیں اور اس پر حق تعالیٰ کی رضا کا وہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے جس کی برکت سے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اس سے سورۂ فاتحہ کا "ام القرآن" ہونا ساری سورتوں سے زیادہ اعظم واہم ہوگا، نماز کا بغیر اس کے ناقص وناتمام رہنا، انفرادی نماز میں ہر شخص کا اس کو پیش کرنا، اور نماز جماعت میں صرف امام کا اس ام القرآن وامام القرآن کو اپنی اور سب کی طرف سے پیش کرنا، اور آمین پر امام ومقتدی کے ساتھ زمین وآسمانوں کے فرشتوں کا بھی التجائے قبول کرنا (جو قبولیت ومغفرتِ ذنوب کی امید کو نہایت درجہ قوی کر دیتا ہے) وغیرہ امور اچھی طرح سمجھ میں آجاتے ہیں، ان امور کی اس سے زیادہ وضاحت وتفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وبہ نستعین!

حالات سورۂ انبیاء، نمل، سبا، اور ص میں ذکر ہوئے ہیں اور علامہ محدث ابن کثیر، علامہ آلوسی، اور علامہ عثمانیؒ نے فوائد میں عمدہ تشریحات کی ہیں، آپ نے لکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک تخت تیار کرایا تھا، جس پر مع اعیانِ دولت بیٹھ جاتے اور ضروری سامان بھی بار کرلیا جاتا، پھر ہوا آتی، زور سے اس کو زمین سے اٹھاتی، پھر اوپر جاکر نرم ہوا ضرورت کے مناسب چلتی یمن سے شام اور شام سے یمن کو مہینہ کی راہ دوپہر میں پہنچا دیتی، صاحب روح المعانی (متوفی ۱۲۷۰ھ) نے یہ بھی لکھا کہ اہل لندن ایک زمانہ سے ہوائی جہاز ایجاد کرنے کی سعی کررہے ہیں مگر ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے (۱۷/۷۸)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے لکھا کہ ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے باوجود شدید اور تند و تیز ہونے کے نرم و آہستہ روی کے باعث "راحت" ہو جاتی تھی اور تیز روی کا یہ عالم تھا کہ صبح و شام کا جدا جدا سفر ایک شہسوار کی مسلسل ایک ماہ کی رفتار مسافت کے برابر ہوتا تھا، گویا حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت انجن و مشین وغیرہ اسبابِ ظاہر سے بالاتر، صرف خدائے تعالیٰ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز مگر سبک روی کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا (قصص القرآن ۲/۱۰۲)

اس بارے میں مولانا آزاد نے ترجمہ کیا کہ ہم نے (سمندر کی) تند ہواؤں کو بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا کہ ان کے حکم پر چلتی تھیں اور اس زمین کے رُخ پر جس میں ہم نے بڑی ہی برکت رکھ دی ہے یعنی فلسطین اور شام کے رُخ پر جہاں بحرِ احمر اور بحرِ متوسط سے دور دور کے جہاز آتے تھے (ترجمان القرآن ۴۸۰)

علامہ مودودی صاحب نے بھی آیات قرآنی کا مجمل تو بحری سفر ہی قرار دیا ہے تاہم ہوائی سفر بھی مراد لینے کی گنجائش اور اجازت دی ہے کیونکہ یہ بھی اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے (تفہیم القرآن ۲/۱۷۶)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنی مشہور تصنیف اشاعتِ اسلام ۴۸۰ میں لکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا مسخر کردی گئی تھی جو کوئی کہیں گفتگو کرتا ہوا اس کو پہنچا دیتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہوا میں آواز محفوظ رکھنے کی قابلیت موجود ہے یہ بات حضرت سلیمان علیہ السلام کی خصوصیت میں سے تھی کہ بلا کسی آلہ اور ذریعہ کے آواز دور و نزدیک کی محفوظ پہنچ جاتی تھی، مگر یہ ضرور ہے کہ اہل علم و دانش کو اُس علم نبوت سے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا ہوا تھا، اس کے اصول ضرور معلوم ہو گئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُن اصولوں سے کام بھی لیا گیا ہو، مگر وہ اب زمانہ کے دوسرے ہزار ہا عجائب کے ساتھ نسیاً منسیاً ہو گئے ہوں، غالباً مولانا مرحوم کی اس تحریر کا ماخذ حضرت اقدس علامہ کشمیریؒ کی یہ تحقیق ہے کہ جتنے معجزات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے تھے، وہ سب آئندہ ہونے والی مادی تحقیقات و ایجادات و ترقیات کا پیش خیمہ تھے اور دونوں میں فرق زمین و آسمان کا ہے کہ ان کو بغیر کسی ظاہری آلہ و ذریعہ کے عطا ہوئے تھے، اس لئے معجزہ قرار پائے اور بعد کے سائنسدانوں نے ظاہری و مادّی ذرائع و وسائل کام میں لاکر ان ہی جیسے عجائب و غرائب پیش کئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۶/۳۳۴) حضرت علیؓ نے فرمایا:۔ میرے علم میں بجز حضرت عمرؓ کے کوئی شخص نہیں جس نے کھلم کھلا ڈنکے کی چوٹ پر ہجرت کی ہو، سب ہی چھپ کر نکلے، مگر آپ نے جب ہجرت کا قصد کیا تو تلوار حمائل کی، کمان کاندھے پر ڈالی، ہاتھ میں تیر لئے، کعبہ معظمہ کے پاس پہنچے، اشرافِ قریش کعبہ کے گرد صحن میں بیٹھے تھے، آپ نے سات مرتبہ طواف کیا، دو رکعتیں مقام ابراہیم پر پڑھیں، پھر ایک ایک گروہ قریش وغیرہ کے پاس گئے اور فرمایا:۔

"بد باطن لوگوں کی صورتیں مسخ ہوں، جو چاہے کہ اس کی ماں اس سے محروم ہو، اس کے بچے یتیم ہوں اور اس کی بیوی رانڈ ہو تو وہ مجھ سے اس وادی کے پیچھے ملے" حضرت علیؓ نے فرمایا:۔ یہ اعلان کر کے آپ نے ہجرت کی اور کسی کو آپ کا پیچھا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

(۶/۳۳۶) حضرت مجاہد نے فرمایا:۔ ہم لوگ آپس میں بات کیا کرتے تھے کہ حضرت عمرؓ کی امارات کے زمانہ میں شیاطین قید تھے ان کی

شہادت پر پھیل گئے، حضرت عمرؓ کی انگوٹھی پر ”کفی بالموت واعظاً یا عمر!“ کندہ تھا”یعنی اے عمر! موت عبرت ونصیحت کے لئے کافی ہے“

(۶/۳۳۹) حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایک دن حضرت عمرؓ گھوڑے پر سوار ہوئے اور اس کو دوڑایا تو اس حالت میں ان کی ران کھل گئی، اہلِ نجران نے اس پر جو سیاہ تل تھا دیکھ لیا، اور کہا کہ اس نشان والے آدمی کا ذکر ہماری کتاب میں ہے کہ وہ ہمیں ہماری زمین سے نکال دے گا۔

(۶/۳۴۰) حضرت مجاہد نے فرمایا:۔ حضرت عمرؓ کی جو رائے ہوتی تھی اسی کے مطابق قرآن مجید نازل ہوتا تھا۔

(۶/۳۴۱) حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ میں ۴۴واں شخص اسلام لایا تو آیت ”یاایھا النبی حسبك الله ومن اتبعك من المومنین نازل ہوئی، اے نبی! آپ کے لئے اللہ تعالیٰ اور جتنے لوگ ایمان لا کر آپ کا اتباع کر چکے ہیں کافی ہیں۔

(۶/۳۴۳) حضرت عمرؓ نے قحط کے سال میں گھی کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا تھا اور زیتون کا تیل کھاتے تھے، جس سے آپ کو نفخ شکم اور قراقر کی شکایت ہوگئی تھی، اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا کرتے تھے، جتنا جی چاہے قرقر کر، ہمارے پاس اس (روغنِ زیتون) کے سوا کچھ نہیں ہے تا آنکہ سب لوگ قحط کی بلا سے نجات پائیں۔

آپ نے اُس سال گوشت سے بھی اجتناب کر لیا تھا، اور کہا جب تک عام لوگوں کو بھی میسر نہ ہو میں نہیں کھاؤں گا ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر قحط ختم نہ ہوا تو حضرت عمرؓ مسلمانوں کے غم میں ہلاک ہو جائیں گے، حضرت عمرؓ کی بعض ازواجِ مطہرات نے بیان کیا کہ آپ نے قحط کے سال میں کسی سے قربت نہیں کی۔

خلیج عمرؓ! (۱۲/۳۴۴) حضرت عمرؓ نے فاتحِ مصر حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے اصحاب کو بلا کر فرمایا:۔ ”میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ ایک خلیج دریائے نیل سے بحرِ قلزم تک کھودی جائے، اس سے اہل حرمین کو غلہ وغیرہ آنے میں بہت سہولت ہوگی کیونکہ بری راستہ سے دور دراز مسافت طے کر کے ان چیزوں کو لانا پڑتا ہے، تم اپنے اصحاب سے مشورہ کر کے مجھے مطلع کرو“ انہوں نے اپنے اصحاب واہل مصر سے جو ساتھ تھے مشورہ کیا، ان سب کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور خطرہ محسوس کیا (شاید یہ کہ دشمن سہولت سے ان پر چڑھ آسکتے ہیں) اور کہا کہ آپ امیر المومنین کو اچھی طرح سے ڈرا دیں تا کہ وہ اس ارادہ سے باز رہیں، حضرت عمرو بن العاصؓ ان کا جواب لے کر آئے تو حضرت عمرؓ ان کو دیکھتے ہی ہنسے اور (اپنی ایمانی فراست یا کشف کے ذریعہ) فرمایا:۔ واللہ! مجھے تمہاری سب بات معلوم ہوگئی، اسی طرح گویا میں اُس وقت میں تمہارے ساتھ ہی تھا، حضرت عمرو بن العاصؓ کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو ساری بات کیسے معلوم ہوگئی اور عرض کیا کہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا، واقعہ یہی ہے، پھر حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ جاؤ! خدا کے بھروسہ پر کام شروع کر دو اور ایک سال پورا ہونے سے قبل ہی اس کام کو مکمل کر لو گے، ان شاء اللہ، حضرت عمرو لوٹ کر مصر گئے اور خلیج کھدوائی، جو ”خلیج امیر المومنین“ کے نام سے مشہور ہوئی، اور ایک سال پورا ہونے سے قبل ہی اس میں کشتیاں چلنے لگیں، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لئے غلہ وغیرہ آنے لگا، اور تمام اہل حرمین کو اس سے نفع عظیم حاصل ہوا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد تک وہ خلیج کام دیتی رہی، پھر بعد کے والیوں نے غفلت برتی، تو اس میں ریت وغیرہ اٹ گیا، اور وہ بند ہوگئی، حضرت عمرؓ شام پہنچے تو ایک جگہ آپ کو ایک جھیل یا تالاب سے گزرنا پڑا، آپ اپنے اونٹ سے اتر پڑے، جوتے اتار کر ہاتھ میں لئے، سواری کی نکیل پکڑ کر پانی میں گھس گئے، گورنر شام حضرت ابوعبیدہؓ ساتھ تھے، کہنے لگے امیر المومنین یہ تو آپ نے اس ملک کے لوگوں کی نظروں سے گرانے والی بہت بڑی بات کر دی کہ اس طرح جوتے اتار کر خود سواری کی نکیل پکڑے ہوئے پانی میں گھس گئے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر حضرت ابوعبیدہؓ کے سینہ پر ہاتھ مارتے ہوئے، افسوس وناخوشی کے لہجہ میں درازنفسی کے ساتھ اوہ کہہ کر فرمایا:۔ کاش! تمہارے علاوہ کوئی اور ایسی بات کہتا، حقیقت تو یہ ہے کہ تم سب (اہل عرب) دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل تھے اور سب سے زیادہ گمراہ، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت وسربلندی بخشی اور اب جب کبھی تم خدا کے سوا کسی سے عزت طلب کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کرے گا۔

ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو جعلنی اللہ فداک کہا، آپ نے فرمایا تم اگر میری اتنی زیادہ عزت بڑھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کرے گا۔

(۳/۳۴۵) حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ اگر آسمان سے کوئی ندا کرے کہ اے لوگو! تم سب جنت میں داخل ہو گے بجز ایک شخص کے، تو مجھے خوف ہوگا کہ شاید میں ہی وہ ایک شخص ہوں، اور اگر وہ یہ ندا کرے کہ تم سب جہنم میں داخل ہو گے بجز ایک شخص کے، تو مجھے خدا سے امید ہوگی کہ شاید میں ہی وہ ہوں (ایمان بین الخوف والرجا ہونا چاہیے اور خوف ورجا کی صحیح ترین تعبیر اس سے بہتر کیا ہوسکتی ہے؟!)

حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ یزید بن ابی سفیانؓ[1] الوان واقسام کے کھانے کھاتے ہیں، تو آپ نے برقاء غلام سے فرمایا کہ شام کا کھانا لانے کے وقت مجھے خبر کر دینا، جب اُن کا کھانا آنے کا وقت ہوا تو غلام مذکور نے خبر دی، حضرت عمرؓ پہنچ گئے اور شرعی طریقہ پر اجازت طلب کی، مکان میں گئے تو کھانا لایا گیا، ثرید ولحم حضرت عمرؓ نے بھی ساتھ کھایا، پھر بھنا ہوا گوشت پیش کیا گیا، تو یزید نے ہاتھ بڑھایا مگر حضرت عمرؓ نے ہاتھ کھینچ لیا، اور آپ نے فرمایا:۔ یزید بن ابی سفیان! خدا سے ڈرو! کیا ایک کھانے کے بعد پھر دوسرا بھی کھایا جائے گا۔ واللہ! اگر تم اپنے اسلاف کے طریقہ کی مخالفت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے طریقہ سے دور کر دے گا!

(۶/۳۴۶) اذرعات کے عامل نے بیان کیا کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ ہمارے یہاں آئے، آپ گزی یا دھوتر کا کرتہ پہنے ہوئے تھے، مجھ سے فرمایا کہ دھودو اور پیوند لگا دو، میں نے تعمیل ارشاد کی اور ایک کرتہ قبطی کپڑے کا آپ کے پرانے کرتہ کے ناپ سے نیا سلوا دیا، پھر دونوں کو لے کر حاضر خدمت ہوا، آپ نے نیا کرتہ ہاتھ سے چھو کر دیکھا کہ نرم ہے، فرمایا ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمارا پہلا کرتہ پسینہ کو زیادہ اچھا جذب کرتا ہے۔

حضرت ربیع بن حارثی کا بیان ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ کو موٹے جھوٹے معمولی کھانے اور گھٹیا قسم کے معمولی لباس ووضع قطع کو دیکھ کر آپ کے مرتبہ ومنصب کے خلاف خیال کیا، عرض کیا امیر المومنین ساری دنیا کے لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق آپ کا ہے کہ آپ عمدہ کھانا تناول کریں، بہتر لباس پہنیں اور اعلیٰ قسم کی سواری استعمال کریں، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر قچی اٹھائی اور ربیع کے سر پر مار کر فرمایا:۔ واللہ! تم نے خدا کو خوش کرنے کے لئے بات نہیں کہی بلکہ میرا تقرب حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے، افسوس ہے مجھے تم سے ایسی توقع بالکل نہ تھی، کیا تم جانتے ہو میری اور جن لوگوں کا میں والی بنا ہوں، ان کی مثال کیا ہے؟ عرض کیا، ارشاد فرمائیں آپ نے فرمایا:۔ ایسی مثال ہے کہ کچھ لوگ سفر پر نکلے، اور انہوں نے اپنے کھانے پینے کا سامان اور دوسری سب نقد وجنس ایک شخص کے سپرد کر دی، اور کہہ دیا کہ ان چیزوں کو ہم پر خرچ کرنا، تو کیا ایسی صورت میں اس شخص کے لئے جائز ہوگا کہ ان کی امانتوں میں سے کچھ چیزوں کو اپنے لئے خاص کر لے؟ عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا میری مثال اور ان سب لوگوں کی بھی ایسی ہی ہے جو میری ولایت کے تحت ہیں۔

حضرت عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک دن بہت موٹے کپڑے پہنے ہوئے نماز پڑھائی۔

حضرت سائب بن یزید نے فرمایا کہ میں نے بہت مرتبہ حضرت عمرؓ کے ساتھ رات کا کھانا کھایا ہے، آپ روٹی گوشت کھاتے، پھر ہاتھوں کی چکنائی اپنے پاؤں پر مل لیتے اور فرماتے تھے یہی عمر وآلِ عمر کا رومال ہے۔

(حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ کا بھی یہی معمول ہم نے دیکھا ہے)

حضرت انسؓ نے بتلایا کہ حضرت عمرؓ سب سے پسندیدہ کھانا کھانا نیچے کی تلچھٹ اور بچا کھچا حصہ تھا۔

---

[1] یہ حضرت ابوسفیانؓ کے سب سے اچھے بیٹے تھے، جن کو یزید الخیر بھی کہا جاتا تھا، فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے، حنین میں حضور علیہ السلام کے ساتھ شریک ہوئے تھے اور حضور نے مالِ غنیمت میں سے ایک سو اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی ان کو دی تھی، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو گورنری کا عہدہ دیا تھا، اور خاص طور سے نصیحتیں کی تھیں، رخصت کے وقت پیادہ چل کر ان کی مشایعت فرمائی تھی، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو فلسطین واطراف کی گورنری پر مامور فرمایا تھا اور ان کے بعد ان کے بھائی حضرت معاویہ گورنر بنے تھے (استیعاب ۶۱۰/۶) گویا اوپر کے واقعہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے ایک گورنر کی اصلاح فرمائی تھی، اور اسی طرح آپ بڑے بڑے گورنروں، سپہ سالاروں اور ولاۃ وحکام کی بے جھجک اصلاح فرمایا کرتے تھے،" وکان لا یخاف فی اللہ لومۃ لائم، رضی اللہ تعالیٰ عنہ "مؤلف"

حضرت ابووائل کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے جب کھانا لایا جاتا تو فرماتے تھے میرے پاس صرف ایک قسم کی چیز لاؤ۔

(۶/۳۴۷) حضرت عمرؓ جب کسی دعوتِ طعام میں شرکت کرتے اور کئی قسم کے کھانے لائے جاتے تو سب کو ملا کر ایک قسم بنا لیتے تھے، معلوم ہوا کہ زیادہ پسندیدہ تو یہی تھا کہ صرف ایک قسم کا کھانا ہو لیکن اگر کہیں عام اور بڑی دعوتوں کے موقع پر اپنی اس محبوب عادت کا اظہار مناسب نہ سمجھتے ہوں گے تو خاموشی سے دو تین قسم کے سالن کو ایک بنا لیتے ہوں گے، واللہ اعلم!

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت میں اونی جبہ پیوند لگا پہنتے، کاندھے پر درہ رکھتے، بازاروں میں گھومتے اور لوگوں کو ادب، اخلاق وسلیقہ مندی کی تلقین فرماتے تھے، اور راستوں میں سے گٹھلیاں وغیرہ جمع کر کے ضرورت مند لوگوں کے گھروں میں ڈال دیتے تا کہ وہ ان سے نفع حاصل کریں، حضرت حسنؒ کا بیان ہے کہ خلیفہ ہونے کے زمانہ میں ایک روز حضرت عمرؓ نے جمعہ کا خطبہ پڑھا اس حالت میں آپ کے تہمد پر بارہ پیوند تھے۔

حضرت حفص بن ابی العاص کا بیان ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے ساتھ صبح کا کھانا کھایا کرتے تھے، آپ نے کہا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سُنا ہے فرماتے تھے، حق تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا:۔ ویوم یعرض الذین کفروا علی النار اذھبتم طیبٰتکم الآیہ (یہ آیت بھی اگرچہ کفار کے بارے میں ہے، مگر حضرت عمرؓ اپنے غایتِ تورع وزہد کی شان کے باعث چاہتے تھے کہ ایسی کوئی بات بھی ہم نہ کریں، جس کو حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار کو ملامت کے طور پر کہیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۶/۳۴۸) حضرت عمرؓ شام پہنچے تو آپ کے لئے وہاں کا خاص قسم کا حلوا تحفوں میں پیش کیا گیا، فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا اس کو شہد اور میدہ سے تیار کرتے ہیں، فرمایا:۔ واللہ! میں اس کو مرتے دم تک کبھی چکھوں گا بھی نہیں الّا یہ کہ سب لوگوں کا کھانا ایسا ہی ہو، عرض کیا گیا کہ سب لوگوں کو تو یہ چیز میسر نہیں ہے، آپ نے فرمایا پھر ہمیں بھی اس کی ضرورت نہیں۔

(اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے سامنے علاوہ خاص وتورع وزہد کے یہ چیز بھی نہایت اہم تھی کہ بڑے اور بااقتدار لوگ صرف وہی چیزیں استعمال کریں، جو زیردست عوام وغرباء کو بسہولت میسر ہوں)

بحرین سے حضرت عمرؓ کی خدمت میں مشک وعنبر آیا، فرمایا:۔ کاش! کوئی عورت اچھا وزن کرنے والی ہوتی جو وزن کرتی اور میں اس کو ٹھیک طور پر لوگوں میں تقسیم کر دیتا، آپ کی زوجہ محترمہ عاتکہؓ نے فرمایا میں وزن کرنا اچھا جانتی ہوں لایئے! میں وزن کر دوں گی، آپ نے فرمایا نہیں، پوچھا کیوں؟ فرمایا مجھے ڈر ہے کہ تولتے ہوئے تمہارے ہاتھوں میں جو کچھ لگا رہ جائے گا، اس کو تم اس طرح (اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اپنی کنپٹی اور گردن وغیرہ پر مل لوگی، جس سے اور لوگوں کی نسبت سے میرے حصّہ میں زیادہ آجائے گا، پھر اس کا حساب خدا کے یہاں دینا پڑے گا۔

(۶/۳۵۰) حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے آپ کا نہایت شاندار استقبال کیا تو آپ اونٹ پر سوار تھے، عرض کیا گیا:۔ اس وقت آپ عمدہ گھوڑے پر سوار ہوں تو بہتر ہے کہ ملک شام کے بڑے بڑے عزت ودولت والے آپ سے ملیں گے، آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:۔ کیا بات ہے میں تمہیں وہاں نہیں دیکھتا، کیسی عجیب شان تھی اور ہر وقت کہاں نظر تھی، اور ایک مختصر ترین جملہ میں کتنی بڑی بات فرمادی کہ دوسرا آدمی دس دن میں بھی اتنی بات نہ سمجھا سکتا تھا، واقعی! آپ اس امت کے محدَّث ومکلّم ہی تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ وکثر اللہ امثالہ!

(۶/۳۵۱) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ حضرت عمرؓ کو غصہ آتا اور اس وقت کوئی خدا کا ذکر کرتا، اس کا خوف دلاتا، یا قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھتا تو آپ کا غضب وغصہ کافور ہو جاتا اور آپ اس فعل سے رک جاتے جو کرنا چاہتے تھے (یہ بات بھی نہایت دشوار ہے اور صرف خدا کے نہایت برگزیدہ بندے ہی اس پر عمل کر سکتے ہیں، تجربہ کیا جا سکتا ہے)

(۳۵۲/۶)لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے عرض کیا کہ حضرت عمرؓ سے گفتگو کر کے نرم روی پر آمادہ کریں، کیونکہ ان کی ہیبت ورعب لوگوں پر بہت زیادہ ہے حتیٰ کہ پردے میں رہنے والی کنواری لڑکیاں بھی ان سے ڈرتی ہیں، انہوں نے آپ سے بات کی تو فرمایا:۔ میں ظاہر میں اس سے زیادہ نرمی نہیں برت سکتا، کیونکہ واللہ اگر ان کو میرے دل کی نرمی اور صحت وشفقت کا علم ہوجائے جوان کے لئے ہے تو وہ مجھ پر حاوی ہوجائیں گے اور میرے کپڑے تک بھی بدن پر سے اتار کر لے جائیں گے۔

(اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کا نظم چلانے کے لئے عوام پر رعب کا رہنا بھی نہایت ضروری ہے، ورنہ عوام کالانعام کسی طرح بھی اپنی بے جا حرکتوں سے باز نہیں رہ سکتے، ہاں رعب ودبدبہ کے ساتھ والی وحاکم کے دل میں رعایا کے لئے نہایت محبت وشفقت بھی ضروری ہے چنانچہ حضرت عمرؓ کے اندر دونوں باتیں کمال درجہ کی تھیں، اور درحقیقت ان دونوں وصف میں کمی ساری خرابیوں کی جڑ بنتی ہے)

(۳۵۳)حضرت عمرؓ اونٹ پر سوار ہوکر شام پہنچے تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا، لوگوں کی نظریں ان جباروں کی سواریاں دیکھنا چاہتی ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔

(زمانہ خلافت میں)ایک روز لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا، منبر پر بیٹھ کر حمد وثنا کی پھر فرمایا! اے لوگو! مجھ پر ایسا وقت بھی گزرا ہے کہ کھانے کو کچھ نہ تھا، بجز اس کے کہ بنی مخزوم کی اپنی خالاؤں کے لئے میٹھا پانی پینے کے لئے لادیا کرتا تھا، اور وہ مجھے کچھ مٹھی خشک انگور یا کھجور دیدیا کرتی تھیں اتنا کہہ کر منبر سے اتر گئے، لوگوں نے عرض کیا، اس بات کے بیان کا اس وقت کیا مقصد تھا؟ فرمایا:۔ میرے دل میں موجودہ امارت وخلافت کا خیال کر کے کچھ بڑائی کا سا تصور آیا تھا، چاہا کہ اس واقعہ کو سُنا کر اپنے نفس کو نیچا دکھاؤں، دوسری روایت میں ہے کہ میں ان کی بکریاں چرایا کرتا تھا، جس کے عوض کچھ سوکھی کھجوریں وہ مجھے دیدیا کرتی تھیں۔[۱]

ایک روز سخت گرمی کے وقت سر پر چادر رکھ کر باہر چلے گئے، واپسی پر ایک غلام گدھے پر سوار ملا، اس سے کہا مجھے اپنے ساتھ سوار کرلے، غلام اتر گیا، اور عرض کیا اے امیر المومنین! آپ آگے سوار ہوں، فرمایا، اس طرح نہیں، بلکہ تم آگے بیٹھو، میں تمہارے پیچھے بیٹھوں گا، تم چاہتے ہو کہ مجھے نرم جگہ سوار کرو اور خود سخت جگہ بیٹھو، یہ نہیں ہوسکتا، پھر اس غلام کے پیچھے ہی بیٹھ کر مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے اور سب لوگ حیرت سے آپ کی طرف دیکھتے رہے۔

حضرت زرؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو پاپیادہ عیدگاہ جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک دن دودھ منگا کر پیا، پسند آیا، پوچھا کہاں سے لائے؟ کہا کہ میں ایک چشمہ پر گزرا وہاں صدقہ کے اونٹوں کو پانی پلایا جارہا تھا، ان لوگوں نے ہمیں بھی کچھ دودھ دیدیا، اسی کو میں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور آپ کو پیش کردیا، حضرت عمرؓ نے یہ سُنتے ہی اپنی انگلی منہ میں ڈال کر قے کردی۔

(۳۵۴/۶)ایک دفعہ بیمار ہوئے، صحت کے لئے شہد تجویز کیا گیا، بیت المال میں اس کے کپے موجود تھے تشریف لاکر فرمایا اگر تم سب اجازت دو تو کچھ لے لوں، ورنہ میرے لئے حرام ہے لوگوں نے اجازت دی، حضرت عبدالعزیز بن ابی جمیلہ انصاری نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے کرتہ کی آستین آپ کے ہاتھ کی ہتھیلی سے تجاوز نہ کرتی تھی، حضرت ہشام بن خالد نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ تہمد ناف کے اوپر باندھتے تھے۔

(۳۵۶/۶)فتح شام وغیرہ کے بعد تو قیصرِ روم سے خط وکتابت رہتی تھی، قاصد آتے جاتے تھے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ زوجہ محترمہ (ام کلثوم) نے ایک دینار (اشرفی) کہیں سے قرض لے کر عطر خریدا اور شیشیوں میں بھر کر ملکہ قیصر کے لئے ہدیۂ ارسال کیا، وہاں سے ملکہ نے

---

[۱] (اسی قسم کا دوسرا واقعہ نظر سے گزرا ہے کہ ایک روز آپ کے پاس بہت سے وفود آئے، فارغ ہوکر ایک غریب آدمی کے گھر جا کر پانی بھرا، اور فرمایا:۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا نفس مغرور ہوجاتا، یہ اسکا علاج ہے اس کے علاوہ یوں بھی آپ کی عام عادت تھی کہ امور خلافت کی انجام دہی سے جو وقت بھی بچتا اس میں غریبوں کا کام کرتے تھے اور کاندھے پر مشک رکھ کر بیوہ عورتوں کے گھر جا کر پانی بھرتے تھے، مجاہدین کی بیویوں کے لئے بازار سے سودا سلف خرید کر لادیتے تھے)''مؤلف''

ان شیشیوں میں قیمتی جواہرات بھر کر بھیج دیئے، آپ کی زوجہ محترمہ ان جواہرات کو فرش پر نکال کر دیکھ رہی تھیں کہ حضرت عمرؓ باہر سے تشریف لائے، پوچھا یہ کیا ہے؟ بتلایا تو آپ نے ان سب جواہرات کو فروخت کر کے سب روپے بیت المال میں جمع کر دیئے، اور صرف ایک دینار اپنی زوجہ کو لوٹا دیا (صرف عطران کا تھا، باقی قاصد سرکاری تھا اور اس کے مصارف آمدورفت وغیرہ سب بیت المال ہی سے ادا ہوئے تھے وغیرہ غالباً اسی لئے حضرت عمرؓ نے پوری احتیاط برتی، (واللہ اعلم)!

ایک مخزومی شخص حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ طیبہ پہنچا اور حضرت ابوسفیانؓ کے خلاف استغاثہ کیا کہ انہوں نے میری حدِ ملکیت میں مداخلت کی ہے آپ نے فرمایا میں تمہاری حد کو جانتا ہوں، بسا اوقات بچپن کے زمانہ میں تم اور میں وہاں کھیلا کرتے تھے، جب میں مکہ معظمہ آؤں گا تو میرے پاس آنا جب آپ مکہ معظمہ پہنچے تو وہ حضرت ابوسفیان کو لے کر حاضر ہوا، آپ ان دونوں کے ساتھ اس جگہ گئے اور حضرت ابوسفیانؓ سے فرمایا کہ تم نے حد بدل دی ہے یہاں سے پتھر اٹھا کر وہاں رکھو، انہوں نے کہا واللہ! میں ایسا نہیں کروں گا، آپ نے ان پر درہ اٹھایا اور پھر فرمایا پتھر اٹھا کر وہاں رکھو، حضرت ابوسفیانؓ نے مجبور ہو کر تعمیل کی، حضرت عمرؓ کے دل میں اس واقعہ سے خوشی ہوئی، اور آپ نے بیت اللہ کے کے سامنے جا کر عرض کیا اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے موت نہ دی تا آنکہ میں ابوسفیان پر اس کی خواہشِ نفس کے مقابلہ میں غالب نہ ہو گیا، اور اس کو حکم اسلام ماننے کے لئے مجبور ولاچار نہ کر دیا، اس پر حضرت ابوسفیانؓ نے بھی بیت اللہ کے سامنے حاضر ہو کر عرض کیا یا اللہ! تیرے لئے حمد وشکر ہے کہ مجھے اس وقت تک موت نہ دی کہ میرے دل میں اسلام کی اتنی عظمت محبت نہ آ گئی جس سے میں حضرت عمرؓ کے سامنے اپنے کو ذلیل کر سکا۔

حضرت عمرؓ مکہ معظمہ پہنچے تو اس کی گلی کوچوں میں گشت لگایا اور سب گھر والوں کو حکم دیا کہ اپنے گھروں کے صحنوں کو صاف ستھرا رکھو، حضرت ابوسفیانؓ کے مکان پر بھی گئے اور ان کو بھی یہی حکم دیا، انہوں نے کہا نوکر اور خادم آ کر صاف کر دیں گے، اس کے بعد پھر ادھر سے گزرے اور صحن میں صفائی نہ دیکھی تو فرمایا اے ابوسفیان! کیا میں نے تم کو صفائی کا حکم نہیں دیا تھا، کہا جی ہاں! امیر المومنین ضرور دیا تھا، اور ہم ضرور تعمیل کریں گے مگر ہمارے نوکر وخدام تو آ جائیں، آپ نے ان کو درہ مارا، حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے مارنے کی آواز سُنی تو نکل کر آئیں اور حضرت عمرؓ سے کہا کیا تم ان کو مارتے ہو، واللہ! وہ دن بھی گزرے ہیں کہ اگر تم اس وقت ان کو مارتے تو سارے شہر مکہ میں تمہارے خلاف ہنگامہ کھڑا ہو جاتا، آپ نے فرمایا تم سچ کہتی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کی وجہ سے بہت سی قوموں کو سر بلندی عطا کی ہے اور دوسروں کو پست کر دیا ہے۔

حضرت اسید بن حضیرؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سُنا، آپ فرماتے تھے کہ میرے بعد تمہیں نظر انداز کر کے دوسرے تم سے کم مرتبہ لوگوں کو تم پر ترجیح دی جائے گی، پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایسا ہوا کہ حلّے آئے، آپ نے ان کو تقسیم کیا، اور میرے پاس جو حلّہ آیا وہ مجھے پسند نہ آیا، اور اپنے والد کو دے دیا، میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سامنے سے ایک قریشی جوان گزرا جس پر عمدہ حلّہ تھا، میں نے حضور علیہ السلام کی بات یاد کی اور کہا واقعی حضور نے صحیح فرمایا تھا اور آپ کا قول نقل کیا، وہ نوجوان یہ بات سن کر حضرت عمرؓ کے پاس گیا، اور اس واقعہ سے مطلع کیا، آپ تشریف لائے تو اس وقت بھی میں نماز پڑھ رہا تھا، فرمایا نماز پڑھ لو اسید! جب میں فارغ ہوا تو فرمایا تم نے کیا بات کہی تھی؟ میں نے وہ دہرائی، آپ نے فرمایا، دیکھو وہ حلّہ میں نے فلاں شخص کو دیا تھا، جو بدری، احدی، اور عقبی تینوں فضیلتوں کے مالک ہیں، اس نوجوان نے ان سے اس کو خرید کر پہن لیا، جس سے تم نے خیال کیا کہ میرے ہی زمانہ میں حضور علیہ السلام کی وہ پیش گوئی پوری ہو رہی ہے اسید کہتے ہیں کہ میں نے یہ سُن کر عرض کیا کہ میں نے کہا تو یہی تھا مگر واللہ! اے امیر المومنین! خیال میرا بھی یہی تھا کہ آپ کے زمانہ میں ایسا نہ ہوگا۔

حضرت عکرمۃ بن خالد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے ایک بیٹے عمدہ کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھا کئے، آپ کے پاس آئے تو

آپ نے ان کو درّہ سے مارا، یہاں تک کہ وہ رو پڑے، حضرت حفصہؓ نے کہا آپ نے ان کو کیوں مارا؟ فرمایا میں نے دیکھا کہ اس حالت میں اسکو غرور ہوا، اس لئے چاہا کہ اس کے نفس کو ذلیل کروں۔

(۶/۳۵۷) حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت مقدادؓ میں کچھ جھگڑا ہوگیا، جس میں حضرت عبداللہؓ نے ان کی شان میں گستاخی کے الفاظ کہہ دیئے انہوں نے اس کی شکایت حضرت عمرؓ سے کردی، جس پر آپ نے نذر مان لی کہ عبداللہ کی زبان کاٹ دیں گے، ان کو معلوم ہوا تو ڈرے اور لوگوں کو درمیان میں ڈالا کہ آپ کو اس سے باز رکھیں، آپ نے فرمایا مجھے اس کی زبان کاٹنے دو تاکہ میرے بعد یہ سنت بن جائے، جس پر لوگ عمل کریں کہ جو شخص بھی کسی صحابی رسول اللہ ﷺ کے لئے نامناسب الفاظ استعمال کرے، اس کی زبان کاٹ دی جائے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیت المال صاف کیا تو اس میں ایک درہم ملا، وہ حضرت عمرؓ کے کسی بچہ کے پاس سے گزرے تو اس کو دے دیا، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا، کہا کہ مجھے ابوموسیٰ نے دیا ہے آپ نے ان سے معلوم کیا اور فرمایا کیا سارے شہر مدینہ میں تمہیں میری اولاد سے زیادہ ذلیل مسکین ولاچار کوئی نہ ملا، جس کو دے دیتے، کیا تم نے یہ ارادہ کیا کہ امتِ محمدیہ کا کوئی فرد بھی باقی نہ رہے جو اس درہم کے ناحق لینے پر ہم سے مواخذہ نہ کرے، پھر آپ نے وہ درہم بچہ سے لے کر بیت المال میں ڈلوادیا۔

معلوم ہوا کہ بیت المال کے مال کو غلط طریقہ پر کسی کو دینے سے ساری امت کے افراد قیامت میں لینے والے پر گرفت ومواخذہ کریں گے۔

(۶/۳۶۴) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ پر موت کی غشی طاری ہوئی تو میں نے آپ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا، کچھ ہوش ہوا تو فرمایا میرا سر زمین پر رکھدو، پھر غشی طاری ہوگئی اور ہوش آیا تو آپ کا سر میری گود میں تھا، فرمایا، میں حکم کررہا ہوں تم میرا سر زمین پر رکھدو، میں نے کہا اباجان! میری گود اور زمین میں کیا فرق ہے دونوں برابر ہیں اس پر ناگواری کے ساتھ فرمایا نہیں، جیسا میں تمہیں حکم دے رہا ہوں، تم میرا سر زمین[1] پر رکھدو، اور جیسے ہی میری روح قبض ہو جلدی کر کے مجھے قبر میں پہنچادینا، کہ یا تو میرے لئے بہتری ہے تو جلدی اس تک پہنچ جاؤں گا یا برائی مقدر ہے تو تم اس کو اپنی گردنوں سے جلدی اتار پھینکو گے، رضی اللہ تعالیٰ عنہم ورضوا عنہ!

فائدہ! اوپر ہم نے کنز العمال سے کچھ نقل کیا ہے، جس کو اس وقت زیادہ اہم وضروری سمجھا، ورنہ کنز العمال میں جو مناقبِ عمری دوسری جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں، ان سب پر نظر کرتے ہوئے، ایسا محسوس ہوا کہ اب تک جو کچھ حالات ومناقب اردو کی تالیفات میں ہمارے سامنے آئے ہیں، وہ پورے حالات کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں، چونکہ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعد حضرت عمرؓ کے حالات ہمارے لئے بہت بڑی مشعلِ ہدایت ہیں، اور آپ چونکہ اس امت محمدیہ کے محدَّث تھے، جو نبی ورسول کے بعد ایک امتی کا سب سے بڑا درجہ ہے اس لئے اگر ان کے حالات روشنی میں آجائیں تو امت کو نفع عظیم حاصل ہوسکتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی غالباً اسی لئے آپ کے حالات کا بہت بڑا ذخیرہ ازالۃ الخفاء میں جمع کردیا ہے، تاہم کنز العمال وغیرہ جدید شائع شدہ کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ وسیر سے اور بھی زیادہ حالات مل سکتے ہیں، یہاں ہمیں آپ کے زہد وورع کے سلسلہ میں اتنا اور لکھنا ہے کہ آپ نے اپنے لئے جو طریق زندگی ومعیشت اپنایا تھا، اور اس کا مستدل ان آیاتِ قرآنیہ کو بتایا تھا جو کفار کے حق میں نازل ہوئیں، وہ زہد وورع اور دنیا سے بے رغبتی کا گویا آخری درجہ تھا، جس کا وہ نمونہ پیش کرگئے، لیکن فی نفسہ جواز وحلّتِ طیبات میں شرعاً کوئی شدت نہیں ہے اور درمیانی ومعتدل صورت یہ ہے کہ بلاضرورت طیبات کے تناول سے بھی احتراز کیا جائے کیونکہ حسبِ تحقیق علامہ کاشانی صاحبِ بدائع ودیگر اکابر علماءِ وفقہاءِ دنیا قضاءِ ضروریات کے لئے

---

[1] حضرت ابن عمرؓ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ میرے والد حضرت عمرؓ نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ جب تم مجھے لحد میں رکھو تو میرا رُخسار زمین پر رکھ دینا اس طرح کہ میری کھال اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے (کنز العمال ۶/۳۶۲) اس کی وجہ غالباً حضرت عمرؓ کی غایتِ تواضع تھی اور ساتھ ہی استرحام بھی کہ اس طرح حق تعالیٰ کے رحم ورحمت کی نہایت عاجزانہ التجا تھی، واللہ تعالیٰ اعلم

ہے قضاءِ شہوات کے لئے نہیں، اور آخرت قضاءِ مشتہیات ومرغوبات کے لئے ہوگی، اس کا عکس کفار کے لئے ہے کہ یہاں وہ خوب مزے اڑائیں اور وہاں عذاب وعقاب اور غیر مرغوبات کا ذائقہ چکھیں۔

اصولی بات تو یہ ہے باقی حسبِ ضرورت ایک مومن کے لئے بھی یہاں حلال طریقہ سے حاصل کردہ مرغوبات، مقویات وغیرہ سب جائز ہیں، صرف کسبِ حرام اور تناولِ محرماتِ شرعیہ سے اجتناب واحتراز ضروری وفرض ہے۔

اسی کے ساتھ اگر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ شبع (پیٹ بھر کر کھانا) نہ صرف یہ کہ حسبِ ارشاد حضرت عائشہؓ اسلام میں سب سے پہلی بدعت ہے یہ صحت کے لئے بھی معین ومفید نہیں ہے، اور اگرچہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تصوف کے ایک جز وقلۃ الطعام کے التزام کو زمانہ کے عام انحطاطِ قوی کے باعث غیر ضروری قرار دیا ہے لیکن راقم الحروف کی رائے از روئے طب اب بھی یہ ہے کہ اس جزو کا التزام بدستور باقی رکھا جائے، اور کمی قلت کی تلافی اغذیہ کی لطافت، پھلوں اور مقوی ادویہ کے استعمال سے کی جائے، لطیف اغذیہ، موسمی پھلوں، اور مقوی ادویہ سے بغیر شبع پورے جسم اور خاص طور سے اعضائے رئیسہ وشریفہ انسانی کو کافی قوت وطاقت مل سکتی ہے، اور قلت طعام کے فوائد بھی بدستور اپنی جگہ باقی رہ سکتے ہیں، حضور اکرم ﷺ اور آپ کے اتباع میں صحابہ کرام کی عادتِ مبارکہ پیٹ بھر کر کھانے کی جگہ بطور ناشتہ تھوڑا کھانے کی تھی، اور اس سے بھی زیادہ پسندیدہ ان کو اختیاری فاقہ تھا، یعنی کھانا میسر ہوتے ہوئے بھی اس کو تناول نہ کرنا، اور جب کبھی کھاتا تو وہ بھی بہت کم، جس کو نیم فاقہ کی صورت کہہ سکتے ہیں۔ اندروں از طعام خالی دار نادر دنو ر معرفت بینی!!

غالباً حضرت تھانویؒ کی تشخیص وتجویز مذکور عوام کے لئے ہوگی، ورنہ خواص خصوصاً اہل علم وذکر کے لئے تو قلۃ الطعام سے بہتر اکسیری نسخہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا، دوسرے یہ کہ قلۃ الطعام کی گرفت جتنی ڈھیلی کریں گے، قلۃ المنام والا جزو بھی کمزور ہوتا جائے گا کہ شبع، کثرۃ المنام کو مقتضی ہے آگے صرف دو جزرہ جائیں گے، قلۃ الکلام اور قلۃ الاختلاط مع الانام، اور اس طرح تصوف کے گویا آدھے حصہ سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ وفقنا اللہ تعالیٰ لما یحب ویرضیٰ!

دوسری یہ کہ حضرت عمرؓ کی پوری زندگی تقشف، زہد وقناعت اور انبیاء علیہم السلام کی طرح اختیاری فقر وفاقہ کی تھی اور اپنے اہل وعیال اور زیر اقتدار عمال وگورنروں تک کو بھی انہوں نے اسی زندگی کا عادی بنایا تھا، اس کے باوجود آپ کا دوسروں کے لئے بے مثال جود وسخا اور راہِ جہاد وقتال میں اسلامی فتوحات کے لئے اموالِ عظیمہ کا صرف کرنا بھی ثابت ہے، اسی لئے آپ کے اوپر بیت المال کا اسی ہزار روپیہ قرض ہوگیا تھا، اور اس کے لئے آپ نے حضرت عبداللہ کو بطور وصیت کے فرمایا تھا کہ اس قرض کی ادائیگی کے واسطے میری جائداد وغیرہ فروخت کردینا، اگر اس سے پورا نہ ہو تو میری قوم بنی عدی سے مدد لینا، اس سے بھی پورا نہ ہو تو قریش سے سوال کرنا، ان کے علاوہ کسی سے نہ لینا، پھر فرمایا کہ تم ابھی اس قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لو، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ذمہ داری لی اور حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد دفن ہونے سے قبل ہی انہوں نے اپنی اس ضمانت پر اہل شوریٰ اور چند انصاری حضرات کو شاہد بنالیا، پھر حضرت عمرؓ کے دفن کے بعد دوسرا جمعہ آنے سے قبل ہی انتظام کر کے سارے قرضہ کی رقم خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ کو سپرد کردی اور سب شاہدوں سے دفعِ مال وبراءتِ قرض کی سند حاصل کرلی (کنز العمال ۶/۳۶۲)

چونکہ حضرت عمرؓ کے نجی اور گھریلو زندگی کے بیشتر حالات معلوم نہ ہو سکے، خیال یہ ہے کہ سرکاری مہمانوں کی ضیافت میں اور مسکینوں، حاجت مندوں کی خفیہ امداد میں بہت کچھ وہ اپنی طرف سے اپنی ذمہ داری پر قرض لے کر صرف کرتے رہتے ہوں گے اور یہ بھی ثابت ہے کہ دوسرے مالدار صحابہ سے بھی قرض لیا کرتے تھے، اور شاید اس کی ادائیگی اپنی نجی آمدنی اور بیت المال سے قرض لے کر بھی کردیتے ہوں گے، جس کے باعث آخر عمر تک بیت المال کی اسی ہزار کی خطیر رقم کے مقروض ہوگئے تھے، واللہ تعالیٰ اعلم!

بیت المال سے وظیفہ

واضح ہو کہ شروع زمانہ خلافت میں تو حضرت عمرؓ نے بیت المال سے کچھ لیا ہی نہیں ۱۵ھ سے پانچ ہزار سالانہ مقرر ہوا تھا اور یہ وظیفہ بھی خلافت کی خصوصیت سے نہ تھا کیونکہ تمام بدری صحابہ کو پانچ پانچ ہزار درہم سالانہ ملتے تھے، جیسا کہ فتوح البلدان میں ہے اور اس سے زیادہ سالانہ وظیفہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا تھا یعنی بارہ بارہ ہزار درہم، جو حضرت عمرؓ نے ہی مقرر فرمایا تھا جیسا کہ کتاب الخروج میں ہے۔

خدمت خلق کا جذبہ خاص اور رحم دلی

حضرت عمرؓ ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ سمجھتے، اور ان کی خدمت و نفع رسانی کو اپنا فرض خیال کرتے تھے، چنانچہ ان کا معمول تھا کہ مجاہدین کے گھروں پر جاتے اور عورتوں سے پوچھ پوچھ کر بازار سے ضرورت کی چیزیں لاکر دیتے، کاندھے پر مشک رکھ کر بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچاتے مقام جنگ سے ڈاک آتی تو فوجیوں کے خطوط ان کے گھروں پر جا کر خود پہنچاتے تھے، اور جس گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ ہوتا خود ہی چوکھٹ پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ وہ لکھاتے لکھ دیتے نابینا اور ضعیف لوگوں کے گھروں پر جاتے، ان کی خدمت کرتے تھے اور ان کو یہ بھی خبر نہ ہونے دیتے کہ میں کون ہوں، راتوں کو گشت کر کے شہر کے لوگوں کی حفاظت کا فکر کرتے، اور کسی کو تکلیف و مصیبت میں دیکھتے تو ان کی اسی وقت امداد کرتے، ذمیوں اور کافروں کے ساتھ بھی رحم دلی اور شفقت کا معاملہ کرتے بلکہ آخر وقت تک ان کا خیال رکھا، اور وفات کے وقت ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وصیت فرمائی، عراق عجم کے معرکہ میں حضرت نعمان بن مقرنؓ اور دوسرے بہت سے مسلمان شہید ہوئے، آپ کو خبر ملی تو بہت متاثر ہوئے اور زار و قطار روئے بظاہر مزاج میں شدت اور سختی تھی لیکن دل کے اندر نہایت رحم تھا، اور کنز العمال وغیرہ میں ہے خود فرمایا کہ میں حضور علیہ السلام اور صدیق اکبرؓ کی زندگی میں ننگی تلوار تھا، کیونکہ اس وقت اسی کی ضرورت تھی، وہ دونوں نہایت رحم دل تھے، ان کے بعد مجھے ظاہری سختی اور باطنی نرمی دونوں کا مظہر بننا پڑا، اور اگر میں ظاہر میں بھی نرمی اختیار کرلوں تو لوگوں کی بے راہ روی پر قابو پانا دشوار ہو جائے۔

کہول اہل جنت کی سرداری

احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ اہل جنت کے ادھیڑ عمر والوں کے سردار ہوں گے اور جنت میں ان کے اونچے اونچے محل ہوں گے (ازالہ ۱/۵۸۰)

ترمذی شریف ابن ماجہ، مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ ابوبکر و عمرؓ کہول اہل جنت اولین و آخرین سب کے سردار ہوں گے، بجز انبیاء و مرسلین کے۔ (مشکوٰۃ شریف)

آخرت میں تجلی خاص سے نوازا جانا

احادیث میں ہے کہ حشر کے دن سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ، پھر حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ حق سے معانقہ کریں گے، یہ بھی مروی ہے کہ سب سے اوّل حق تعالیٰ جس سے مصافحہ کرے گا، جس پر سلام پڑھے گا، اور سب سے پہلے جس کا ہاتھ پکڑ جنت میں داخل کرے گا وہ عمر ہیں (ازالہ ۱/۵۹۱)

مناقب متفرقہ حضرت عمرؓ

آخر میں ہم یہاں آپ کے چند متفرق مناقب کا بھی ذکر کر کے بابِ مناقب کو ختم کرتے ہیں (۱) بہت سے صحابہ اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ عمر پر رحم کرے وہ حق بات کہنے سے نہیں چوکتے، اور حق گوئی ہی نے انھیں تنہا کر دیا ہے کہ

ان کا کوئی دوست نہیں (ازالہ ۵۹۳/۱)

(۲) صلح حدیبیہ کے موقع پر معیت بیت کا تذکرہ ۳۱ا مناقب میں ہو چکا ہے، دوسری بیعت فتح مکہ کے موقع پر ہوئی ہے اس میں حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کو بیعتِ نسواں کے لئے منتخب فرمایا تھا، (ازالہ ۵۹۵/۱)

علامہ محدث سہیلیؒ نے لکھا:۔ حضرت ہند بنت عقبہؓ (زوجہ حضرت ابی سفیانؓ) بھی قابل ذکر ہیں کہ یوم فتح مکہ میں انہوں نے بھی اسلام قبول کر کے حضور علیہ السلام سے بیعت کی تھی، آپ صفا پر تشریف رکھتے تھے، اور حضرت عمرؓ آپ سے نیچے کی جانب عقبہ کے اوپری حصہ پر تھے، دوسری قریشی عورتوں کے ساتھ اسلام پر بیعت کے لئے حاضر ہوئیں حضور علیہ السلام کی طرف سے حضرت عمرؓ ان عورتوں سے بات کرتے تھے جب ان سے عہد لیا کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی تو ہند بولیں، تم جانتے ہو اگر خدا کے سوا کوئی اور بھی معبود ہونے کے لائق ہوتا تو تمہارے مقابلہ میں ہمارے ضرور کام آتا، جب کہا کہ چوری نہ کریں گی تو وہ بولیں، کون شریف عورت چوری کر سکتی ہے؟ لیکن یا رسول اللہ! ابو سفیان (میرا شوہر) بخیل آدمی ہے بسا اوقات بچوں کی پرورش کے لئے میں اس کے مال میں سے بغیر اس کی اجازت و علم کے لے لیتی ہوں، یہ جائز ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا مناسب طور پر ضرورت کے مطابق لے سکتی ہو، اس پر حضور علیہ السلام نے آواز پہچان کر فرمایا کیا تم ہند ہو، عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! مجھے آپ معاف کریں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے گا، ابوسفیان بھی اس وقت موجود تھے، کہا تم نے جو کچھ میرے مال میں سے لیا ہے وہ میں نے حلال کیا، پھر جب کہا کہ عہد کرو کبھی زنا بھی نہ کرو گی، ہند بولیں، یا رسول اللہ! کیا شریف عورت ایسا کر سکتی ہے؟! کہا کبھی احکام شرع کے خلاف بھی نہ کریں گی، اس پر وہ بولیں، آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپ بڑے کریم ہیں اور آپ نے بہت اچھی چیزوں کی طرف بلایا ہے جب کہا کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، تو ہند بولیں، واللہ! ہم نے تو اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا، جن کو آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہی بدر کے میدان میں قتل کیا ہے، اس پر حضرت عمرؓ بہت ہنسے۔ (الروض الانف ۲۷۷/۲)

''سیرۃ النبی'' ۵۲۱/۱ میں طبرانی کی نقل اس طرح ہے:۔ مقام صفا میں حضور ﷺ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آئے تھے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ اُن سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آں حضرت ﷺ دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے، آپ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

''خلفائے راشدین'' (مطبوعہ اعظم گڑھ) ۱۱ا میں اس طرح ہے:۔ پھر حضور علیہ السلام حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر مقام صفا پر لوگوں سے بیعت لینے کے لئے تشریف لائے، لوگ جوق در جوق آتے تھے، اور بیعت کرتے جاتے تھے حضرت عمرؓ آں حضرت ﷺ سے قریب لیکن کسی قدر نیچے بیٹھے تھے، آں حضرت ﷺ بیگانہ عورتوں کے ہاتھ مس نہیں کرتے تھے، اس لئے جب عورتوں کی باری آئی تو آپ نے حضرت عمرؓ کو اشارہ کیا کہ تم ان سے بیعت کرلو چنانچہ تمام عورتوں نے ان ہی کے ہاتھ پر آں حضرت ﷺ سے بیعت کی، اس واقعہ سے حضرت عمرؓ کی خاص شان نیابت نبوت کی ظاہر ہوتی ہے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے وصیت فرمائی کہ میرے بعد ان چھ شخصوں میں سے کوئی خلیفہ ہو جن سے حضور علیہ السلام راضی تھے۔ (مسلم)

(۴) موطا امام محمدؒ میں سالم بن عبداللہ کے واسطہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے:۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس کام کا اہل ہے اور مجھے اس پر مقدم ہونے کا حق نہیں تو میرے نزدیک گردن مارنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ میں امیر رہوں، تو جو شخص میرے بعد خلیفہ ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عنقریب اس سے قریب و بعید ہٹا دیئے جائیں گے، اور مجھے خدا کی قسم ہے اگر

لے واضح ہو کہ حضرت الامام ابوحنیفہؒ نے اپنی فقہ کا بڑا مدار قرآن و حدیث کے بعد آثار صحابہ خصوصاً خلفائے راشدین کے آراء و تعامل پر رکھا ہے۔ ''مؤلف''!

میں لوگوں سے اپنے لئے لڑوں (۵) حضرت علیؓ سے بدرجہ تواتر یہ روایت نقل ہوئی کہ امت میں سب سے بہتر حضرت ابوبکرؓ پھر عمرؓ ہیں اس کو نقل کرنے والے اسّی افراد ہیں (ازالہ ۶۰۴/۱) (۶) حضرت ابوبکر بن ابی شیبہ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا قول نقل کیا کہ حضرت عمرؓ نہ قبول اسلام میں ہم سے مقدم تھے اور نہ ہجرت میں، مگر ان کی افضلیت ہم نے اس طرح پہچانی کہ وہ ہم سے زیادہ زہد اور دنیا سے بے رغبتی کرنے والے تھے ازالہ ۹۰۸/۱ زہد وقناعت اور سادگی کے واقعات پہلے ذکر ہوئے ہیں، مورخ ابن خلدون نے کہا جب آپ فتح بیت المقدس کے لئے تشریف لے گئے تو آپ کی قمیص میں ستر پیوند تھے، جن میں ایک چمڑے کا تھا، ایک دفعہ گھر سے دیر میں نکلے وجہ یہ تھی کہ کپڑے نہ تھے، بدن سے اتار کر دھوئے اور سکھائے تب باہر تشریف لائے (۴۰۴/۲) اردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی نمبرا

(۷) مشہور محدث حضرت عمرو بن میمونؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ دوثلث علم لے گئے، یہ مقولہ سن کر حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ دس حصوں میں سے نو حصے علم کے لے گئے محدث دارمی اس کے راوی ہیں (ازالہ ۶۱۵/۱)

(۸) حضرت صدیقؓ نے جب اپنی جگہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ آپ ایسے سخت مزاج کو ہم پر خلیفہ بنا رہے ہیں خدا کو کیا جواب دیں گے؟ تو فرمایا:۔ میں خدا کو جواب دوں گا کہ میں نے آپ کی مخلوق پر آپ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ بہتر آدمی کو خلیفہ بنایا ہے (ازالہ ۶۲۹/۱) ازالۃ الخفاءِ کی دونوں جلدوں میں حضرت عمرؓ کے متفرق طور سے بے شمار مناقب ذکر ہوئے ہیں، ہم یہاں ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کی سیاسی[1] وملکی خدمات وفتوحات وغیرہ کا تذکرہ اردو میں الفاروق اور خلفائے راشدین وغیرہ میں کافی آچکا ہے (اگرچہ بہت سی اہم چیزیں نظر انداز بھی ہوگئی ہیں، اسی طرح فقہِ عمری کا باب ازالۃ الخفاءِ میں اچھی تفصیل کے ساتھ آ گیا ہے، لہٰذا ہم ان دونوں کا ذکر یہاں نہیں کرتے، اور اب صرف موافقاتِ عمری کی تفصیل کرتے ہیں، جن کا تعلق بخاری کی حدیث الباب سے ہے، اور اس کے بعد ملفوظاتِ عمری کے عنوان سے منتخب حصّہ ذکر کر کے اس مقدس تذکرہ کو ختم کر دیں گے۔ ان شاءاللہ تعالیٰ!

موافقاتِ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی تعالیٰ اللہ عنہ

جیسا کہ ہم نے مناقب فاروقِ اعظمؓ شروع کرتے ہوئے، آپ کی شانِ محدّثیت کو اوّل نمبر پر رکھ کر دوسرا نمبر آپ کی موافقاتِ وحی الٰہی کو دیا تھا اور تفصیل کے لئے وعدہ کیا تھا، خدا کا شکر ہے اب اس وعدہ کو پورا کرتے ہیں، درحقیقت جس طرح اس امت محمدیہ میں سے آپ کی خاص ممتاز شان آپ کا محدّثِ امتِ محمدیہ ہونا ہے، اسی طرح دوسرا آپ کا نہایت امتیازی نشان آپ کی آراء مبارکہ کا بہ کثرت وحی الٰہی کے مطابق ہونا بھی ہے جس میں آپ کا کوئی سہیم وشریک نہیں ہے پھر ان موافقات کی تعداد کیا ہے؟

محقق عینیؒ نے لکھا:۔ امام بخاریؒ نے یہاں صرف تین چیزوں کا ذکر کیا ہے لیکن حضرت عمرؓ کی موافقتِ وحی ان کے علاوہ بھی منقول

---

[1] ''ندوۃ المصنفین'' دہلی سے حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط بھی ایک ضخیم جلد میں شائع ہوگئے ہیں، جو نہایت اہم علمی وتاریخی ذخیرہ ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے مؤلف نے پوری کتاب میں کسی صحابی کے نام کے ساتھ تعظیمی لفظ استعمال نہیں کیا، حتیٰ کہ حضرت عمر وابوبکرؓ وغیرہ کے لئے بھی نہیں، اور رسول اللہ علیہ ﷺ کے ساتھ بھی نہیں، ایک مقتدر اسلامی ودینی علمی ادارہ سے ایک مسلمان کی تالیف کی اس طرح اشاعت موزوں نہیں معلوم ہوتی، اگر ہم خود ہی اپنے اسلاف واکابر کی قدر وعظمت نہیں کریں گے تو دوسرے کیوں کریں گے؟! بعض اہل قلم محسن اعظم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ صرف صاد یا صلعم لکھ دیتے ہیں، یہ بھی بہت غیر موزوں اور نامناسب ہے کم سے کم علیہ السلام یا صلعم لکھنا چاہیے کہیں نظر سے گزرا تھا کہ جس شخص نے پہلے صلعم لکھا تھا، اس کا ہاتھ شل ہوگیا تھا، تمام انبیاء علیہم السلام، ان کے اصحاب علماءِ واولیاءِ کرام کے عظیم القدر احسانات سے ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں کہ اُن ہی کے واسطہ سے ہم تک اسلام وعلوم نبوت کی روشنی پہنچی ہے پھر بھی اگر ہم ان کے لئے ایک حرف دعا کے ذریعہ اپنے احسان شناسی کا اظہار نہ کریں تو ہماری یہ بے حسی قابل صد ملامت ہے۔

کتاب مذکور کافی محنت وکاوش سے لکھی گئی ہے، اس لئے اس کے مؤلف وادارہ مذکور مستحق شکر ہیں، مگر ایسے اکابر امت سے متعلق تالیف کا حق درحقیقت علمائے متقین کا تھا، جو جواب ایرادات وضروری تشریحات کی طرف بھی توجہ کرتے، اب اس حیثیت سے جگہ جگہ خلا پایا جاتا ہے۔ ''مؤلف''

ہے، مثلاً اساری بدر کے حق میں فدیہ نہ لینے کی رائے، جس پر آیت ماکان لنبی ان یکون له اسری، یا منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے کی ممانعت ولا تصل علی احدمنهم مات ابدا سے کہ یہ دونوں بخاری میں بھی ہیں، اور آیت ولقد خلقنا الانسان من سلالة (تا) خلقا آخر اتری تو حضرت عمرؓ نے فرمایا فتبارك الله احسن الخالقین پھر اسی طرح یہ آیت ہوکر اتری، حضرت عمرؓ کو تحریم خمر پر اصرار تھا، پھر اسکی حرمت نازل ہوئی حضرت عائشہؓ پر اہل افک نے بہتان باندھا تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کا نکاح حضرت عائشہؓ سے کس کے حکم سے ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم سے، عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں آپ سے تدلیس کا معاملہ فرماتے (کہ غیر طاہرہ مقدسہ کا آپ کے نکاح میں لانا پسند فرماتے) سبحنك هذا بهتان عظیم (خدائے برتر کی ذات ہر برائی سے منزہ ہے اور یہ یقیناً لوگوں کا بہتان عظیم ہے) پھر یہی آیت نازل ہوئی، محب طبری نے اس کو ذکر کیا ہے، اور ابوبکر بن العربیؒ نے فرمایا کہ موافقت گیارہ مواضع میں ہوئی ہے، پھر محقق عینیؒ نے لکھا کہ ترمذی کی حدیث ابن عمرؓ سے تو معلوم ہوا کہ جب بھی کسی معاملہ میں لوگوں کی ایک رائے ہوئی اور حضرت عمرؓ کی دوسری، تو قرآن مجید کا نزول حضرت عمرؓ ہی کی رائے کے موافق ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ موافقت بہ کثرت ہوئی ہے (عمدہ ۲/۳۱۹) حافظؒ نے بھی حدیث ترمذی مذکور نقل کر کے لکھا کہ اس سے بہ کثرت موافقت کا ثبوت ملتا ہے اور بالتعیین ہمیں منقول شدہ ذخیرہ میں پندرہ تک کا علم ہوا ہے (فتح ۱/۳۴۱) ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر درس میں فرمایا کہ تلاش و تتبع سے اس پر زیادتی بھی ممکن ہے (بیس تک؟) راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ زیادتی شاید قرآن مجید کے لحاظ سے مراد ہو، ورنہ حسب تحقیق حضرت شاہ ولی اللہؒ قرآن وحدیث دونوں کی موافقت لی جائے تو یہ عدد بہت بڑھ جائے گا، اور ہم یہاں ۱۲۸ امور میں موافقت ذکر کرتے ہیں، واللہ المیسر وبہ نستعین!

مقام ابراہیم کی نماز

بخاری، مسلم، ترمذی ومسند احمد وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ میں نے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! اگر مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالیا جائے تو بہتر ہے اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی واتخذ وا من مقام ابراهیم مصلی (بقرہ)

حجاب شرعی کا حکم

اس بارے میں کچھ تفصیل انوارالباری ۴/۱۸۹ تا ۴/۲۰۰ وغیرہ میں گزر چکی ہے، یہاں بھی چند اہم امور ذکر کئے جاتے ہیں حجاب شرعی اور پردہ کے احکام جو اس امت محمدیہ کا بڑا طرۂ امتیاز اور فضیلت وکرامت خاصہ ہے اور اس امت آخر الزماں پر قیامت تک عام عذاب الٰہی نہ اُترے اور اس کی جگہ فتنوں کی کثرت کی خبر دی گئی ہے، ان سب فتنوں میں سے بڑا اور مہلک فتنہ عورتوں کے ذریعہ رونما ہوتا ہے، اسی لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دنیا کی فراوانی اور اس کی دل فریبیوں کے جال میں پھنسنے سے بچتے رہنا اور عورتوں کے شر وفتنہ سامانیوں سے بھی خبردار رہ کر اپنا بچاؤ کرنا، اللہ تعالیٰ نے ان آزمائشوں سے گزار کر تمہارا امتحان لیا ہے کہ تم کس طرح نگاہ وقلب کے معاصی سے بچ کر اپنے ایمان واسلام اور اپنے دلوں کے نور کو بچا سکتے ہو اور فرمایا میری امت میں مردوں کے لئے سب سے زیادہ ضرر رساں فتنہ عورتوں کا ہوگا، علامہ نوویؒ نے اس حدیث کے تحت لکھا:۔ مراد یہ ہے کہ عورتوں کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچتے رہنا، اور عورتوں میں اپنی بیویاں بھی شامل ہیں بلکہ اکثری طور پر فتنے بیویوں کی طرف سے پیش آتے ہیں کہ وہ ہر وقت ساتھ ہوتی ہیں اور زیادہ لوگ ان میں مبتلا ہوتے ہیں (نووی شرح مسلم شریف ۲/۳۵۳) محدث کبیر ابن ماجہ نے مستقل باب فتنۃ النساء کا باندھا ہے اور دوسری مشہور احادیث کے ساتھ اس میں یہ روایت بھی نقل کی کہ ہر صبح کو دو فرشتے یہ ندا کرتے ہیں کہ بڑی ہلاکت ومصیبت پیش آنے والی ہے مردوں کو عورتوں کی وجہ سے اور عورتوں کو مردوں کی وجہ سے (۲۸۸)

حجاب شرعی کا حکم درحقیقت حق تعالیٰ کی غیرت کا تقاضہ ہے اسی لئے اس نے فواحش ومنکرات کو حرام قرار دیا اور ان سے بچنے کا اکسیری

نسخہ حجاب وتستر اور غضِ بصر تجویز فرمایا، پھر سب سے پہلے اس نسخہ اکسیر کا استعمال ازواجِ مطہرات اور بناتِ طیبات نبی اکرم ﷺ کو کرایا جو ساری دنیا کی عورتوں میں سب سے زیادہ مکرم ومعظم اور باوجاہت واشرف تھیں، اور ان کے صدقہ وطفیل میں ساری امت کو عطا کیا گیا، ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ حجاب کے احکام تدریجی طور سے اترے ہیں، جن کا ذکر سورۂ نور، سورۂ احزاب، اور سورۂ تحریم میں ہے اور یہ سب احکام حضرت عمرؓ کی بار بار معروضات پر اُترے ہیں بلکہ آپ کی خواہش تو یہ بھی تھی کہ کسی ضرورت ومصیبت کے وقت بھی مومن عورتیں اپنے گھروں کے محفوظ قلعوں سے باہر نہ ہوں، مگر اس کو شریعت نے حرجِ امت کے پیش نظر قبول نہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو مسلمان عورتیں بغیر کسی ضرورت کے یا بلا سخت ابتلاء ومصیبت کے وقت کے گھروں سے نکلتی ہیں وہ حق تعالیٰ کے عتاب وعقاب کی مستحق بنتی ہیں اور حق تعالیٰ، اس کے رسول اور حضرت عمرؓ وغیرہ کی غیرت وحمیت کو چیلنج کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو اس سے محفوظ رکھے،

علامہ بغویؒ نے لکھا کہ آیتِ حجاب (واذا سالتموھن الآیہ) اترنے کے بعد کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ازواجِ مطہرات کو دیکھ سکتا، نہ نقاب کی حالت میں نہ بغیر نقاب کے، اور یہ حجاب کا حکم مردوں اور عورتوں سب کے دلوں کو پاک صاف رکھنے کے لئے تھا کہ شیطانی خیالات پاس نہ آئیں۔ (تفسیر مظہری ۶۷۴/۷)

اگر اس مقدس ترین دورِ نبوت کے پاک باز ومتقی مردوں اور عورتوں سب کے لئے پردہ کے احکام ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے ضروری تھے، تو ہمارے لئے کتنے ضروری ہیں وہ ظاہر ہے، ازواجِ مطہرات کو سورۂ احزاب میں یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تقویٰ اختیار کرو (کیونکہ اس وصف کے ساتھ تمہارے ازواج النبی ہونے کی عظمت وشرف کو چار چاند لگ جاتے ہیں، لہٰذا تم دوسرے (یعنی نامحرم) مردوں سے بات کرنے میں نرم اور دل کش لہجہ میں گفتگو نہ کرنا، ممکن ہے نفس وشیطان سے متاثر ہونے والا کوئی روگی دل والا برا خیال دل میں لا کر اپنی عاقبت خراب کرلے بلکہ حسبِ ضرورت جتنی بات کہو وہ پوری معقولیت لئے ہوئے ہو (تاکہ کھرے لہجہ کی وجہ سے وہ کسی کو گراں بھی معلوم نہ ہو۔)

عورتوں کی آواز میں فتنہ ہے

عورتوں کی آواز میں نرمی نزاکت اور خاص قسم کی دل کشی ہوتی ہے بلکہ بہت سی آوازوں کا فتنہ تو صورتوں کے حسن وجمال سے بھی زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کو خاص طور سے ہدایت ہوئی کہ نامحرم مردوں سے گفتگو میں نرم ودلکش لہجہ اختیار نہ کریں بلکہ مصنوعی طور سے کرختگی پیدا کریں تاکہ عدم جاذبیت کے ساتھ مزاج کا کھرا پن بھی محسوس ہو، اور یہ ان کے لئے ہے جو ضروری بات کرنے پر مجبور ہوں، ورنہ مطلقاً بات کرنے ہی سے احتراز کرنا چاہیے اور ضرورت سے زیادہ لمبی گفتگو تو کسی حالت میں بھی نہ چاہیے، اور اس کے بہت مضر اثرات تجربہ میں آچکے ہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت کی آواز بھی عورت اور قابل ستر ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر امام کو سہو پیش آئے تو اس کو نماز کی حالت میں کسی خطرہ پر دوسرے کو متنبہ کرنا ہو وغیرہ تو مردوں کو سبحان اللہ کہنا چاہیے، اور عورتوں کو تصفیق کرنی چاہیے یعنی داہنے ہاتھ کی ہتھیلی یا انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی پشت پر ماریں اور زبان سے کچھ نہ کہیں یعنی تسبیح وغیرہ، امام بخاری وغیرہ نے مستقل باب کے تحت اس کے لئے احادیث روایت کی ہیں (تصفیق[1] سے مراد تالی بجانا نہیں ہے کہ یہ تو لہو ولعب میں داخل ہے)

ارشاد محقق عینیؒ! عورتوں کے لئے تسبیح اس لئے مکروہ ہے کہ ان کی آواز میں فتنہ ہے اس لئے ان کو اذان، امامت اور نماز میں قراءت بلند آواز سے کرنا جائز نہیں (عمدہ ۱۲/۷/۳)

ارشاد حافظ ابن حجرؒ! عورتوں کو تسبیح سے روکنا اس لئے ہے کہ ان کو نماز میں آواز پست رکھنے کا حکم ہوا ہے کیونکہ ان کی آواز فتنہ کا سبب بن سکتی ہے اور مردوں کو تصفیق سے اس لئے روکا گیا کہ اس کو عورتوں کے لئے موزوں قرار دیا گیا ہے (فتح ۵۰/۳)

---

[1] علامہ شوکانی کا مغالطہ! الفتح الربانی ۱۱۱/۴ میں علامہ کا قول نقل کیا گیا کہ احادیث تصفیق نسواں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کا رد ہونا ہے، جن کے نزدیک تصفیق سے عورت کی نماز فاسد ہوجاتی ہے حالانکہ یہ نسبت غلط ہے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک عورتوں کے لئے حکم یا اجازت تصفیق ہی کی ہے صرف امام مالک سے یہ ایک روایت ہے کہ وہ بھی مردوں کی طرح تسبیح کہیں گی۔ ''مؤلف''

عورتوں کا گھر سے نکلنا

ترمذی شریف میں رسول اللہ علیہ کا ارشاد مروی ہے کہ عورت، عورت ہے جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے ساتھ لگتا ہے یعنی ساری عورت قابل ستر حصہ جسم کی طرح لائق ستر ہے کہ اس کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہیے، پس جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسکو پوری طرح اپنی زد میں لے لیتا ہے، اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ تو ملکہ حُسن ہے اور تجھ سے زیادہ کوئی حسین وجمیل نہیں ہے اور اس خیال کے قائم ہوتے ہی وہ ایسی حرکتیں کرتی ہے جن سے دوسرے لوگ۔ اس کی طرف متوجہ ہیں، مثلاً نزاکت کی چال چلنا، اٹھلانا، اور جذبہ نمائش حسن کے تحت دوسری حرکات، حالانکہ یہ سب امور حرام ہیں (التاج الجامع للاصول ۲۸۹) نیز حضرت میمونہ بنت سعد (خادمہ رسول اللہ علیہ) نے رسول اکرم علیہ کا ارشاد نقل کیا کہ جو عورت اپنے شوہر کے سوا دوسرے مردوں کے لئے بن سنور کران کے سامنے جائے وہ قیامت کے دن اندھیری وظلمت کی طرح ہے جس میں ذرہ برابر بھی نور نہ ہوگا، (ترمذی شریف) چونکہ عورت کا سارا جسم قابل ستر ہے اس لئے اس کا شوہر کے سوا دوسروں کے لئے زینتوں کے ساتھ اپنے حسن وجمال کی رعنائیاں ظاہر کرنا حرام ہے (کیونکہ یہ سب صرف شوہر کے لئے درست بلکہ مستحب وموجب اجر وثواب بھی ہے) لہٰذا عورت کو صرف کسی ضرورت ہی سے باہر نکلنا جائز ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ پوری رکھ رکھاؤ اور شرم وحیاء کا پاس ولحاظ رکھے کہ اس کی کسی حرکت اور چال ڈھال سے بھی دوسرے یہ خیال نہ کرسکیں کہ وہ ان کے برے جذبات کا شکار ہوسکتی ہے اور نہ خوشبو لگا کر نکلے نہ شوقیانہ عورتوں کے اطوار کی مشابہت کرے، کہ یہ سب باتیں خدا اور رسول خدا علیہ کے غصہ وغضب کو دعوت دیتی ہیں۔

(فائدہ) شارح محدث نے مزید لکھا کہ آجکل جو عورتیں کھلے ہوئے سر، چہرے، سینے، ہاتھوں کے ساتھ اور تنگ لباسوں میں باہر نکلتی ہیں یہ شریعتِ محمدیہ کی نظر میں جرم عظیم ہے کیونکہ یہ جاہلیت کے تبرّج کی انتہا ہے، بلکہ پرلے درجہ کی بے حیائی ہے اور اُن قابل ستر اعضاءِ جسم اور مواضع زینت کا اظہار ہے جن کے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے، اور ان کے مردوں پر بھی ان کے گناہوں کا بڑا حصہ ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ وہ اُن کو باہر نکلنے کی آزادی دیتے ہیں کہ جب چاہیں ضرورت بے ضرورت نکل جائیں۔ (التاج ۲/۲۹۰)

حضرت علامہ محدث ومفسر قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے آیت **فلا تخضعن بالقول** کے تحت لکھا:۔ جب ازواجِ مطہرات کی فضیلت تمام عورتوں پر ثابت ہوگئی تو ان کو یہ حکم دیا گیا کہ تقویٰ کے خلاف کوئی بات نہ کریں اور اجنبی مرد سے نرم لہجہ میں بات کرنا بھی تقویٰ کے خلاف ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مرد کے دل میں برا خیال آسکتا ہے اور علامہ جوزیؒ نے نہایہ میں لکھا کہ رسول اکرم علیہ نے مرد کو بھی ممانعت کی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سوا کسی اجنبی عورت سے نرم لہجہ میں بات کرے، جس سے اس عورت کو اس کے بارے میں طمع پیدا ہو اور ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دو اجنبی مرد وعورت کو دیکھا کہ باہم لطف ومحبت کے طریقہ پر بات کر رہے تھے، تو اس شخص نے اس مرد کو مارا اور زخمی کردیا، حضرت عمرؓ کے پاس یہ مقدمہ گیا تو آپ نے اس کی تنبیہ کو درست قرار دیا، طبرانی میں حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم علیہ نے اس امر کی ممانعت فرمائی کہ عورتیں اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر کسی اجنبی شخص سے بات کریں، دار قطنی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم علیہ نے اس کی بھی ممانعت فرمائی کہ کوئی شخص نماز کے اندر یا عورتوں کے سامنے انگڑائی لے، بجز اپنی بیوی یا باندی کے یہ بہت بڑا ادب سکھایا گیا ہے جو شارع علیہ السلام کی نہایت دقتِ نظر پر دال ہے، **الذی فی قلبہ مرض** کے تحت حضرت قاضی صاحبؒ نے لکھا:۔ مرض سے مراد شائبہ نفاق ہے، کیونکہ مومن کامل کا دل ایمان کی وجہ سے مطمئن ہوتا ہے اور وہ برہانِ رب کا مشاہدہ کرتا ہے، لہٰذا وہ حرام چیزوں کی طرف رغبت کر ہی نہیں سکتا البتہ جس کا ایمان کمزور ہوتا ہے تو اس کے اندر شائبہ

نفاق ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کی طرف رغبت کرتا ہے، پھر قاضی صاحبؒ نے مسئلہ لکھا کہ بظاہر کسی سے بات کرنے میں سخت لہجہ اختیار کرنا اخلاق اسلام کے منافی ہے لیکن اس کے باوجود شریعت نے عورت کے لئے اجانب سے گفتگو کے وقت اس بداخلاقی ہی کو مستحب قرار دیا ہے تاکہ دوسری اخلاقی خرابیوں کا سد باب ہوسکے، آگے حضرت قاضی صاحبؒ نے تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ کی تشریح کی ہے کہ پہلے زمانوں میں کیسی کیسی بے حیائی اور عریانی رائج ہوتی تھی، اور شریعت نے ان جیسی چیزوں کو مسلمان عورتوں میں رائج ہونے سے روکا ہے، نیز آپ نے لکھا کہ حضرت نوح وادریس علیہم السلام کے درمیانی ایک ہزار سال کے زمانہ میں کہیں ایک قوم پہاڑوں پر بسی ہوئی تھی اور دوسری نیچے کے میدانوں میں، پہاڑی قوم کے مرد خوبصورت اور ان کی عورتیں بدصورت تھیں اور نشیبی علاقہ کی قوم کے مرد بدصورت اور عورتیں خوبصورت تھیں۔

ابلیس نے ان دونوں قوموں میں جنسی بداخلاقی پھیلانے کو یہ تدبیر کی کہ نشیبی قوم کے اندر جاکر کسی شخص کے پاس نوکری کرلی، اور پھر ایک آلہ ایجاد کر کے اس کے ذریعہ عجیب قسم کی آواز بلند کی، جس سے دور پاس کے لوگ جمع ہونے لگے اور ایک دن سال میں بطور عید کے مقرر کرادیا، جس میں پہاڑوں اور نشیبی علاقوں کے سب مرد وعورتیں جمع ہوتے عورتیں خوب بناؤ سنگھار کر کے آتیں، اور مردوں کا عورتوں کے ساتھ اختلاط ہوکر ان میں فواحش اور جنسی بداخلاقیاں خوب پھیل گئیں، اسی قسم کے جاہلی دور کے سے اختلاطِ مرد وزن اور عورتوں کے بناؤ سنگھار[1] کر کے باہر نکلنے سے شریعت نے روکا ہے (تفسیر مظہری ۳۶۸/۷)

علامہ محقق آلوسیؒ نے لکھا:۔ نرم ودلکش لہجہ میں عورتوں کا مردوں سے گفتگو کرنا بدچلن اور پیشہ ور عورتوں کا شیوہ ہے اور یہ ممانعت کا حکم بعض علماء کے نزدیک بعض ان اجانب تک کے لئے بھی ہے جو کسی عورت کے ابدی محارم میں سے ہوں یا گویا صرف شوہر اور اس جیسے قریبی تعلق والے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، بعض امہات المومنینؓ سے مروی ہے کہ وہ کسی اجنبی سے وقتِ ضرورت بات کرتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا کرتی تھیں تاکہ آواز بگڑ جائے، اور کسی قسم کی نرمی ودلکشی کا شائبہ بھی نہ آئے، اور شوہر کے سوا کسی دوسرے مرد سے بات کرنے میں اکھڑ پن اختیار کرنا عورتوں کے محاسن اور خوبیوں میں سے گنا جاتا تھا، دورِ جاہلیت واسلام دونوں میں ایسا ہی تھا، جس طرح ان کا بخل وجبن بھی محاسن میں سے سمجھا جاتا تھا، اور عام طور سے اشعار میں جو معشوقہ کی تعریف آواز کی نرمی ودلکشی اور دل آویز طرزِ گفتگو کی آئی ہے، وہ گری ہوئی ذہنیت کی ترجمانی ہے (اور اگر یہی وصف اپنے شوہر اور قریبی محارم کے لئے ہو تو محمود بھی ہے)

زمانہ جاہلیت اولی کی تشریح وتفسیر میں لکھا:۔ حضرت مقاتلؒ نے فرمایا:۔ تبرج یہ تھا کہ عورت اپنے سر پر دوپٹہ ڈال کر چھوڑ دیتی اور اس کو آگے روکنے کا اہتمام نہ کرتی تھی جس سے گلا اور سینہ وغیرہ کھلا رہتا تھا (جیسے آج کل گلے میں ڈال کر دونوں سرے کمر پر ڈال لیتی ہیں اور اب سر ڈھانکنے کا اہتمام بھی نہیں رہا حالانکہ وہ گھر کے اندر بھی بہت سے قریبی اعزہ کے سامنے شرعاً ضروری ہے)

میرد نے کہا:۔ ممنوع تبرج یہ ہے کہ عورت اپنے حسن وزیبائش کو ظاہر کرے، جس کا چھپانا ضروری ہے حضرت لیث نے فرمایا:۔ تبرجت المراۃ اس وقت کہا جاتا ہے کہ عورت اپنے چہرہ اور جسم کے حسن وجمال کا مظاہرہ کرے، حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا:۔ تبرج یہ ہے کہ عورت اپنے وہ محاسن ظاہر کرے جن سے مردوں کی رغبت وشہوت ان کی طرف متوجہ ہو پھر علامہ آلوسیؒ نے نمرود کے زمانہ کا بھی ذکر کیا جس میں آبرو باختہ عورتیں باریک کپڑے پہن کر راستوں پر گھوما کرتی تھیں،

---

[1] ہمارے زمانہ میں مسلمان عورتوں کا میلوں ٹھیلوں اور نمائشوں میں شرکت کرنا بھی اسی ممانعت کے تحت آتا ہے، وہاں بے پردگی، اختلاط مرد وزن اور نمائش حسن کے ساتھ غنڈہ گردی اور فساد جھگڑے کا بھی خطرہ رہتا ہے، خصوصاً ایسی جگہوں پر جہاں مسلمانوں کے جان ومال اور عزت آبرو محفوظ نہ ہو اور دوسرے تیسرے درجہ کے شہری سمجھے جاتے ہوں، وہاں تو مردوں کو بھی احتیاط برتنی چاہیے اور عورتوں کو خاص طور سے ایسی جگہوں پر جانے سے روک دینا ضروری ہے۔ واللہ الموفق "مؤلف"

حضرت ابوالعالیہ نے فرمایا:۔حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں نمائش حسن کرنے والی نوجوان لڑکیاں موتیوں سے تیار کی ہوئی قمیص پہنتی تھیں، جن کے دائیں بائیں جانب کے چاک کھلے ہوتے تھے تا کہ دونوں طرف سے اندر کا جسم نظر آئے آج کل ہمارے زمانہ میں برقعہ کی نقاب بھی ایسی ایجاد کی گئی ہے جس میں سے چہرہ دونوں طرف سے نظر آتا ہے اور ساتھ ہی ہاتھوں کی کلائیاں بھی کھلی رہتی ہیں، یہ دونوں باتیں بھی جاہلی تبرج کا نمونہ ہیں مبرد نے بیان کیا کہ دورِ جاہلیت[1] میں عورت شوہر اور اس کے دوست دونوں سے علاقہ رکھتی تھی، شوہر کو آدھے اسفل سے اور دوست کو آدھے اوپر کے حصہ سے تمتع کا حق حاصل ہوتا تھا (روح المعانی ۵)

حضرت عمرؓ کے سلوکِ نسواں پر نقد اور جواب

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کا بار بار حجاب کی فرضیت کے لئے اصرار امتِ محمدیہ میں فتنوں کو روکنے کے لئے کتنا ضروری و مفید تھا، اور وہ در حقیقت ہر قسم کے فتنوں کی روک کے لئے بہت ہی مضبوط و مستحکم دروازہ تھے، اور یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ عورتوں کی فطرت اور ان کی اچھائیوں برائیوں سے واقفیت میں ید طولیٰ رکھتے تھے، بعض کتابوں میں اس قسم کے جملے نقل ہوئے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو عورتوں کے معاملہ میں کوئی ہمدردی نہ تھی، یا ان کے بارے میں نظریہ سخت تھا وغیرہ یہ سب غلط فہمی ہے، جس کا ازالہ ضروری ہے، مثلاً الفاروق ۱۴۳/۲ میں لکھا:۔

''وہ ازواج و اولاد کے بہت دلدادہ نہ تھے، اور خصوصاً ازواج کے ساتھ ان کو بالکل شغف نہ تھا، اس کی وجہ زیادہ یہ تھی کہ وہ عورتوں کی جس قدر ان کی عزت کرنی چاہیے نہیں کرتے تھے وہ ان کو معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے تھے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کا سلوک محبت اور رحم کے پایہ پر نہ تھا جیسا اور بزرگوں کا تھا، اور اہل خاندان سے بھی ان کو غیر معمولی محبت نہ تھی''

افسوس ہے کہ علامہ شبلیؒ یہاں خلاف تحقیق بڑے غیر ذمہ دارانہ جملے لکھ گئے ہیں، البتہ بعد کے حضرات نے ذرا سنبھال کر لکھا ہے، چنانچہ خلفائے راشدین ۱۸۱ میں لکھا:۔''حضرت عمرؓ کو اولاد و ازواج سے محبت تھی مگر اس قدر نہیں کہ خالق و مخلوق کے تعلقات میں فتنہ ثابت ہو، اہل خاندان سے بھی بہت زیادہ شغف نہ تھا'' یہ جملے حقیقت سے بہت قریب ہیں، لیکن علامہ شبلی کا یہ لکھنا کہ حضرت عمرؓ کو ازواج کے ساتھ بالکل شغف نہ تھا، اور عورتوں کی عزت نہ کرتے تھے، یا ان کے ساتھ محبت و رحم کا سلوک نہ کرتے تھے، یہ سب باتیں قطعاً غلط ہیں، حضرت عمرؓ کو اگر ازدواجی زندگی سے دلچسپی نہ ہوتی تو وہ مختلف اوقات میں نو دس عورتوں سے شادی نہ کرتے اور بیک وقت کئی کئی بیویاں ان کے نکاح میں نہ ہوتیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثر بیویاں تیز مزاج بھی تھیں اور ابتداءِ اسلام میں کئی بیویوں کو اس لئے طلاق دینی پڑی کہ وہ اسلام قبول کرنے پر راضی نہ ہوئیں، اور یہ ان کی کج فطرتی کا بڑا ثبوت تھا، جمیلہ بنت ثابت ابن ابی الافلح سے ۷ھ میں شادی کی تھی جن سے عاصم پیدا ہوئے مگر ان کو بھی طلاق دینی پڑی تھی اور حضرت عمرؓ نے عاصم کو اپنے پاس رکھنا چاہا تو ان کی نانی نے جھگڑا کر کے واپس لے لیا تھا (استیعاب ۱۷۱۲/۲) بظاہر یہ طلاق ان کے نشوز کے سبب دی ہوگی، اس کے بعد آپ کے نکاح میں کئی بیویاں تھیں جن کی آپ نے

---

[1] آج کل یورپ و امریکہ کی تہذیب قدیم دورِ جاہلیت سے کوسوں آگے بڑھ گئی ہے کہ ہر جنسی آوارگی حدِ جواز میں داخل ہوگئی ہے، بے حیائی کلاب و خنازیر کی طرح عام ہوگئی ہے کسی شریف اور باعصمت عورت کے گھر سے باہر ہو کر باعصمت رہنا دشوار ہو گیا ہے، برطانیہ میں تو اب عورتوں کے فواحش سے آگے بڑھ کر قوم لوط والی بدترین بداخلاقی کو بھی قانونی جواز دیدیا گیا ہے اور روسی اشتراکیت نے زر زمین و زن تینوں کو متاعِ مشترک قرار دے دیا ہے، غرض دنیا کے تمام نام نہاد ترقی یافتہ ممالک شرائع و اخلاق نبوت کے لحاظ سے دیوالیہ بن چکے ہیں ترقی پذیر ممالک ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اب صرف پسماندہ ملکوں میں آسمانی شریعتوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں کہیں کہیں خصوصاً اسلامی ممالک میں باقی ہیں یا کچھ ان سعید روحوں پر نظر جاتی ہے جو یورپ اور امریکہ میں اسلام قبول کر کے وہاں اخلاق و علوم نبوت کی روشنی پھیلانے میں کوشاں ہیں۔ والامر بید اللہ'' مؤلف''

بنتِ خارجہ سے تعبیر فرمایا تھا، صحیح مسلم ومسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ دردولت نبویہ پر حاضر ہوئے، پہلے سے اور لوگ بھی دروازہ پر موجود تھے جن کو باریابی کی اجازت نہ ملی تھی، حضرت ابوبکرؓ کو اجازت مل گئی، اندر گئے، پھر حضرت عمرؓ آئے، اجازت طلب کی تو ان کو بھی ملی، دونوں نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ کے گرد آپ کی ازواجِ مطہرات بیٹھی ہیں، اور آپ غمگین خاموش بیٹھے ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا میں ضرور ایسی بات[۱] عرض کروں گا، جس سے حضور ﷺ کی فکر و خاموشی ختم ہو اور آپ ہنس پڑیں، چنانچہ کہا یارسول اللہ! کاش آپ (میری بیوی) بنت خارجہ[۲] کو دیکھتے کہ اس نے مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کیا تو میں نے اس کے پاس جا کر اس کا گلا دبایا، (یعنی مرمت کر دی) یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا ان سب کو بھی تم دیکھ رہے ہو یہ بھی مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کر رہی ہیں، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اُٹھ کر حضرتِ عائشہؓ کا گلا دبایا اور حضرت عمرؓ اُٹھ کر حضرتِ حفصہؓ کا گلا دبانے لگے، مسند احمد میں ہے کہ دونوں حضرات، اُن دونوں کو مارنے کے لئے کھڑے ہوئے مگر حضور علیہ السلام نے روک دیا (دونوں) ان سب سے کہہ رہے تھے کہ تم رسول اللہ ﷺ سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہی ہو جو ان کے پاس نہیں ہے، انہوں نے کہا واللہ! آئندہ ہم کبھی آپ سے ایسی چیز کا سوال نہیں کریں گی جو آپ کے پاس نہ ہوگی، پھر حضور علیہ السلام نے ایک ماہ کے لئے ان سب ازواج سے علیحدگی اختیار فرمالی، اور اس کے بعد آیتِ تخییر نازل ہوئی الخ (نووی باب بیان ان تخییر امراتہ لایکون طلاقا الا بالنیۃ ۴۸۰/ اوالفتح الربانی ۲۳۶/۱)

پھر حضرت عاتکہؓ بنتِ زید سے ۱۲ھ میں شادی کی جو نہایت حسین وجمیل تھیں، ان کا پہلا نکاح حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ سے ہوا تھا، ان کی غایتِ محبت جہاد وغیرہ میں شرکت سے مانع ہوئی، تو حضرت ابوبکرؓ نے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا، وہ راضی نہ ہوئے اور اشعار میں شکوہ کیا اور محبت کے ہاتھوں اپنی مجبوری ظاہر کی، اس پر بھی حضرت ابوبکرؓ کی رائے نہ بدلی اور طلاق پر زور دیا، انہوں نے مجبوراً طلاق دیدی اور پھر اشعار میں اپنی بے جرمی اور مظلومی کا اظہار کیا اور پھر حضرت عاتکہؓ کے محاسن بھی گنائے، اور کہا کہ میرے جیسے شخص کو اس جیسی سے چھڑایا جائے یہ بہت بڑا ظلم ہے، اس پر حضرت ابوبکرؓ کا دل نرم ہو گیا اور مراجعت کی اجازت دے دی، اس کے بعد حضرت عبداللہؓ غزوۂ طائف میں شہید ہو گئے اور حضرت عاتکہؓ نے نہایت فصیح و بلیغ اشعار میں ان کا مرثیہ کہا، اس میں یہ بھی قسم کھائی کہ میں آخر دم تک تمہارا غم کرتی رہوں گی، اس کے بعد حضرت عمرؓ کے بھائی حضرت زید بن الخطابؓ سے ان کا نکاح ہوا، وہ یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تو تیسرا نکاح حضرت عمرؓ سے ہوا۔

لطیفہ! دعوتِ ولیمہ میں اکابر صحابہ مدعو تھے، حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے ایک بات کہنے کی اجازت لے کر حضرت عاتکہؓ کو پردہ کے پیچھے سے کہا کہ تمہیں وہ شعر بھی یاد ہے جس میں وہ قسم کھائی تھی، یہ سن کر وہ حضرت عبداللہ کو یاد کر کے رونے لگیں، حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: آپ کو اس موقع پر اُس بات کے یاد دلانے کی کیا سوجھی؟ پھر فرمایا ساری ہی عورتیں ایسا کہتی اور کیا کرتی ہیں، اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کی شہادت ہوئی ان کا بھی بڑا صدمہ کیا، روئیں اور بہت دردناک فصیح و بلیغ مرثیہ کہا، اس کے بعد ان کا چوتھا نکاح حضرت زبیر بن العوام سے ہوا ہے اور ان دونوں کے ساتھ مسجد میں جا کر نماز ادا کرنے پر اختلاف کا قصہ کتاب التمہید میں ذکر ہوا ہے، پھر حضرت زبیر شہید ہوئے تو ان کا مرثیہ بھی کہا ہے ان سب مرثیوں کے چند چند شعر استیعاب میں نقل کئے گئے ہیں، پھر حضرت علیؓ نے بھی نکاح کا پیام دیا تھا، مگر حضرت عاتکہؓ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ اے رسول اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ بھی شہید نہ ہوں، یعنی جس طرح اور سب میرے شوہر شہید ہوئے ہیں اور آپ کی اس وقت امت کو بڑی ضرورت ہے۔ (استیعاب ۷۴۷/۲)

---

۱ علامہ نوویؒ نے لکھا کہ ایسے وقت کسی کا غم غلط کرنے اور اس کو خوش کرنے کا استحباب معلوم ہوا، نیز اس سے حضرت عمرؓ کی فضیلت بھی نکلتی ہے۔

۲ مطبوعہ الفتح الربانی میں بنت خارجہ کی جگہ بنت زید امراۃ عمر ہے، بظاہر صحیح بات صحیح مسلم ہی کی ہے کیونکہ بنت زید (عاتکہ) سے حضرت عمرؓ کا نکاح ۱۲ھ میں (وفاتِ نبوی کے بعد) ہوا ہے۔

جس قصہ کی طرف اوپر اشارہ ہوا وہ یہ ہے کہ حضرت عاتکہؓ مسجد نبوی میں جا کر نماز با جماعت پڑھنے کی عادی تھیں، جس کو حضرت عمرؓ پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ وہ عورتوں کے لئے گھروں میں رہنے کو ہی بہتر سمجھتے تھے اور حضور علیہ السلام نے چونکہ ایک دفعہ یہ فرمایا تھا کہ اللہ کی بندیوں کو مسجدوں کی نماز سے نہ روکو، اس ارشاد سے حضرت عاتکہؓ فائدہ اٹھاتی تھیں، حالانکہ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ عورتوں کی نماز گھروں میں زیادہ بہتر ہے حتی کہ مسجد نبوی کی نماز سے بھی، معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ حجاب نسواں کے بارے میں بہت سخت تھے، اور عورتوں کی فطرت جانتے تھے کہ ان کا پاؤں گھر سے نکلا تو پھر رُکنے والا نہیں، ساتھ ہی زمانہ کے فساد سے بھی واقف تھے کہ دن بدن اخلاقی گراوٹ بڑھ رہی ہے، یہ بھی جانتے تھے کہ پہلے زمانہ میں بنی اسرائیل کی عورتوں کو بھی مساجد کی نماز سے روک دیا گیا تھا، ان سب حالات میں ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عاتکہؓ کے مسجد آنے جانے کو کتنا کچھ ناپسند کیا ہوگا، مگر حضور علیہ السلام کے ارشاد مذکور کی ظاہری مخالفت بھی کسی طرح گوارہ نہ تھی اس لئے اس کو حکماً روک دینا پسند نہ کرتے تھے اور حضرت عاتکہ کہتی تھیں کہ آپ مجھے حکم دیں گے تو میں رُک جاؤں گی، پھر یہی صورت بعد کو حضرت زبیرؓ کو بھی پیش آئی ہے کہ وہ بھی حضرت عاتکہؓ کا مسجد جانا پسند نہ کرتے تھے اور وہ جاتی تھیں اور یہی کہتی تھیں کہ آپ حکم دیں گے تو رُک جاؤں گی۔

اس قصہ سے واضح ہوا کہ حضرت عمرؓ عورتوں کے معاملہ میں بہت زیادہ حلیم تھے کہ اپنی ذاتی رائے ورجحان کے خلاف حضرت عاتکہؓ کا مسجد جانا گوارہ کیا، حالانکہ حضرت عاتکہؓ کا استدلالی پہلو نہایت کمزور تھا، اور یوں بھی نوافل و مستحباب کے عمل وترک میں شوہر کا اتباع شرعاً مطلوب ہے (صرف فرائض وواجبات کے خلاف شوہر کا اتباع درست نہیں) اور مسجد میں جانا تو فرض وواجب کیا مستحب کے درجہ میں بھی نہ تھا پھر بھی حضرت عمرؓ ایسے با اصول اور باوقار شوہر کے مقابلہ میں اپنی مرضی کا کام کرتے رہنا، اس امر کی بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ دوسرے صحابہ سے زیادہ عورتوں کے معاملے میں نرم اور رحم دل تھے، جبکہ ان کی سختی اور تشدد ہر معاملہ میں مشہور ومعروف ہے۔

ان کے علاوہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی ام کلثوم کو بھی پیام دیا تھا، جو حبیبہ بنت خارجہ کے بطن سے تھیں، مگر انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا کہ حضرت عمرؓ بڑے غیرت والے اور معاشی تنگی کے ساتھ گزارہ کو پسند کرنے والے ہیں، حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا تو ان کا خیال چھوڑ دیا (استیعاب ۵۱۱/۴)

دوسری ام کلثوم نامی حضرت علیؓ وحضرت فاطمہؓ کی صاحبزادی تھیں، ان کے لئے حضرت علیؓ کے پاس پیام بھیجا تو انہوں نے صغرسنی کا عذر کر کیا، آپ نے فرمایا، میں خاندانِ نبوت سے قریبی تعلق پیدا کرنا چاہتا ہوں، اور جتنی قدر وعزت میں ان کی کر سکتا ہوں، دوسرا نہیں کرے گا حضرت علیؓ نے فرمایا میں اس کو تمہارے پاس بھیجوں گا، اگر تمہیں پسند ہو تو میں نے نکاح کر دیا، پھر ایک چادر دے کر بھیجا اور کہا حضرت عمرؓ سے کہنا کہ یہ چادر ہے جس کے لئے میں نے آپ سے کہا تھا، حضرت ام کلثومؓ نے وہی بات جا کر کہہ دی، حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم جا کر حضرت علیؓ سے کہہ دینا کہ میں راضی ہوں اور چونکہ پسندیدگی کی شرط پر حضرت علیؓ کی طرف سے نکاح کی منظوری ہو چکی تھی، حضرت عمرؓ نے بیوی بن جانے کے سبب سے بے تکلفی کی بات کی تو ان کو ناگوار ہوئی، اور جا کر حضرت علیؓ سے شکایت کی، انہوں نے سب قصہ سُنایا اور کہا کہ تم ان کی بیوی ہو چکی ہو، پھر حضرت عمرؓ نے اکابر صحابہ کو بلا کر اس واقعہ سے مطلع کیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سُنا تھا قیامت کے دن ہر نسب وسبب منقطع ہو جائے گا بجز میرے نسب وسبب اور دامادی رشتہ کے، تو میرا نسب وسبب تو حضور سے متصل تھا ہی، چاہا کہ دامادی رشتہ بھی ملحق کر لوں، اس پر سب نے آپ کو مبارک باد دی، آپ نے مہر چالیس ہزار درہم مقرر کیا تھا (استیعاب ۷۶۲/۲)

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں بھی عورتوں کے تفقدِ احوال اور خبر گیری کا پورا حق ادا کیا ہے اور کتنی ہی بیواؤں کے گھر جا جا کر ان کے کام اور ضرورتوں کا خیال کیا کرتے تھے، پھر یہ کہنا کہ کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ وہ عورتوں کی عزت نہیں کرتے تھے، یا ان کا سلوک محبت ورحم کے پایہ نہ تھا،

علامہ شبلی کے استدلال پر نظر

علامہؒ نے آگے بڑھ کر اپنے استدلال میں جو بخاری کی حدیث باب اللباس (۸۶۸) کی پیش کی ہے وہ اس وقت ہمارے سامنے ہے، افسوس ہے کہ کئی جگہ عبارت کا ترجمہ غلط کیا ہے اور پوری بات بھی پیش نہیں کی ہے، جس سے مغالطہ لگتا ہے آپ نے لکھا کہ خود حضرت عمرؓ کا قول بخاری میں مذکور ہے پھر ترجمہ اس طرح کیا:۔ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے، جب قرآن نازل ہوا، اور اس میں عورتوں کا ذکر آیا تو ہم سمجھے کہ وہ بھی چیز ہیں حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جب اسلام آیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا تو ہم نے اس کے ذریعہ ان کے حق کو سمجھا بوجھا جوان کا ہم پر ہے بغیر اس کے کہ اپنے معاملات میں بھی ان کو دخل دیں یعنی اسلامی ہدایات کی روشنی میں ہم نے ان کے حق و مرتبہ کو پہچان لیا، پھر بھی یہ حق ہم پر عائد نہیں ہوا کہ اپنے دوسرے معاملات میں سے بھی کسی امر میں ان کو دخیل کریں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کوئی چیز ہیں کسی موجودہ لفظ کا ترجمہ نہیں ہے اور اس کو علامہؒ نے اپنی طرف سے لکھدیا، اور جو لفظ حدیثِ بخاری میں ہیں وہ بہت اہم اور معنی خیز ہیں، چنانچہ آگے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ (اس کے بعد) کسی معاملہ میں میری اپنی بیوی سے کچھ بات ہوئی تو وہ سخت کلامی سے پیش آئی، میں نے اس پر کہا کہ اوہو! تم اتنی دور تک پرواز کرنے لگیں!

اس نے کہا کہ تم مجھ سے ایسا کہتے ہو حالانکہ تمہاری بیٹی تو نبی اکرم ﷺ کو ایذاء پہنچاتی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اتنا سن کر حفصہؓ کے پاس گیا اور اس سے کہا میں تجھے خدا اور خدا کے رسول کی نافرمانی کے برے انجام سے ڈراتا ہوں اور ایذاء نبوی سے گھبرا کر سب سے پہلے حفصہؓ ہی کے پاس پہنچا تھا (دوسرا مطلب تقدمت الیھا فی اذاہ کا علامہ محدث عینیؒ نے یہ بیان کیا کہ میں نے غصہ کے عالم میں حفصہ کی بابت سنی ہوئی بات پر اس کو مار پیٹ وغیرہ کی سزا بھی دینی چاہی، عمدہ ۲۰/۲۲ حافظؒ نے یہاں اس اہم جملہ کی کچھ شرح نہیں کی)

ترجمہ کی غلطی! علامہؒ نے ترجمہ یہ کیا کہ "ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو سخت کہا، انہوں نے بھی برابر کا جواب دیا" حالانکہ حدیث سے سخت کلامی کا صدور حضرت عمرؓ کی بیوی کی طرف سے ثابت ہوتا ہے، پھر یہ کہ حضرت عمرؓ نے تو اسلام سے پہلے کی بات بتلائی تھی اور وہ بھی صرف اپنی نہیں بلکہ سب ہی کے متعلق بتلایا تھا کہ پہلے ہم عورتوں کا کچھ حق و مرتبہ نہ سمجھتے تھے، اور اسلام کے بعد سمجھے، تو اس بات کو حضرت عمرؓ کے خلاف استدلال میں پیش کرنے کا کیا جواز ہے، دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ کے ارشاد مذکور بخاری سے معلوم ہوا کہ اسلام کے بعد عورتوں کا حق و مرتبہ تو مان لیا گیا، لیکن مردوں کے دوسرے معاملات میں دخل دینے کا ان کو حق حاصل نہ ہوا تھا، پھر کسی معاملہ میں ان کے دخل دینے اور گفتگو میں سخت کلامی پر اُتر آنے کا جواز تو کسی طرح بھی نہ تھا، دوسرا واقعہ علامہ شبلیؒ نے موطا امام مالکؒ سے حضرت جمیلہ کے مطلقہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کا اپنے بچہ عاصم کو گھوڑے پر اپنے ساتھ سوار کر کے قبا سے مدینہ منورہ لے آنے کا لکھا ہے یہاں بھی عاصم کی ماں کو خبر ہونا اور مزاحم ہونا غلط ترجمہ کیا ہے، کیونکہ حضرت عاصم کی نانی نے مزاحمت کی تھی، ماں نے نہیں اور جھگڑے کے طول کھینچنے کی بات بھی اضافہ قصہ صرف اتنا ہے کہ حضرت عمرؓ قبا گئے تھے صحنِ مسجد قبا میں عاصم کھیل رہے تھے جو ۴ یا ۶ سال کے تھے، حضرت عمرؓ نے پدری شفقت کی وجہ سے ان کا بازو پکڑ کر گھوڑے پر سوار کر لیا، نانی نے چاہا کہ اپنے ساتھ رکھیں، انہوں نے اور حضرت عمرؓ نے خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے یہاں مرافعہ کیا اور ہر ایک نے اپنا پرورش کا حق جتلایا، آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ بچہ نانی ہی کو دے دو، حضرت عمرؓ نے اس پر کوئی رد و کد نہیں کیا امام مالکؒ نے اس پر فرمایا کہ میں بھی یہی مسلک اختیار کرتا ہوں کہ باپ کے مقابلہ میں پرورش کا حق نانی کو زیادہ ہے۔ (زرقانی ۴/۲۳۷)

شارح موطا محدث زرقانیؒ نے فما راجعه عمر في الكلام کا مطلب لکھا کہ حضرت عمرؓ نے حق بات کو مان کر بچہ نانی کو دے دیا، علامہ شبلیؒ نے لکھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے خلاف فیصلہ کیا اور اس لئے وہ مجبور رہ گئے، معلوم نہیں یہ مجبوری کی بات کہاں سے نکال لی گئی؟

یہ بھی شارح مذکور نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ سے طلاق ملنے کے بعد حضرت جمیلہ نے یزید بن جاریہ سے شادی کرلی تھی، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ اس لئے بھی حضرت عمرؓ اپنے بچہ کو ساتھ رکھنا چاہتے ہوں کیونکہ دوسرے عقد کے بعد پہلے بچہ کی ماں کی توجہ عام طور سے کم ہوجایا کرتی ہے اگرچہ شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے، اور شرعاً بہرصورت بچہ کی پرورش کا حق پہلے ماں اور پھر نانی کا ہی مقدم ہے، البتہ لڑکا سات سال کا ہوجائے گا اور لڑکی سیانی یا نو سال کی تو باپ ان کو لے سکے گا، یعنی اس عمر کے بعد ماں اور نانی کو اپنے پاس رکھنے کا حق ختم ہوجاتا ہے، وغیرہ (کتاب الفقہ ۴/۵۹۸)

ممکن ہے ہمارا مذکورہ ریمارک کچھ طبائع پر گراں ہو، یا ہماری اس جسارت کو خطاءِ بزرگاں گرفتن کا مصداق سمجھیں اس لئے گزارش ہے کہ بخاری اور موطا امام مالکؒ کی عبارت سامنے رکھ کر فیصلہ کریں تو بہتر ہے، ہم خدانخواستہ علامہ شبلیؒ کی اہم علمی، مذہبی و تاریخی خدمات کے منکر ہرگز نہیں ہیں بلکہ ان کی پوری وسعتِ قلب کے ساتھ قدر کرنے والوں میں سے ہیں، جزاہم اللہ خیر الجزاء، لیکن غلطی تو جس کی بھی اور جو بھی ہو اس کی نشاندہی کرنی ہی پڑے گی اگر ہم حضرت عمرؓ ایسی ملت کی عظیم ترین اور جامع کمالات شخصیت کو بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہوکر گرادیں گے تو امت کی مثال بے ستون قلعہ کے ہوجائیگی، اگر ہماری دماغی سانچے اور زاویے، صحابہ وسلف کے دماغی سانچوں اور زاویوں سے مختلف ہیں اور ہم ان کے فکر ونظر کے تابع و مطابق ہوکر نہیں بلکہ مخالف طریقے پر سوچتے سمجھتے ہیں اور اسی لئے ان پر تنقید کی راہ اپناتے ہیں تو یہ دین وعلم کی صحیح خدمت نہیں ہوسکتی، وہی بات اب ترقی کرکے صحابہ وسلف پر تنقیدی بحث کھولنے کا بڑا سبب بن گئی ہے، اور شیعی بھائیوں کی طرح سے سُنّی بھی نیم تبرائی بننے کے قریب ہوگئے ہیں۔

صحابہ کرام معیارِ حق ہیں یا نہیں؟

آج کل یہ بحث بہت چل رہی ہے حالانکہ نہ کبھی پہلے زمانہ میں صحابہ کے اقوال وافعال کو قرآن مجید وحدیث کے درجہ میں رکھا گیا اور نہ اب کوئی سمجھتا ہے لیکن صحابہ وسلف کے تعامل کو نظر انداز بھی کبھی نہیں کیا گیا اور نہ صحابہ پر تنقید کا دروازہ کھولا گیا، پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ خود رسولِ اکرم ﷺ نے خلفائے راشدین اور خاص طور سے حضرت ابوبکر وعمرؓ کے طریقہ کی پیروی کا حکم دیا ہے اور اپنے سارے صحابہ کو عدول فرمایا، لیکن بعض حضرات نے کسی معاملہ میں اپنی رائے کے خلاف دیکھا تو اکابر صحابہ کو بھی تنقید سے نہ بخشا اس کی مثالیں بہت ہیں لیکن موضوع بحث کی مناسبت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ کی ہوا سے متاثر ہوکر معاملہ نسواں میں مساواتِ مرد وزن کا نظریہ اپنا کر اور اس کو اسلامی نظریہ قرار دے کر امیر المومنین حضرت عمرؓ تک کے طرزِ عمل کو مجروح بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اس کیلئے احادیث کا ترجمہ تک غلط طرز میں پیش کیا ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، اس کے بعد علامہ ابوالکلام آزاد آئے تو انھیں یہ امر نہایت ناگوار تھا کہ عورتوں کی طرف اخلاقی کمزوریوں یا کید ومکر وغیرہ کی نسبت کی جائے، اور اپنے خاص نظریہ کو قرآن مجید کی سورۂ یوسف کی تفسیر خصوصاً آخری طویل نوٹوں میں لکھ کر احقاقِ حق کا نمونہ دے گئے یعنی جس سورت کا بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک نہایت پاکباز مرد، عورت کے مکر وکید کے جال میں گرفتار ہوکر کیسی کیسی سخت آزمائشوں سے گزر سکتا ہے اور سبق دیا گیا تھا کہ مرد کو ہر حالت میں ثابت قدم رہنا ضروری ہے، اسی کی تفسیر میں یہ بتلانا ضروری سمجھا کہ قرآن مجید کی رو سے کسی وصف میں بھی مرد وعورت کی تفریق نہیں، نہ کسی وصف میں کسی کو دوسرے پر فضیلت ہے دونوں میں اخلاقی مساوات موجود ہے اور اگر تفریق ہی کرنی ہے تو نفس پرستیوں اور مکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصہ میں آئے گی اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لئے ثابت ہوگی، فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا کید ہے جو پہلے اس کا مجوئیوں کا آلہ بناتا ہے اور جب بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس معصوم کے سر ڈال دیتا ہے، دنیا میں کوئی عورت بُری نہ ہوتی اگر مرد اسے بُرا بننے پر مجبور نہ

کرتا، عورت کی برائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو، لیکن اگر جستجو کرو گے تو تہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا، اور اگر اس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو ان برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا، جو کسی نہ کسی شکل میں اس کی پیدا کی ہوئی ہیں (ترجمان ۲۶۶/۲) کیا علامہ مرحوم کے معتقدین و مستفیدین میں سے کوئی صاحب جستجو کر کے بتلا سکتے ہیں کہ سورۂ یوسف کے واقعہ میں مرد کا ہاتھ کسی کو دکھائی دیا گیا یا نہیں، اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو ایسے بے معنی لمبے لمبے دعووں سے آخر کیا فائدہ نکلا؟

آگے علامہ مرحوم نے ایک دوسری خلش کو بھی دور کر دیا اور لکھا:۔ تورات میں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ترغیب حضرت آدم علیہ السلام کو حضرتِ حوا نے دی تھی، اس لئے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اٹھایا وہ عورت کا تھا، اور اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ برائی اور نافرمانی ہے اور وہی مرد کو سیدھے راستے سے بھٹکانے والی ہے، لیکن قرآن نے اس قصّہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی، بلکہ ہر جگہ اس معاملہ کو آدم وحواء دونوں کی طرف منسوب کیا۔

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ یہ ان حضرات کا عجیب حال ہے کہ جہاں ضرورت دیکھتے ہیں صرف قرآن مجید کا ذکر کر کے بات ختم کر دیتے ہیں، اور احادیث یا آثارِ صحابہ وسلف سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں، حالانکہ مولانا آزاد مرحوم تو اہلِ حدیث تھے اہل قرآن یا چکرالوی نہ تھے لیکن یہ دیکھا گیا کہ فقہاء و مجتہدین خصوصاً امام اعظم کا مسلک گرانے کے لئے تو حدیث سامنے کو دیتے ہیں اور جب نئے لوگوں کے سامنے کوئی خاص جدید نظریہ پیش کرتے ہیں تو صرف قرآن مجید کا حوالہ دیتے ہیں، یہاں شجرِ ممنوعہ والی اوپر کی بات صرف تورات سے نہیں بلکہ حدیث سے بھی ثابت ہے، جس کی روایت مشہور مسلم مفسر ومحدث حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں علامہ محدث ابن جریرؒ کے واسطہ سے نقل کی ہے، اور یہ دونوں مفسر ومحدث وہ ہیں جن کی توثیق وبرتری کے مولانا آزاد بھی قائل تھے، اور آپ نے مقدمہ تفسیر ترجمان القرآن میں ان کے مقابلہ میں دوسرے مفسرین کو مرتبہ اعتبار سے گرانے کی بھی سعی فرمائی ہے، یہ رعایت حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے شجرہ ممنوعہ کا پھل کھالیا تو حق تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوا کہ تم نے باوجود میری نہی وممانعت کے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حواء نے مجھے اس پر آمادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کے لئے سزا یہ ہے کہ حمل ووضع میں تکلیف اٹھائے گی، چنانچہ وہ اس تکلیف کے وقت روئیں اور کراہیں تو ان کو کہا گیا کہ یہ رونا کراہنا نہ صرف تمہارے لئے بلکہ تمہاری اولاد کے لئے بھی ہوگا (تفسیر ابن کثیر ۲۰۶/۲ و تفسیر مظہری ۵۷/۱) یہ روایت بھی بخاری ومسلم کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ سڑا کرتا اور حضرت حواء نہ ہوتیں تو کبھی کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی (مشکوٰۃ ۲۸۰ باب عشرۃ النساء) بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ من وسلوٰی کا ذخیرہ نہ کریں۔

مگر انہوں نے خدا پر بھروسہ نہ کیا اور گوشت سڑنے لگا، یہ ان کی نافرمانی کی سزا تھی ورنہ اس سے پہلے نہ سڑتا تھا اور حضرت حواءؑ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ترغیب دے دے کر شجرۂ ممنوعہ کھانے پر آمادہ کیا، اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر کو غلط کام کے لئے آمادہ نہ کرتی (مرقاۃ)

مولانا کا استدلال اس سے بھی ہے کہ قرآن مجید نے اس معاملہ کو دونوں کی طرف منسوب کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ نافرمانی دونوں نے کی، اس لئے دونوں کی طرف اس کو منسوب ہونا ہی تھا، اس سے اس امر کی نفی کیسے نکل آئی کہ شیطان نے ورغلانے کی کوشش تو دونوں کے لئے کی مگر پہلے حضرت حواء متاثر ہوئیں اور انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی متاثر کر کے آمادہ کر لیا ہوگا، جیسا کہ اب بھی بیویوں کے ذریعہ شوہروں کو کسی کام کے لئے آمادہ کرنے کی مہم سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور جو کام مردوں کے ذریعہ انجام نہیں پاتے بہت آسانی سے عورتوں کے وسیلہ سے مردوں کو ان کے لئے ہموار کر لیا جاتا ہے۔

آخر میں مولانا نے لکھا:۔ بہر حال! یہ بات یاد رہے کہ سورۂ یوسف کی اس آیت سے جو استدلال کیا جا رہا ہے وہ قطعاً بے اصل ہے اور جہاں تک عورتوں کے جنسی اخلاق کا تعلق ہے قرآن مجید میں کہیں کوئی ایسی بات موجود نہیں ہے جس سے مترشح ہوتا ہو کہ عورت کی جنس مرد سے

فروتر ہے یا بے عصمتی کی راہوں میں زیادہ مکار اور شاطر ہے (ترجمان ۲/۲۶۷)

عرض ہے کہ اگر سورۂ یوسف کے قصہ سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ عورت بے عصمتی کی راہوں پر چل پڑے تو اس کے کید و مکر کے جال سے کوئی فرشتہ یا نبی معصوم ہی بچ سکتا ہے تو بچے دوسرے عام مردوں کا کام نہیں، تو یوں کہیے کہ دنیا میں کوئی بات بھی ثابت نہیں کی جا سکتی۔

جس جنسِ لطیف کے مکر و کید کی بے پناہ اور بھیانک دار و گیر کا یہ عالم ہو کہ اس سے سخت گھبرا کر حضرت یوسف علیہ السلام جیسا آہنی عزم و حوصلہ والا جلیل القدر پیغمبر بارگاہِ خداوندی میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہو گیا ہو کہ اے میرے رب! قید و بند کی مصیبت میں مبتلا ہو جانا میرے لئے اُس عمل سے ہزار جگہ زیادہ عزیز و پسندیدہ ہے جس کی طرف وہ مجھے بلا رہی ہیں اور اگر آپ نے (میری مدد نہ کی اور) ان عورتوں کی مکاریوں کے دام سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں ان کی طرف جھک پڑوں اور جاہلوں کی طرح غلط روش کا شکار ہو جاؤں، اس پر حق تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعاءِ مذکور قبول فرمالی اور ان عورتوں کی مکاریاں دفع کر دیں، بیشک وہی سب کی سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے کیا اس کے باوجود صاحبِ ترجمان کا اوپر کا دعویٰ کسی طرح بھی صحیح ہو سکتا ہے؟!

اگر یہ کوئی اچھا وصف ہے کہ آدمی اپنے خداداد زورِ تقریر و تحریر سے سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ ثابت کر دے تو ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں کہ مولانا آزاد میں یہ وصف موجود تھا، واللہ المستعان!

مولانا مودودی! ہم اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ مساواتِ مرد و زن کے اصول کو علامہ مودودی بھی اپنائے ہوئے ہیں وہ بھی نہیں چاہتے کہ عورتوں کی کسی سرشت یا عادت کو بُرا کہا جائے، حالانکہ ہم اگر مردوں کی بہت سی بُری عادات خصائل و اخلاق کے اقرار و اعتراف سے گریز نہیں کرتے تو چند باتیں صنفِ نازک میں بھی کمزوریِ اخلاق اور برائیاں اگر موجود ہیں تو ان کی تسلیم سے انکار کیوں ہو، بلکہ کسی بُرائی کی اصلاح جب ہی ہو سکتی ہے کہ ہم اس کا وجود تو پہلے تسلیم کر لیں ابھی جس حدیث اکلِ شجرہ ممنوعہ والی کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، اس کے بارے میں علامہ مودودی عم فیضہم کا ریمارک بھی ملاحظہ کرتے چلیئے!

''عام طور پر یہ جو مشہور کیا گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حواء کو دام فریب میں گرفتار کیا، اور پھر انھیں حضرت آدم علیہ السلام کو پھانسنے کے لئے آلہ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے، اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے، بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حواء کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصہ لیا ہے، وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں'' (تفہیم القرآن ۲/۱۶)

مولانا آزاد نے کچھ احتیاطی الفاظ استعمال کئے تھے کہ قرآن مجید نے اس قصہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی لیکن علامہ مودودی نے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کر دیا ہے کہ قرآن مجید اس کی تردید کرتا ہے اور دلیل تردید کی بھی وہی ہے جو عدم تصدیق کی ہے، دونوں کی طرزِ بیان کا معنوی فرق اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔

معلوم نہیں علامہ مودودی بدء الحیض والی اس حدیث کیلئے کیا توجیہ کریں گے جس کو حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۱/۲۷۵ میں حضرت ابن مسعودؓ و حضرت عائشہؓ سے سندِ صحیح نقل کیا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں بھی مردوں کے ساتھ مساجد میں نماز باجماعت کے لئے جایا کرتی تھیں، عورتوں نے یہ کیا کہ نماز کے وقت میں مردوں کی طرف تاک جھانک لگانی شروع کر دی، جس کی سزا میں ان پر اللہ تعالیٰ نے حیض کی عادت مسلط کر دی اور مساجد کی حاضری سے روک دیا، کیا اس حدیثِ صحیح سے بھی عورتوں کی خلاقی گراوٹ ثابت نہیں ہوتی، اور کیا اس سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر انبیاء علیہم السلام کو عورتوں کی طرف سے ابتلاء پیش آئے ہیں اور ان کے قصے قرآن مجید اور احادیث صحاح و سیر سے ثابت ہیں۔

الرجال قوامون کی تفسیر! بڑی حیرت ہے کہ مولانا آزادؒ اور علامہ مودودیؒ نے آیتِ قرآنی ''الرجال قوامون علی

النساء کی تفسیر میں بھی ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کے مزعومہ نظریہ مساواتِ مردوزن پر کوئی زد نہ پڑ سکے، اور وہ مردوں کے لئے عورتوں پر حاکمیت وافضلیت کا مرتبہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں، مولانا آزاد نے تو فضیلت جزئی والا گھماؤ دیا ہے اور علامہ نے فرمایا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے فضیلت سے شرف، کرامت وعزت کا ارادہ نہیں فرمایا[1] ہے یہ مطلب فضیلت والا تو ایک عام اُردو خواں لے گا، یہاں مطلب (اعلیٰ قابلیت والوں کے نزدیک یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک جنس کو طبعاً الگ الگ خصوصیت عطا کی ہیں، اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد قوام ونگہبان ہونے کی اہلیت رکھتا ہے، اور عورت فطرتاً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت وخبر گیری کے تحت رہنا چاہیے (تفہیم القرآن ۳۴۹/۱) گویا خانگی نظام چالو رکھنے کے لئے ایسی تقسیم کار کردی گئی ہے، اس کا تعلق کسی کی کسی پر فضیلت وشرف وغیرہ سے کچھ نہیں۔

گزارش ہے کہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ۷۸۳ میں مستقل باب آیت الرجال قوامون علی النساء پر قائم کر کے نبی اکرم ﷺ کے ایلاء والی حدیث روایت کی ہے، اور حافظ نے وجہ مطابقت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ امام بخاریؒ کا مطمحِ نظر اگلی آیات **فعظوهن واهجروهن في المضاجع واضربوهن** ہیں کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اور ان کو عورتوں پر فضیلت بھی ہے، اگر عورتیں کسی بداخلاقی کا مظاہرہ کریں تو مردوں کو نصیحت کرنے تنبیہ کرنے اور مارنے تک کا بھی حق حاصل ہے، اگر صرف صلاحیتِ کار کے تحت تقسیم کار کی بات تھی اور حاکمیت وافضلیت کا تعلق کچھ نہ تھا تو تنبیہ وغیرہ کے یکطرفہ اختیارات مردوں کو دے دینا کیا مناسب تھا؟!

شانِ نزول! حافظ ابن کثیرؒ اور صاحبِ روح المعانی نے حضرت مقاتل اور حسن بصری وغیرہ سے روایت نقل کی کہ سعد بن الربیع جو فقہاء میں سے تھے، ان کی بیوی حبیبہ بنت زید ابی زہیر نے نافرمانی کی تو شوہر نے تھپڑ مار دیا اور وہ اپنے باپ کو لے کر حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں گئیں باپ نے کہا کہ میں نے اپنی نورِ نظر اس کے نکاح میں دی تھی، اس نے ایسا کیا، آپ نے فرمایا یہ جا کر اس سے بدلہ لے، وہ اپنے باپ کے ساتھ لوٹی کہ (نظریہ مساواتِ مردوزن کے تحت) شوہر سے بدلہ لے گی۔ اتنے ہی میں وحی آ گئی اور حضور علیہ السلام نے ان باپ بیٹی کو بلا کر فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ آیت نازل کی ہے "الرجال قوامون علی النساء" پھر فرمایا کہ ہم نے کچھ ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے دوسری بات چاہی اور جو کچھ اس نے چاہا وہی بہتر ہے (ابن کثیر ۴۹۱/۱ و روح المعانی ۲۳/۵)

جنس رجال کی فضیلت

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ۴۹۱/۱ میں لکھا کہ مرد کے قیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا رئیس، کبیر وحاکم ہے اور اگر وہ ٹیڑھی چلے تو تادیباً سزا بھی دے سکتا ہے کیونکہ وہ عورت سے بہتر ہے اور افضل ہے اور اسی لئے نبوت اور بڑی بادشاہت مردوں کے لئے خاص کی گئی، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا والی وحاکم مقرر کرے۔ (بخاری شریف)

اسی طرح منصبِ قضاء وغیرہ بھی صرف مردوں کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ وللرجال علیهن درجه (مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ[2] (فضیلت وفوقیت کا) دیا گیا ہے) حضرت علامہ عثمانیؒ نے لکھا:۔ یعنی یہ امر تو حق ہے کہ جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کا قاعدہ کے موافق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی یا اس کی حق تلفی ممنوع ہوگی، مگر یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور فوقیت ہے تو اس لئے رجعت میں اختیار مرد ہی کو دیا گیا۔ (۴۵)

---

[1] اس پر حیرت نہ کیجئے کہ ایک عالم کس طرح ایسی بات لکھ سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے فضیلت کا لفظ بول کر بھی فضیلت وشرف کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ایسے معنی مراد لئے ہیں جن سے فضیلت کی نفی ہو سکتی ہے۔ "مؤلف"

[2] اس پر کوئی وضاحت نوٹ نہ مولانا آزادؒ نے اپنی تفسیر میں دیا نہ مولانا مودودیؒ نے، دونوں خاموشی سے گزر گئے کہ "درگفتن نمی آید"

حافظ ابن کثیرؒ نے آیت مذکورہ کے تحت مسلم شریف کی یہ حدیث ذکر کی:۔رسول اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا:۔عورتوں کے بارے[1] میں خدا سے ڈرو کیونکہ تم نے ان کو بطور امانتِ خداوندی اپنے قبضہ میں لیا ہے اور خدا کے ایک کلمہ کے ذریعہ وہ تم پر حلال ہوئی ہیں اور تمہارا ان پر بڑا حق یہ ہے کہ جس کو تم ناپسند کرو اس کو وہ تمہارے یہاں ہرگز نہ آنے دیں، اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو اعتدال کی حد تک مار بھی سکتے ہو، اور ان کا تمہارے ذمہ حسبِ دستور نان نفقہ ہے، دوسری حدیث میں ہے کہ آپ سے بیوی کے حق کو دریافت کیا گیا تو فرمایا:۔جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب پہنو تو اس کو بھی پہناؤ، چہرہ پر مت مارو، سخت الفاظ مت کہو، اور (ناراضگی کے وقت) گھر کے اندر ہی رہ کر اس سے کلام وغیرہ ترک کرو، مرد کے لئے عورت پر درجہ ہے یعنی فضیلت، خَلق، خُلق، مرتبہ، طاعتِ امر، انفاق، قیام بہ مصالح اور فضل دنیا وآخرت کے لحاظ سے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله الآیہ (ابن کثیر ۲۷۱/۱)

علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے تحت لکھا:۔حضرت ابن عباسؓ نے قوامون کا مطلب بتلایا کہ مرد عورتوں پر بطور امراء کے ہیں کہ ان پر مردوں کی اطاعت فرض ہے اور وہ یہ کہ مرد کے گھر والوں کے ساتھ وہ بہتر سلوک کرے اور اس کے مال کی حفاظت کرے،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیک بیویاں قانتات ہوتی ہیں یعنی شوہروں کی اطاعت شعار، حافظات للغیب ہوتی ہیں یعنی شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے مال اور اپنی آبرو کی حفاظت کرتی ہیں (نہ مال کو بے جا لٹاتی ہیں نہ غیر مردوں سے تعلق کرتی ہیں)

حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔عورتوں میں سب سے بہتر وہ بیوی ہے کہ اس کو دیکھ کر شوہر کا دل خوش ہو جائے، جب کوئی حکم اس کو دے تو اطاعت کرے اور جب اس کو گھر چھوڑ کر جائے تو اس کے مال وآبرو کی حفاظت کرے، اور فرمایا:۔اگر عورت پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، عفت و پاکدامنی کی زندگی بسر کرے، شوہر کی مطیع ہو تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

واللاتی تخافون نشوزھن کا مطلب یہ ہے کہ جن بیویوں کے بڑا پن کا تمہیں خیال و ڈر ہو کہ وہ اپنے کو شوہر سے مرتبہ میں بڑا اور برتر سمجھیں گی اس کے حکم کی اطاعت نہ کریں گی، یا اس سے اعراض، بغض وغیرہ کا طریقہ اختیار کریں گی اگر ایسی علامات ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو سمجھا کر اور خدا وآخرت کی یاد دلا کر اصلاحِ حال کی سعی کریں الخ کیونکہ نبی اکرم علیہ السلام نے فرمایا:۔اگر میں کسی کے لئے سجدہ کا حکم کرتا تو عورت کو اپنے شوہر کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا، اور فرمایا:۔جو عورت (ناراضی کے سبب) اپنے شوہر سے الگ ہو کر رات گزارتی ہے تو صبح تک خدا کے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں (تفسیر ابن کثیر ۴۹۱/۱)

ضروری فائدہ! ہم نے یہ سب تفصیل اس لئے ذکر کی کہ عورتوں کے حقوق پر بھی روشنی پڑ جائے کہ وہ ہماری شریعت میں مردوں کے برابر ہیں اور دنیا کا کوئی قانون یا مذہب اس بارے میں اسلام کی ہمسری نہیں کر سکتا لیکن اسی کے ساتھ مرتبہ کے لحاظ سے دونوں صنف میں برابری کو بھی جو لوگ اسلامی اصول ونظریہ قرار دیتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں، اور اسی غلطی کی وجہ سے ان کو موقع ملا ہے کہ حضرت عمرؓ وغیرہ پر عورتوں کے بارے میں نقد وجرح کریں، حضور علیہ السلام یا سابق انبیاء علیہم السلام یا بہت سے اولیائے امت کے خُلق عظیم کی بات تو اور رہی کہ انہوں نے اپنی ازواجِ مطہرات کی نسوانی کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اپنے فرائض منصبی سے کام رکھا اور ان سے پہنچنے والی غیر معمولی روحانی تکالیف کو بھی دوسری جسمانی وروحانی تکالیف کی طرح حسبۃً اللہ انگیز کیا، تاہم یہ بھی سب کے سامنے ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت حفصہؓ کو طلاق رجعی دی، اور اس کو بحکم خداوندی واپس بھی لے لیا، یہ بھی فرمایا کہ مجھے جبرئیل علیہ السلام برابر عورتوں کے ساتھ مدارات وحسنِ خلق ہی کی نصیحت کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ خیال ہو گیا کہ طلاق دینے کی کسی حال میں کوئی جائز شکل باقی ہی نہ رہے گی، نیز

[1] اتقوا النساء سے مراد اکابر امت کے نزدیک یہ ہے کہ ان کے کید و مکر سے ڈرو اور ہوشیار رہو۔"مؤلف"

تحریم، ایلاء اور تخییر کے واقعات بھی پیش آکر ہی رہے وغیرہ وغیرہ سب کچھ اپنی جگہ ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کا خانگی نظام زندگی عامہ امت کے لئے ایک بہت معتدل طریقہ پر ہی چل سکتا ہے اور وہ وہی ہے جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے وقول وعمل سے پیش کر دیا ہے، اس میں عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی قدر و منزلت پہچاننا اوّل نمبر پر ہے، لیکن ان کو سر پر چڑھانا، ہر قسم کی آزادی دینا، یا ان کی بے حجابی بداخلاقی، زبان درازی برابر سے جواب دینا، بیرونی معاملات میں دخل اندازی وغیرہ اسلامی معاشرت کے قطعاً خلاف ہے بیوی کتنی ہی حسین وجمیل ہو لیکن اگر وہ دیندار نہیں، شوہر کے لئے خوش اخلاق نہیں، دوسروں کے لئے زینت کرتی ہے یا بدکردار مردوں، عورتوں سے تعلق پسند کرتی ہے تو وہ اسلامی نقطہ نظر سے دوکوڑی قیمت کی بھی نہیں ہے اسی طرح اگر مرد دیندار نہیں، اپنی بیوی کے ساتھ خوش اخلاق نہیں، غیر عورتوں سے تعلق یا میلان رکھتا ہے، یا اپنی بیوی کو غیروں کے سامنے لانا پسند کرتا ہے تو وہ بھی شرعی نقطہ نظر سے کسی قدر و قیمت کا مستحق نہیں ہے، حضرت عمرؓ کے پورے حالات پڑھ جایئے آپ کو یہی چیز ملے گی، اور قرآن مجید و رسول اکرم علیہ السلام کی ساری تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

مردوں اور عورتوں کی تین قسمیں

مرد تین قسم کے ہیں:۔ کامل، اس سے کم، لاشیئ محض، کامل وہ ہے جو خود صاحبِ رائے ہو اور عمدہ لوگوں سے مشورہ بھی لے ان کی رائے کو اپنی رائے کے ساتھ ملالے، کامل سے کم وہ ہے جو صرف اپنی رائے سے کام کرے اور دوسروں سے رائے نہ لے لاشئ وہ ہے جو نہ خود صاحبِ رائے ہو اور نہ لوگوں سے مشورہ حاصل کرے، اور عورتوں کی بھی تین قسم ہیں، ایک وہ جو زمانہ کی سختیوں پر اپنے شوہروں کی مدد کریں اور شوہروں کے خلاف زمانہ کی مدد نہ کریں، اور ایسی عورتیں بہت کم ہیں، دوسری وہ جو بچوں کا ذریعہ ہیں اور ان میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں، تیسری بدخو اور بداخلاق عورتیں، خدا ان کو جس کی گردن میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے، اور جب چاہتا ہے ان سے رہائی دلا دیتا ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۳۹۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا دل و دماغ صرف سیاسی سوجھ بوجھ کے ہی لحاظ سے اعلیٰ قسم کا نہیں تھا بلکہ معاشرتی زندگی پر بھی وہ بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی رفعتِ شان

ہمارے اردو لٹریچر کی بڑی کمی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے صرف سیاسی حالات سے روشناس کرایا گیا، اور ان کے دوسرے علمی وعملی کمالات کو پیش نہیں کیا گیا اس وقت ہمارے سامنے صرف ازالۃ الخفاء ایسی کتاب ہے جو اردو ہو کر اب سامنے آئی ہے اور اس میں بہت بڑا حصہ ان ہی کے حالات سے متعلق ہے، ہم اس وقت ان کے موافقاتِ وحی سے متعلق ذخیرہ یکجا کر کے پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی اس درجہ کی پہلی کوشش ہے اللہ تعالیٰ اس سے امت کو فائدہ پہنچائے اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو جمع قرآن والی منقبت ہی سے آپ کی شانِ رفیع کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے اور ساری امتِ محمدیہ کی گردنیں اس احسانِ عظیم سے جھکی ہوئی ہیں، اگر وہ یہ اقدام نہ کرتے تو ہم قرآن مجید ہی کی موجودہ صورت سے محروم ہو جاتے، تو جس خدا نے نبی اکرم علیہ السلام کی زندگی کے بعد بھی اتنا بڑا کام آپ سے لیا، اس سے آپ کے عظیم ترین فضل و شرف کا ثبوت ملتا ہے۔

فضیلت ومنقبت جمع قرآن

امام بخاریؒ نے باب جمع القرآن (۷۴۵) میں حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت نقل کی کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجھے بلایا، اُس وقت حضرت عمرؓ بھی ان کے پاس تھے، فرمایا کہ دیکھو! یہ حضرت عمرؓ میرے پاس آئے ہیں، اور کہا جنگِ یمامہ کے شدید قتال میں قرآن مجید کے قراء شہید ہو گئے ہیں مجھے ڈر ہے کہ دوسرے معرکوں میں بھی ایسا ہو گا اور اس طرح قرآن مجید کا بڑا حصہ ہم سے جاتا رہیگا، اس لئے میری رائے ہے کہ آپ قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیں، میں نے اِن سے (یعنی حضرت عمرؓ سے) کہا کہ آپ کیسے ایسا کام کرنے کی رائے دے رہے

ہیں جو حضور علیہ السلام نے نہیں کیا، انہوں نے کہا خدا کی قسم یہی بات بہتر ہے، پھر یہ برابر مجھے اس کام کے لئے آمادہ کرتے رہے یہاں تک کہ میرا اس کیلئے شرح صدر ہو گیا، اور میری بھی اب وہی رائے ہوگئی جو حضرت عمرؓ کی ہے حضرت زید بن ثابتؓ نے بیان کیا کہ اس تمہید کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم جوان آدمی ہو عاقل ہو، تم پر ہمیں پورا بھروسہ ہے تم وحی رسول اکرم علیہ السلام لکھا کرتے تھے، لہٰذا پوری کوشش وتلاش کر کے قرآن مجید کے منتشر حصّوں کو ایک جگہ جمع کرلو، خلیفہ رسول اکرم علیہ السلام یہ حکم سُن کر میں سخت متفکر ہو گیا، اور واللہ! اگر وہ مجھے ایک پہاڑ کو دوسرے پہاڑ تک منتقل کرنے کو فرماتے تو وہ بھی مجھ پر اتنا بھاری نہ ہوتا جتنا یہ حکم جمع قرآن کے بارے میں تھا، اور میں نے عرض کیا کہ آپ حضرات کس طرح وہ کام کرنا چاہتے ہیں جو حضور اقدس علیہ الصلوات والتسلیمات نے اپنی زندگی میں نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، واللہ! یہ کام ہر طرح بہتر ہے اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ بھی مجھے برابر اس خدمت کے لئے آمادہ کرتے رہے تا آنکہ میرا دل بھی اس کام کے لئے کھل گیا جس کے لئے حضرت ابوبکر و عمرؓ دونوں کا کھل گیا تھا، چنانچہ میں نے کوشش شروع کردی اور قرآن مجید کو کھجور کی ٹہنیوں، پتوں، اور پتلے سفید پتھروں وغیرہ اور لوگوں کے سینوں (یعنی حفاظ) سے جمع کرنے لگا، حتی کہ سب سے آخر میں سورۂ توبہ کی آخری آیات (**لقد جاء کم رسول** سے آخر سورت تک) مجھے ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس سے ملیں جو اور کسی کے پاس سے مجھے نہیں مل سکی تھیں، یہ جمع شدہ مکمل صحیفے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آپ کی وفات تک رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس آپ کی زندگی میں رہے پھر آپ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہے، بخاری ۷۴۶ میں یہ دوسری روایت بھی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قراءتوں کا اختلاف باقی تھا جو قرآن مجید میں بھی لکھا ہوا تھا حضرت حذیفہؓ ابن الیمانؓ کی تحریک پر اس اختلاف قراءت کو بھی قرآن مجید میں سے ہٹانے کی تجویز ہوئی، تا کہ اس کی وجہ سے بعد کے لوگوں میں تشویش واختلاف کی صورت رونما نہ ہو، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے ان صحائف کو منگوا کر صرف لسانِ قریش والی قراءت پر قرآن مجید کا نسخہ تیار کرا لیا، اور حضرت عثمانؓ نے پھر اسی کی اشاعت پوری دنیائے اسلام میں کرادی۔

صنف نسواں حدیث کی روشنی میں

ہم چاہتے ہیں کہ بحث کی تکمیل کے لئے یہاں معتد بہ حصہ، احادیث نبوی کا بھی یکجا کر کے پیش کردیں، واللہ المفید:۔

(۱) ارشاد فرمایا کہ جتنی شرطیں نکاح کے وقت عورتوں سے کی جائیں، وہ سب پوری کی جائیں، کیونکہ جو چیز پہلے حرام تھی وہ نکاح کے ذریعہ خدا کے حکم سے حلال کردی جاتی ہے لہٰذا دوسری سب شرطوں سے زیادہ نکاح کی شرطوں کو پورا کرنا ضروری ہے (بخاری ۷۷۳ کتاب النکاح و ترمذی)

امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ اسی حدیث پر بعض اہل علم اصحاب النبی علیہ السلام کا عمل ہے اور ان میں حضرتِ عمرؓ بھی ہیں اور حضرت علیؓ کی رائے یہ ہے کہ خدا کی شرط عورت کے نکاح کی شرط سے مقدم ہے۔ مثلاً اگر عورت کے نکاح کے وقت یہ شرط کرے کہ شوہر اس کو گھر سے باہر نہ لے جائے گا تو اس شرط کا پورا کرنا ضروری نہیں، گویا حضور علیہ السلام کے ارشاد کا تعلق صرف ان شرطوں سے ہے جو نکاح کے خاص فوائد ومنافع سے متعلق ہیں، دوسری خارجی باتوں سے نہیں، لیکن حضرت عمرؓ ہر قسم کی شرطوں کا فائدہ عورتوں کو دیتے تھے، چنانچہ بخاری ۷۷۴ ہی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ نکاح کی تمام شرطیں مردوں کے سابقہ حقوق کو ختم کردیتی ہیں مثلاً ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ سفر کرے یا ترک وطن کرے اور بیوی کو ساتھ لے جائے لیکن اگر نکاح کے وقت عورت شرط کردے کہ وہ اپنے گھر یا شہر سے باہر نہ جائے گی تو وہ اپنی شرط کو پورا کرا سکتی ہے ایک شخص نے اپنا ایسا ہی واقعہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا کہ ایسی شرط کرلی تھی اور اب مجھے باہر جانا ضروری ہو گیا ہے، کیا کروں؟ آپ نے فرمایا، عورت کو اپنی شرط پوری کرانے کا حق ہے اس شخص نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مرد تباہ ہو جائیں گے اور عورتیں جب بھی چاہیں گی وہ ایسی ہی کسی شرط پر ضد وہٹ کر کے طلاق لے لیا کریں گی کیونکہ مرد کو مثلاً سفر یا ترکِ وطن ضروری ہوگا تو اس کو

مجبور ہوکر طلاق دینی ہی پڑے گی، اس پر بھی حضرت عمرؓ نے یہی فرمایا کہ مردوں کو شرطوں کے مقابلہ میں اپنے حقوق سے دست بردار ہونا پڑے گا، اور عورتوں کو اپنی شرطیں پوری کرانے کا پوراحق ہے (فتح الباری وعمدۃ القاری) عورتوں پر رحم وشفقت نہ کرنے یا ان کی قدر عزت دوسرے اکابر کی نسبت کم کرنے کا الزام حضرت عمرؓ پر لگانے والے اس واقعہ پر غور کریں۔

(۲) امام بخاریؒ نے باب المداراۃ مع النساء ۹ ےے ارشادِ نبوی ذکر کیا کہ عورت پسلی کی طرح (ٹیڑھی) ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اس کو توڑ دو گے، اور اگر اس کے ٹیڑھے پن کے باوجود اس سے نفع حاصل کرنا چاہو گے تو نفع حاصل کر سکو گے، پھر اگلے باب الوصاۃ بالنساء میں ارشاد ہے کہ جس کا ایمان خدا اور یوم آخرت پر ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے، اور عورتوں کے معاملہ میں بہتر سلوک کی نصیحت قبول کرو، کیونکہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں اور پسلیوں میں بھی سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہوتی ہے، پس اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی فکر میں سر کھپاؤ گے تو (فائدہ کیا؟) اس کو توڑ دو گے، اور اگر اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی، لہٰذا عورتوں کے بارے میں اچھے برتاؤ کی ہی راہ اختیار کرو، بخاری، مسلم وترمذی کی دوسری روایات میں یہ ہے کہ عورت سب سے زیادہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور وہ سب سے اوپر والی ہوتی ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ اس کو توڑنا اس کو طلاق دینا ہے، دارمی کی حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے اگر سیدھا کرنے کی سعی کرو گے تو اس کو توڑ دو گے، لہٰذا اس کے ساتھ مدارات (رواداری) کا معاملہ کرو، کیونکہ اس میں گو کجی ہے مگر گزارہ کی صورت بھی ممکن ہے (جمع الفوائد ۲۲۷/۱)

حافظؒ نے فتح الباری میں لکھا:۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حضور علیہ السلام نے عورت کے اعلیٰ حصّہ جسم کے معنوی طور سے ٹیڑھے ترچھے ہونے کی تعبیر اس طرح کی ہو، کیونکہ وہ اعلیٰ حصہ سر ہے، جس میں زبان بھی ہے، اور اسی سے زیادہ اذیت وروحانی تکلیف مرد کو پہنچتی ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس حدیث سے صنفِ نازک کے بارے میں شارع کی طرف سے بہت کافی روشنی مل جاتی ہے اچھے برتاؤ اور رواداری کے ساتھ معتدل طریق اصلاح اپنانے کی ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ اس کے حال پر بالکل آزاد چھوڑنے سے کجی بدستور رہی گی، اور پوری کجی کو ختم کرنے کی سعی لاحاصل بتلائی کیونکہ وہ بغیر طلاق کے حاصل نہ ہوگی، لہٰذا درشتی ونرمی کے بین بین راہ اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اگر غلطیوں پر گرفت بالکل نہ کی جائے تو وہ رفتہ رفتہ مردوں پر اتنی حاوی ہو جائیں گی کہ ان کو اپنے کاموں کے قابل بھی نہ رہنے دیں گی، اور اگر ہر وقت گرفت کی گئی تو اس سے بھی جھگڑے بڑھ کر زندگی کا سکون ختم ہو جائے گا، اور آخری راہ طلاق کی اختیار کرنی ناگزیر بن جائیگی حضرت عمرؓ بھی یہی اعتدال کی راہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

(۳) عورت اگر خودسری اختیار کر کے شوہر کی قربت ترک کر دے تو جب تک وہ اس حرکت سے باز نہ آئے گی، سارے فرشتے اس پر لعنت کریں گے۔ (بخاری ۷۸۲)

(۴) آج میں نے نہایت مہیب منظر دیکھا کہ دوزخ میں زیادہ عورتوں کو پایا، صحابہ نے سوال کیا، ایسا کیوں؟ فرمایا کفر کی وجہ سے، پوچھا کیا وہ خدا کی منکر ہیں؟ فرمایا نہیں بلکہ اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان فراموش ہوتی ہیں (یہ بھی کفر ہے) اگر تم ساری عمر کسی عورت کے ساتھ احسان کرو گے اور پھر کبھی تم سے کوئی بات ناگواری کی ہو جائے تو کہے گی کہ میں نے تجھ سے کبھی کوئی خیر وبھلائی کی بات نہیں دیکھی (بخاری باب کفران العشیر ای الزوج ۷۸۲) مساواتِ مرد وزن والے اس تفاوتِ فطرت پر بھی غور کریں تو بہتر ہوگا۔

(۵) بخاری، مسلم وترمذی میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ خبردار! عورتوں کے پاس آمدورفت نہ کرنا، ایک انصاری نے عرض کیا، کیا دیور جیٹھ اپنی بھاوج کے پاس آجا سکتے ہیں؟ فرمایا، وہ تو موت ہیں، (کیونکہ زیادہ قرب کے سبب بے تکلف ہوں گے، جس سے اور بھی زیادہ خطرہ ہے) یہ بھی فرمایا:۔ کوئی بھی کسی وقت کسی عورت کے پاس تنہائی میں نہ رہے، بجز اس کے کہ اس عورت کا ذی رحم محرم بھی

وہاں موجود ہو، ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میری بیوی تو حج کے لئے گئی ہے اور میرا نام فوج میں لکھا گیا ہے، فرمایا، جاؤ! اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو (بخاری و مسلم) حضور علیہ السلام نے ضرورت کے وقت کسی عورت کے پاس جانے سے بھی بغیر اجازت شوہر کے ممانعت فرمائی (ترمذی)

حضور علیہ السلام کے پاس نابینا صحابی حضرت ابن مکتومؓ آئے، اس وقت آپ کے پاس حضرت میمونہ وام سلمہ دونوں تھیں آپ نے ان سے فرمایا، پردہ میں چلی جاؤ، انہوں نے کہا یہ تو نابینا ہیں، آپ نے فرمایا تم تو نابینا نہیں ہو! (ترمذی وابوداؤد)

معلوم ہوا کہ پردہ کی پابندی مردوں اور عورتوں کیلئے یکساں[1] ہیں اور کسی ایک کی بھی اہمیت نہیں ہے قرآن مجید (سورۂ نساء) میں جو چوری چھپے دلی دوست بنانے کی ممانعت ہے، وہ بھی دونوں صنف کے لئے ہے، اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ میلانِ جنسی کے شکار دونوں برابر[2] ہوتے ہیں۔

ضروری مسئلہ! پردہ کی پابندی سے جو بارہ قسم کے مرد اور عورتیں مستثنیٰ ہیں وہ آیتِ قرآنی ولا یبدین زینتھن (سورۂ نور) میں گنا دیئے گئے ہیں، شوہر، باپ، شوہر کا باپ، بیٹا، شوہر کا بیٹا، بھائی، بھائی کا بیٹا، بہن کا بیٹا، اپنی عورتیں، (یعنی آزاد مسلمان) اپنی مملوکہ باندیاں، کمیرے خدمت گار، جو میلانِ جنسی سے عاری ہوں، اور وہ نوعمر لڑکے جن میں ابھی جنسی میلان پیدا نہیں ہوا، ان سب کے سامنے علاوہ چہرہ اور ہاتھوں کے اور جسم و زیبائش کو بھی چھپانے کی ضرورت نہیں اور ناف سے گھٹنے تک کا حصّہ ایسا ہے جو بجز شوہر کے ہر ایک سے چھپانا فرض ہے اور صرف چہرہ اور ہاتھ اجنبی مردوں کے سامنے بھی بوقتِ ضرورت وعدم فتنہ کھولنا جائز ہے،

تفسیر مظہری ۶/۴۹۳ میں ہے کہ بوجہ روایتِ ترمذی شریف چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، وامام احمد چاروں کے نزدیک مستثنیٰ ہیں اور ایک روایت میں قدم بھی مستثنیٰ ہیں، اور مشہور امام شافعی سے صرف چہرہ کا استثناء ہے لہٰذا چہرہ تو باتفاقِ علماء اربعہ مستثنیٰ ہے اور مختلفات قاضی میں ہے کہ ہتھیلی کا ظاہر و باطن پہنچنے تک کھلا رہ سکتا ہے علامہ بیضاوی نے کہا کہ یہ صرف نماز کا مسئلہ ہے نظر کے جواز کا نہیں، کیونکہ حرہ کا بدن سب ہی قابل ستر ہے غیر زواج ومحرم کے لئے البتہ ضرورۃً علاج کے لئے جتنا حصّہ کھولنا پڑے وہ جائز ہے لیکن کتبِ حنفیہ میں ہے کہ چہرہ کا خارج از عورت ہونا نماز کے ساتھ خاص نہیں تاہم فتنہ اور شہوت کا اندیشہ ہو تو چہرہ کا کھولنا بھی درست نہیں اور اگر شک ہو یا غالب گمان تب بھی مباح نہیں شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ شہوت کا شبہ ہو تو عورت اور مرد دونوں کے چہرہ کی طرف نظر کرنا حرام ہے اس لئے عورت کو بھی ایسی صورت میں اپنا چہرہ اجنبی مرد کے سامنے کھولنا حرام ہوگا۔ الخ!

علامہ مودودی کا تفرد! آپ نے او نساء ھن کا ترجمہ مفسرین وسلف وخلف سے الگ ہوکر، اپنے میل جول کی عورتوں سے کیا اور لکھا کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں، غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمی ہوں ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح

---

[1] علامہ آلوسیؒ نے آیت قل للمومنات یغضضن (سورۂ نور) کے تحت لکھا: زواجر ابن حجر میں ہے کہ جس طرح مردوں کو عورتوں کی طرف نظر کرنا درست نہیں، عورتوں کو مردوں کی طرف نظر کرنا درست نہیں، خواہ شہوت اور خوف فتنہ بھی نہ ہو، البتہ اگر دونوں میں محرمیت نسب ورضاع ومصاہرت کا علاقہ ہو تو علاوہ ناف تا رکبہ کے نظر جائز ہے، دوسرے حضرات کی رائے ہے کہ اس کے ماسوا بھی شہوت سے حرام ہے، اور اجانب سے پوری طرح غضِ بصر کرنا ہی اولیٰ ہے، زواجر میں اجنبی عورت کے کٹے ہوئے ناخن وغیرہ کی طرف نظر کو بھی حرام لکھا ہے کیونکہ ایسی چیزوں سے بھی غلط میلانِ جنسی کے جذبات کو توت ملتی ہے۔ (روح المعانی ۱۸/۱۴۰)

[2] صاحبِ مرقاۃ نے لکھا: محدث علامہ نوویؒ نے لکھا: مرد کا اجنبی عورت کی طرف اور عورت کا اجنبی مرد کی طرف دیکھنا حرام ہے خواہ شہوت سے ہو یا بغیر اس کے، اور ایسے ہی مرد کی طرف دیکھنا حرام ہے جبکہ وہ اچھی صورت کا ہو، فتنہ ہو یا نہ ہو، یہی مذہب صحیح اور محققین کا مختار ہے امام شافعیؒ نے اور آپ کے حاذق اصحاب نے اس کی تصریح کی ہے الخ اور ہمارا اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ نظر اگر شہوت سے ہو تب حرام ہے، اور علامہ نوویؒ نے جو لکھا وہ دین میں احتیاط کی بات ہے الخ (مرقاۃ ۳/۴۰۹)

[3] حافظ ابن کثیر نے آیت وخلق منہا زوجہا کے تحت حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد نقل کیا: مرد کی پیدائش زمین سے ہے اس لئے اس کی بڑی رغبت زمین کی طرف ہوتی ہے اور عورت کی پیدائش مرد سے ہوئی ہے، اس لئے اسکا بڑا میلان مرد کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا اپنی عورتوں کو روکے رہو، یعنی اختلاط رجال وغیرہ سے (ابن کثیر ۱/۴۴۸) اس ارشاد سے برابری کی بات بھی قابل تامل ہوگئی۔ واللہ اعلم! ''مؤلف''

مردوں سے کیا جاتا ہے(کہ چہرہ اور ہاتھوں کے سوا اور بدن کو ان کے سامنے نہ کھولا جائے)ابن عباس، مجاہد، اور ابن جریج کی یہی رائے ہے لیکن معقول رائے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر یہ ہے کہ اس سے مراد میل جول کی عورتیں ہوں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم (تفہیم القرآن ۳/۳۸۹)

اکابر صحابہ ومفسرین حضرت ابن عباس، مجاہد اور ابن جریج وغیرہ، اور دیگر علمائے سلف کے مقابلہ میں اپنی رائے کو معقول کہنے کی جسارت کا تو علامہ مودودی ہی کو حق پہنچتا ہے کیونکہ معقول کے مقابلہ میں دوسری رائے کو غیر معقول نہ سمجھیں تو اور کیا سمجھیں دوسرا دعویٰ قرآن کے الفاظ سے قریب تر ہونے کا کیا ہے جس کی صداقت بغیر علمائے عربیت کی گواہی وتوثیق کے محل نظر ہے، پھر یہ کہ حضرات صحابہ سے زیادہ قریب تر وبعید تر کو پرکھنے والا کوئی ہوسکتا ہے؟ جنھوں نے او نساء ھن کا مقصداق اپنی مسلمان عورتوں کو سمجھا تھا، تیسرے درجہ میں استدلال ازواجِ مطہرات کے پاس ذمی عورتوں کی حاضری سے کیا گیا ہے، لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا، کہ ازواجِ مطہرات ان کے سامنے صرف چہرہ اور ہاتھ بلکہ اور جسم وزیبائش بھی ظاہر کرتی تھیں، کیونکہ عورتوں پر مردوں کی طرح گھروں میں آنے جانے پر تو پابندی شرعاً ہے نہیں اس لئے صرف ان کے ازواجِ مطہرات کے پاس آنے سے استدلال پورا نہیں ہوسکتا، حیرت ہے کہ اس قدر جلیل القدر اکابر امت کے مقابلہ میں اتنا کمزور اور بودا استدلال کیا گیا، اور ایسے تفردات تفہیم القرآن میں بہ کثرت ہیں، فیاللاسف! یہ بھی کہا گیا کہ ''اس معاملہ میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے'' (تفہیم ۳/۲۹۰) کیسی عجیب بات ہے کہ غیر مسلم عورتیں جن کے پاس کوئی اخلاقی معیار نہیں اور اسی لئے حضرت عمرؓ نے حماموں میں ان کے ساتھ اختلاط کو سختی سے روک دیا تھا، اور وہ کتابیات کے ساتھ نکاح کو بھی ناپسند کرتے تھے، ان کے ساتھ میل جول کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جبکہ علامہ پر یہ بھی ضرور روشن ہوگا کہ خاص طور سے اس دورِ ترقی میں غیر مسلم عورتوں کے ذریعہ سے مسلمان عورتوں کے اخلاقی ومذہبی کردار کو کس طرح نقصان پہنچانے کی کوششیں ہورہی ہیں اور عرب ممالک میں تو یہودی عورتوں کو گھروں میں داخل کرکے جاسوسی کے بھی جال پھیلا دیئے گئے ہیں، جن سے مسلم ممالک کو غیر معمولی سیاسی نقصانات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اور بعض غیر اسلامی ملکوں میں درپردہ یہ اسکیم بھی چلائی جارہی ہے کہ مسلمان عورتوں کو غیر مسلم عورتوں کے ذریعہ متاثر کرکے دوسری بداخلاقیوں میں مبتلا کرنے کے علاوہ ان کا ارتداد بھی عمل میں لایا جائے اور اس کے لئے ان دونوں کے میل جول اور تعلقات کے بڑھانے کی ترقی پذیر کوشش ہورہی ہے۔

ان حالات میں تو میل جول والی بات کو معقول قرار دینا کسی طرح بھی معقول نہیں معلوم ہوتا اور ہمارا یقین یہ ہے کہ علامہ کی یہ تحقیق قرآن مجید سے بھی کسی طرح قریب نہیں ہے بلکہ بعید سے بعید تر تو ہوسکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

ارشاداتِ اکابر! مزید فائدہ کے لئے اکابر مفسرین کی تحقیق بھی ملاحظہ کریں:۔(۱) حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا:۔ مسلمان عورتیں اپنی زینت مسلمان عورتوں کے سامنے بھی ظاہر کرسکتی ہیں، اہل ذمہ عورتوں کے سامنے نہیں تاکہ وہ ان کا حال اپنے مردوں سے نہ بتلائیں، کیونکہ مسلمان عورتوں کے حالات بابتہ حسن وجمال وغیرہ کا اظہار غیر مردوں کے سامنے کرنا اگرچہ سب ہی عورتوں کے لئے شرعاً ممنوع ہے مگر غیر مسلم ذمی عورتوں کے حق میں اور بھی زیادہ شدت سے منع ہے کیونکہ ان کو اس بات سے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی، بخلاف مسلم عورت کے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے اور اس لئے وہ اس سے رُک جائے گی، بخاری ومسلم میں حدیث ہے کہ کوئی عورت کے ساتھ بے تکلف میل جول کے باعث اس کے حسن وجمال اور دوسری خوبیوں سے واقف ہوکر اس کا حال اپنے شوہر سے جاکر نہ بتایئے جس سے وہ اس کے حالات سے اس طرح واقف ہوسکے کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے، اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کسی ایماندار مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں کہ اس کا سراپا بجز اس کے اہل ملت کے دوسری عورت دیکھ سکے، حضرت مجاہد نے فرمایا کہ او نساء ھن سے مراد اپنی مسلمان عورتیں ہیں، مشرکہ نہیں، اور مسلمان عورت کو اس کے سامنے بدن کھولنا جائز نہیں نہ اپنے سر کا دوپٹہ اس کے سامنے اتارے کیونکہ وہ اپنی عورتیں نہیں ہیں، حضرت ابن عباسؓ کا

ارشاد ہے کہ اس سے مراد مسلمان عورتیں ہیں، یہودی، نصرانی عورت کے سامنے مسلمان عورت کو اپنا سینہ، گردن وغیرہ کھولنا جائز نہیں، حضرت مکحول وعبادہ اس بات کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ یہودی، نصرانی یا مجوسی عورت مسلمان عورت کے لئے دایہ گری کرے، حضرت ابن عطاء اپنے والد سے راوی ہیں کہ جب صحابہ کرام بیت المقدس پہنچے تو وہاں کی عورتوں کے لئے قابلہ کا کام یہودی ونصرانی عورتیں کیا کرتی تھیں، اگر یہ صحیح ہو تو ضرورت سے مجبوری کے سبب ہوگا، (کہ وہاں اس وقت تک مسلمان عورتیں قابلہ نہ ہوں گی) یا یہ کام گراوٹ کا تھا، ان سے لیا جاتا رہا، لیکن قابلِ ستر جسم کو ان سے بہر حال چھپانا ضروری ہے۔ اوما ملکت ایمانھن میں مراد باندیاں ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمہ، غلام مرد مراد نہیں، یہی سعید بن المسیب کا مذہب ہے الخ (تفسیر ابن کثیر ۲۸۴/۳)

(۲) علامہ آلوسیؒ نے لکھا کہ او نساء ھن سے مراد صحبت وخدمت میں پاس رہنے والی آزاد مسلمان عورتیں ہیں، کیونکہ کافر عورتوں کو ان مسلمان عورتوں کے حالات اپنے مردوں کے سامنے بیان کرنے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوسکتی، لہٰذا وہ اجنبی مردوں کی طرح ہیں اور ذمی عورت اور دوسری سب برابر ہیں، یہی اکثر سلف کا مذہب ہے، روضۃ النووی میں امام غزالی شافعی سے اجازت نظر ذمیہ الی المسلمہ کی منقول ہے مگر بغوی شافعی سے ممانعت مروی ہے اور منہاج میں بھی حرمت کا ہی قول ہے اور بہت سے شافعی حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے، ابن حجرؒ نے کہا کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ مسلم عورت کے بدن کا وہ حصہ جو کام کاج کے وقت نہیں کھلتا، اس کی طرف ذمی عورت کا نظر کرنا حرام ہے (بجز اس کے سیّدہ اور محرم کے) اور ذمی عورتیں جو ازواجِ مطہرات کے پاس آتی جاتی تھیں اس میں بھی یہی صورت ہوتی ہوگی، لہٰذا اتنے حصہ جسم کا ضرورۃً کھلنا اس کی دلیل نہیں بن سکتا کہ ان کا حکم باقی جسم کے لئے اجنبی مردوں کا سا نہیں ہے او ماملکت ایمانہن میں مراد باندیاں ہیں اگر چہ وہ کافر ہوں اور مرد غلام مثل اجنبی مردوں کے ہیں، یہی مذہب امام ابوحنیفہ کا ہے، اور امام شافعی کے بھی دو قول میں سے ایک ایسا ہی ہے اور اس کو اکثر شافعیہ نے صحیح قرار دیا ہے الخ (روح المعانی ۱۴۳/ ۱۸)

(۳) علامہ محدث پانی پتیؒ نے لکھا کہ او نساء ھن میں ایک قول عام ہے، دوسرا یہ کہ صرف مومن عورتیں مراد ہیں، لہٰذا غیر مسلم عورتوں کے سامنے مسلمان عورتوں کی طرح کھل کر آنا جائز نہیں کیونکہ وہ ہماری عورتوں میں سے نہیں ہیں کہ وہ دین کے لحاظ سے اجنبی ہیں، دوسرے اس لئے کہ ان پر کوئی مذہبی پابندی اس امر کی نہیں کہ وہ ان مسلمان عورتوں کا حال اپنے مردوں سے جا کر نہ کہیں گی اور ہمارے مذہب میں چونکہ اس امر کی سخت ممانعت ہے اس لئے مسلمان عورتیں ایسا نہ کریں گی ابن جریج سے منقول ہے کہ اس سے مراد مسلمان آزاد عورتیں ہیں اور او ماملکت سے مراد باندیاں ہیں مرد غلام نہیں، حضرت سعید ابن المسیب اور حسن وغیرہ نے فرمایا کہ سورۂ نور کی آیت او ما ملکت ایمانھن تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے، کیونکہ وہ عورتوں کے بارے میں ہے مردوں کے متعلق نہیں، لہٰذا مذہب حنفی کی رو سے مسلمان عورت کا کافرہ کے سامنے بے محابا آنا جائز نہیں ہے، اور حضرت فاطمہؓ کا غلام ممکن ہے صغیر السن ہوگا، اس لئے اس سے استدلال قوی نہیں، البتہ امام مالکؒ کے نزدیک باندی اور غلام کا حکم ایک الخ (تفسیر مظہری ۴۹۸/ ۶)

(۶) ارشاد فرمایا:۔ اونٹوں پر سوار ہونے والی (عربی) عورتوں میں سے قریشی عورتیں سب سے بہتر ہیں جو بچوں پر بہت شفقت کرتی ہیں اور شوہروں کے مال میں ہمدردی وخیر خواہی کا بہت خیال کرتی ہیں۔ بخاری شریف ۸۰۸

(۷) حضرت جابرؓ نے کہا کہ میرے باپ کا انتقال ہوا تو انہوں نے سات یا نو لڑکیاں چھوڑیں، اس لئے میں نے ایک ثیبہ عورت سے شادی کی، حضور علیہ السلام کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ تم نے کنواری سے شادی کیوں نہ کی، جو تم سے زیادہ کھل کھیلتی اور دونوں کی دلبستگی کا سامان زیادہ ہوتا، میں نے عرض کیا کہ اس طرح والد نے لڑکیاں چھوڑی ہیں، مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ ان ہی جیسی نوعمر نا تجربہ کار بیوی لاؤں، لہٰذا ایسی تجربہ کار، دانا بینا عورت سے شادی کی جو ان کی ضرورت کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکے، آپ نے فرمایا، بارک اللہ، اچھا کیا (بخاری ۸۰۸)

حافظؒ نے لکھا کہ اس سے امام بخاریؒ نے یہ استدلال کیا کہ بیوی کو شوہر سے متعلق بچوں کی خبر گیری کر کے اس کی مدد کرنی چاہیے (فتح ۴/۱۳ ۹)
علامہ ملا علیؒ قاریؒ نے لکھا:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باکرہ سے نکاح کرنا زیادہ بہتر ہے اور یہ کہ شوہر کے ساتھ ملاعبت مستحب ہے، علامہ طیبی نے کہا کہ ملاعبت کامل الفت وموانست کی نشاندہی کرتی ہے، اور ثیبہ کا دل اکثر سابق شوہر کے ساتھ وابستہ رہتا ہے اس لئے اس کی نئے شوہر کے ساتھ محبت کامل نہیں ہوتی اور اسی لئے وارد ہے ''علیکم بالا بکار فانہن اشد حُباً واقل خِباً'' (باکرہ لڑکیوں سے شادی کیا کرو کہ وہ نہایت محبت کرنے والی اور کم دھوکہ وکید والی ہوتی ہیں) دوسری حدیث ابن ماجہ، جامع صغیر وبیہقی کی ہے ''علیکم بالا بکار فانہن اعذاب انواھا وانتق ارحاما وارضی بالیسیر'' (ابکار سے شادیاں کرو کیونکہ وہ شیریں دہن شیریں زبان اور پاکیزہ مہذب کلام والی ہوتی ہیں، شوہر کے ساتھ بے ہودہ بات زبان درازی سے پیش نہیں آتیں اس لئے کہ ان میں لحاظ وحیا باقی رہتی ہے (جو بیوہ ومطلقہ میں باقی نہیں رہتی) ان سے اولاد بھی زیادہ ہوتی ہے (حرارت وقوتِ رحم کی وجہ سے) نیز وہ تھوڑے حصّہ سے راضی اور خوش ہو جاتی ہیں (کہ دوسرے گھروں میں رہ کر وہ زیادہ کی عادی نہیں ہو چکی ہوتیں) ایک روایت میں واسخن اقبالا بھی ہے کہ شوہر کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرتی ہیں، احیاء میں ''فوائدِ بکارت'' سے لکھا کہ وہ شوہروں سے صحیح معنوں میں محبت والفت کرتی ہیں کیونکہ طبائع کی جبلت میں اوّل محبوب کے ساتھ مانوس ہونا ہے، اور جو طبائع پہلے اور مردوں کو آزما چکیں اور دوسرے حالات سے گزر کر ان سے مانوس ہو چکیں وہ بسا اوقات بعد کے بعض مخالف وغیر مانوس احوال کو پسند کرتی ہیں، اس لئے نئے شوہروں سے بھی نفرت کرنے لگتی ہیں، اسی طرح شوہر بھی باکرہ عورتوں سے مانوس زیادہ مانوس ہوتے ہیں، اور ثیبات سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ طبائع فطرۃً بیوہ مطلقہ بیوی کے سابق شوہر کے تعلق کا تصور کر کے اس سے نفرت کرتی ہیں، اور بعض طبائع تو اس امر کا بہت ہی زیادہ احساس کرتی ہیں (مرقاۃ ۴۰۶ و ۴۰۷/۳) ان سب وجوہ سے ابکار وثیبات کا فرق کیا گیا ہے لیکن دنیا میں قاعدہ کلیہ کوئی نہیں ہے سب قاعدے اکثری ہیں اسی لئے معاملہ برعکس بھی ہوسکتا ہے اگرچہ کم اور بہت کم ہی سہی،

حضور اکرم ﷺ کی ایک (حضرت عائشہؓ) کے سوا سب ازواجِ مطہرات ثیبات تھیں اور بیشتر صحابہ کرام نے بھی بیوہ ومطلقہ عورتوں سے شادیاں کی تھیں، لیکن اُن سب حضرات اور ان کی ازواج کے سے قلوبِ طاہرہ مزکیہ ومقدسہ کی نظیر کم ہی مل سکتی ہے۔

(۸) امام بخاریؒ نے باب ترک الحائض الصوم ۴۴ اور باب الزکوٰۃ علی الاقارب ۱۹۷ میں حدیث روایت کی رسولِ اکرم ﷺ نماز عید کے بعد عید گاہ میں مجمع نسواں کی طرف تشریف لے گئے، اور ان کو یہ وعظ فرمایا:۔ اے جماعتِ نسواں! صدقہ وزکوٰۃ دینے کا اہتمام کرو، کہ داخلِ جہنم ہونے والوں میں تمہاری اکثریت مجھے دکھائی گئی ہے عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا تم دوسروں پر لعنت پھٹکار بہت[1] کرتی رہتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو، میں نے تم عورتوں کے عقل اور دین کے لحاظ سے ناقص ہونے کے باوجود تم سے زیادہ ایک عاقل سمجھ دار پختہ کار مرد کی عقل وفہم کو برباد کرنے والا اور کوئی نہیں دیکھا، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے دین وعقل میں نقصان کیا ہے؟ (یعنی ہمارا دین تو وہی ہے جو مردوں کا دین ہے نیز وہ اور ہم دونوں ہی ذوی العقول میں داخل ہیں) فرمایا کیا عورت کی شہادت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کی شہادت کا آدھا نہیں قرار دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا ٹھیک ہے آپ نے فرمایا، یہ عقل کے نقصان کی وجہ سے تو ہے، پھر فرمایا کہ حیض کے دنوں میں عورت نماز وروزہ (ایسی افضل عبادات) سے محروم نہیں ہو جاتی؟ انہوں نے عرض کیا درست ہے، آپ نے فرمایا یہ اس کے دین کا نقصان ہے، صحیح بخاری باب کفران العشیر ۸۲۷ کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ عورت شوہر اور ہر کسی کے احسان کو بھلا دیتی ہے یہاں تک کہ تم اگر عمر بھی کسی عورت کے ساتھ احسان کرو اور پھر کسی روز تم سے کسی بات پر ناراض ہوگی تو کہے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی خیر وبھلائی نہیں دیکھی۔

---

[1] حضرت جابر بن سلیمؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا مجھے نصیحت فرمائیں، آپ نے فرمایا:۔ ہرگز کبھی کسی کو برا لفظ نہ کہنا، جابر کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کبھی کسی آزاد یا غلام شخص یا اونٹ یا بکری کو بھی بُرا لفظ نہیں کہا (ترمذی وابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ ۱۶۹ باب فضل الصدقہ)

حافظؒ ابن حجرؒ نے لکھا کہ لبٌ[1] عقل سے اخص ہے، یعنی مردِ عقل کے بہترین حصہ عقل وفہم کو خراب کر دیتی ہے، حازم سے مراد پختہ کار جو اپنے کاموں پر پوری طرح ضبط وکنٹرول کر سکتا ہو، اور یہ مبالغہ ہے عورتوں کی فطرت بیان کرنے میں کہ اعلیٰ عقل، فہم وتجربہ والا مرد بھی ان کے مقابلہ میں لاچار ومجبور ہو جاتا ہے، تو دوسرے لوگوں کا حال ظاہر ہے، حافظؒ نے لکھا کہ عورتوں کا حضور علیہ السلام سے **وما نقصان دیننا؟** کا سوال خود ان کے نقصان فہم کو بتلا رہا ہے کہ کیونکہ انہوں نے بات بات پر دوسروں کو لعنت و پھٹکار کرنا، ناشکری کرنا، اور مردوں کی عقل خراب کرنا، حضور علیہ السلام کی ذکر فرمودہ تینوں باتوں کو تسلیم کر لیا تھا کہ یہ سب عورتیں ان کے اندر ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ سب نقصان عقل کی دلیل ہیں پھر بھی حضور علیہ السلام سے سوال کر بیٹھیں کہ ہم میں عقل کا نقصان کیونکر ہے؟ تاہم حضور علیہ السلام نے ان کو سختی سے جواب نہیں دیا، نہ کچھ ملامت فرمائی، اور بقدر ان کی عقل وسمجھ کے جواب دیا کہ قرآن مجید میں آیت ۲۸۲ سورۂ بقرہ پڑھ لو جس میں حکم ہے کہ دو مرد گواہ ہو سکتے ہیں اگر وہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک عورت معاملہ کے کسی جز کو بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے، اس سے معلوم ہوا کہ ان میں بھول کا مادہ ہے اور معاملہ کو اچھی طرح ضبط نہیں کر سکتیں جس سے ان کی عقل وفہم میں کمی ثابت ہوتی ہے۔

حدیثی فوائد! حافظؒ نے آخر میں حدیث مذکور کے یہ علمی فوائد بھی ذکر کئے:۔ کفرانِ نعمت حرام ہے، دوسروں کے لئے تکلیف دہ برے الفاظ کا استعمال حرام ہے جیسے لعنت کرنا، گالی دینا وغیرہ، علامہ نوویؒ نے کہا کہ یہ دونوں کبیرہ گناہ ہیں، کیونکہ ان پر جہنم کی وعید ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ نصیحت میں سخت الفاظ استعمال کر سکتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بری عادت وعیب دور ہو سکے جس کی وجہ سے نصیحت کی جارہی ہے صدقہ کرنے سے عذاب ٹل جاتا ہے اور کبھی اس سے وہ عذاب بھی دور ہو جاتا ہے جو حقوق العباد کے سبب سے ہوتا ہے عورتوں کے بارے میں نقصِ مذکور بیان کرنے سے یہ غرض نہیں کہ ان کو اس پر ملامت کی جارہی ہے کیونکہ وہ تو ان کی خلقت وجبلت ہے (اور اسی لئے عذاب ناشکری وغیرہ اعمال پر ہوگا، مذکورہ نقص وعیب کی وجہ سے نہ ہوگا) بلکہ یہ اس لئے بیان کیا کہ ان کے سبب سے کوئی فتنہ میں مبتلا نہ ہو (اور عورتوں کی فطرت پر مطلع رہے) پھر حافظؒ نے لکھا کہ حالتِ حیض میں نماز نہ پڑھنے پر یہ تو ظاہر ہے کہ عورتوں پر گناہ نہیں ہے، البتہ اس میں بحث ہے کہ ترک نماز کے دنوں کا ثواب بھی ملے گا یا نہیں، جس طرح مریض کی نفل نمازیں مرض کی وجہ سے رہ جائیں تو ان کا ثواب ملتا ہے، اگر وہ حالتِ صحت میں ان کا عادی تھا) علامہ نوویؒ کی رائے ہے کہ نہیں ملے گا، کیونکہ دونوں میں فرق ہے، مریض کی نیت ہمیشہ نوافل پڑھنے کی ہوتی ہے، اور اس میں اس کی اہلیت بھی ہوتی ہے، مگر حیض والی میں حیض کے دنوں میں نماز پڑھنے کی اہلیت ہی باقی نہیں رہتی، حافظؒ نے لکھا کہ مجھے اس فرق کو تسلیم کرنے میں تامل ہے (فتح ۲۷۹/۱)

لمحہ فکریہ! اس حدیث کو پوری تفصیل سے امام بخاریؒ نے کتاب الحیض اور کتاب الزکوٰۃ میں بیان کیا اور کتاب النکاح میں بیان نہیں کیا جہاں ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں اس کی ضرورت زیادہ تھی، حالانکہ امام بخاریؒ نے وہاں اور بہت سے عنوانات قائم کر کے اس بارے میں کافی رہنمائی فرمائی ہے، اسی طرح صاحبِ مشکوٰۃ نے ادنیٰ مناسبت سے اس کی حدیث کو صرف کتاب الایمان میں ذکر کیا، کیونکہ کفرانِ عشیر کا ذکر ہے، حالانکہ وہ کفر عقائد وایمان کا نہیں ہے اس طرح متداول کتب حدیث میں بسا اوقات احادیث غیر مظان میں درج ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے تلاش واستفادہ میں دقت ہوتی ہے۔

---

[1] عقل وہ فطری قوت ہے جس سے معانی وکلیات کا ادراک کیا جاتا ہے اور جو برائیوں سے روکتی ہے اور مومن کے قلب میں وہ بطور نورِ خداوندی کے کام کرتی ہے (غالباً اسی سے ہے **واتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله** (مومن کی فراست سے خبردار رہو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے لب اس عقل کو کہتے ہیں جو ہوائے نفسانی سے پاک صاف ہو جاتی ہے (مرقاۃ ۱/۸۱) معلوم ہوا کہ ایمان کے اثر سے انسان کی عقل اور لب دونوں کی خاص قسم کا جلا حاصل ہو جاتا ہے، جس سے غیر مومن محروم ہوتا ہے۔ "مؤلف"

دوسری مثال اس وقت قابل ذکر حدیثِ مسلم بروایتِ جابر ہے جس میں حضور علیہ السلام کے گردِ ازواجِ مطہرات کا جمع ہونا، نفقہ کا سوال کرنا اور حضرت ابوبکر و عمر کا حاضر ہو کر حضرتِ عائشہؓ و حفصہؓ کو تنبیہ کرنا مذکور ہے، وہ باب عشرۃ النساء میں درج ہوتی جس طرح مشکوٰۃ میں ہے لیکن یہ حدیث بخاری میں تو ہے نہیں اور امام مسلم اس کو کتاب الطلاق باب تخيير المراة لايكون طلاقا میں لائے ہیں، پھر یہ کہ سب سے بہتر یہ ہوتا کہ ایسی سب احادیث حضور علیہ السلام کی ازدواجی زندگی کا مستقل عنوان دے کر ایک جگہ جمع کر دی جائیں، ایسا بھی نہیں کیا گیا، گویا بیان اِحکام کا اہتمام ہی زیادہ رہا، حالانکہ حضور علیہ السلام کی پوری زندگی باب وار آنی بھی ضروری تھی کہ وہ بھی تو احکام سے ہی متعلق ہے ''لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة'' غرض ناظرین انوارالباری کا ان امور پر متنبہ رہنا ضروری ہے۔

(۹) حضور اکرم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد کوئی فتنہ مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ نقصان وضرر پہنچانے والا نہ ہوگا (بخاری و مسلم ترمذی وغیرہ) یعنی ان سے زیادہ فتنہ، بلا اور مصیبت میں ڈالنے والی کوئی چیز نہ ہوگی، کیونکہ طبائع کا میلان ان کی طرف زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا، اور وہ ان کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہوں گے، لڑائی جھگڑے، قتل وقتال اور باہمی عداوتیں پیش آئیں گی اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کو دنیا کی حرص ومحبت پر مائل کریں گی، اور اس سے زیادہ کونسا فتنہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کی محبت ساری گناہوں کا ایک گناہ ہے، اور میرے بعد اس لئے فرمایا کہ آپ کی زندگی کے بعد ہی اس فتنہ نے ضرر رسانی کی صورت زیادہ اختیار کی ہے یا پہلے آپ کی برکت سے یہ فتنہ دبا ہوا تھا، آپ کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ (مرقاۃ ص ۳ج ۳)

(۱۰) فرمایا:۔ دنیا میٹھی اور خوش منظر ہے (یعنی ذائقہ بھی عمدہ اور آنکھوں کے لئے بھی تازگی بخشنے والی، جنتِ نگاہ و فردوسِ گوش ہے اور اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی دے کر تمہیں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی دے دیا، تاکہ دیکھے کہ کون کس طرح کے عمل کرتا ہے (خدا کی مرضی کے کام کرتا ہے یا شیطان کو خوش کرنے والے اعمال میں زندگی گزارتا ہے پس دنیا کی محبت اور اس کے جاہ وجلال سے دھوکہ نہ کھا جانا (کہ آخرت کی زندگی تباہ ہو جائے) اور نہ عورتوں سے زیادہ سروکار رکھنا (جس سے محرّمات ومنہیات کا ارتکاب کر بیٹھو اور اپنے دین کو نقصان پہنچا دو) اور یاد رکھو سب سے پہلا فتنہ[1] بنی اسرائیل میں عورتوں ہی کی وجہ سے ظاہر ہوا تھا (مسلم شریف)

(۱۱) فرمایا:۔ نحوست کی علامتیں عورت گھر اور گھوڑے میں ظاہر ہوسکتی ہیں (بخاری و مسلم) صاحبِ مرقاۃ نے لکھا کہ عورت میں اس طرح کہ اس سے اولاد نہ ہو یا اس کا مہر وغیرہ زیادہ ہو (کہ مر دادانہ کر سکے) یا وہ بداخلاق بدزبان وغیرہ ہو، گھر میں تنگی اور بُرے پڑوس کے سبب سے، اور گھوڑے میں اس طرح کہ وہ سرکش منہ زور ہو، آسانی سے سواری کا کام نہ دے اور جہاد میں بھی کام نہ آئے جو شرعاً گھوڑا پالنے کا بڑا مقصد ہونا چاہیے، دوسرا مطلب حدیث کا یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے حضور علیہ السلام نے اپنی امت کو ہدایت کی ہے کہ اگر گھر کسی وجہ سے اچھا نہ ہو تو اس کو بدل دے، بیوی اگر موافقِ مزاج اور رکھنے کے قابل نہ ہو تو اس کو طلاق دے دے اور گھوڑا اگر ٹھیک نہ ہو تو اس کو فروخت کر دے، لہٰذا اس حدیث سے بدفالی لینے کا جواز نہیں نکلتا اور دوسری حدیث میں اس کی صراحت سے ممانعت آئی ہے اور حضرت عائشہؓ سے شوم (نحوست) کا مطلب سوءِ خلق (بدخلقی) وارد ہے یعنی ان چیزوں کی وجہ سے سوءِ خلق کی نوبت آتی ہے اس کے علاوہ یہ کہ امام مالک، احمد اور بخاری نے اس حدیث کو بہ لفظ ان كان الشوم فى شئى ففى الدار الخ روایت کیا ہے، یعنی اگر نحوست ہوا کرتی تو ان تین چیزوں میں ہوتی (مرقاۃ ص ۵ ج ۴)

(۱۲) فرمایا:۔ اے نوجوانو:۔ اگر تم مہربان ونفقہ کی استطاعت رکھتے ہو تو ضرور نکاح کرو کہ اس سے نگاہ وشرم گاہ کی حفاظت

---

[1] یہاں بھی فتنہ کی ابتداء عورتوں سے ہوئی، مردوں سے نہیں، معلوم نہیں علامہ آزادؒ نے اس کی کیا تاویل سوچی ہوگی، اور علامہ مودودیؒ دام فیضہم اس حدیث مسلم کا کیا جواب دیں گے جو کہتے ہیں کہ اس قسم کے تخیل سے عورتوں کی پستی ثابت ہوتی ہے جس کی جوابدہی میں ہمیں دقت پیش آتی ہے، حالانکہ خود ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کے مطابق اسلامی احکام کی تعبیر کرنا سخت غلطی ہے وغیرہ ملاحظہ ہو پردہ ۳۵۳، ۳۵۵، ۳۸۵، ۳۹۰!'' مؤلف''

ہے(بخاری ومسلم) یعنی بُری نگاہوں سے بچو گے جو زنا کا پیش خیمہ ہوتی ہیں،اور زنا سے بھی جو شریعت واخلاق کی رو سے جرم عظیم ہے،قرآن مجید میں ہے یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور (اللہ تعالیٰ نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتے ہیں اور دلوں کے بُرے ارادوں سے بھی واقف ہیں) مفسرین نے لکھا کہ اجنبی عورتوں پر جو نفسانی وشہوانی قسم کی نظریں پڑتی ہیں،اور ان کے زیر اثر جو دلوں میں ناجائز جنسی میلانات پیدا ہوتے ہیں،ان سب کو خدا دیکھتا اور جانتا ہے اور ان سب پر آخرت میں مواخذہ ہوگا،اور اگر اتفاقاً نگاہ کا گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے فوراً توبہ کرنی چاہیے تا کہ اس کی خرابی کا اثر دلوں تک نہ پہنچے اور دل کے مبتلا ہونے پر بھی اگر تنبیہ ہو جائے تو استغفار کر کے اس کے سیاہ داغ مٹا دے اور اس کے آگے ظاہری جوارح (ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ) کے ذریعہ اس معصیت کو ہرگز نہ بڑھنے دیں،کیونکہ زنا تک پہنچانے والی سب باتیں زنا کے حکم میں ہو جاتی ہیں،اللہ تعالیٰ ان سب سے محفوظ رکھے اور غضب الٰہی میں مبتلا ہونے سے بچائے،درحقیقت بری نظریں ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ہیں،جن سے انسان کے اخلاق وروحانیت مسموم ہوتی ہیں۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جس طرح مردوں کی نظریں اجنبی عورتوں پر پڑ کر خیانت کرتی ہیں،عورتوں کی نظریں بھی اجنبی مردوں پر پڑ کر خیانت کی مرتکب ہوتی ہیں،اسی لئے بری نگاہیں ہٹانے کا حکم دونوں کو برابر سے ہوا ہے اور فتنے کے اسباب دونوں کی طرف سے مہیا ہو سکتے ہیں،کسی ایک جنس کو زیادہ پاکدامن یا زیادہ بداطوار قرار دینا درست نہیں ہے۔

حدیث مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص باوجود استطاعت کے نکاح نہ کرے،یا نکاح کے بعد بھی بدنظری وغیرہ کے گناہوں میں مبتلا ہو تو دونوں صورتوں میں گناہ گار ہوگا،اسی طرح اگر عورت نکاح کے بعد غیر مردوں کو تانکتی جھانکتی ہے یا ان کے سامنے اظہار زینت کرتی ہے یا کسی اور طور طریقہ سے ان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے تو وہ بھی گناہ گار ہوتی ہے۔

(۱۳) ارشاد فرمایا:۔ کسی عورت سے نکاح چار وجہ سے کیا جاتا ہے،مال کی وجہ سے (کہ عورت مالدار ہو یا بہت سا جہیز لائے گی،حسب نسب کی وجہ سے (کہ بڑے خاندان یا وجاہت والی ہے) حسن وجمال کی وجہ سے،اور دین کی وجہ سے (کہ دینداری اور حسن سیرت وکردار کی حامل ہو) پھر فرمایا کہ ان سب میں بہتر دیندار عورت ہے اس سے تمہیں دین ودنیا کی فلاح حاصل ہو سکتی ہے اگر تم نے اس پر دوسرے اوصاف کو ترجیح دی تو تم بہت بڑی خیر وفلاح سے محروم رہو گے (بخاری ومسلم) تربت یداک کا یہی مطلب صاحب مرقاۃ نے بیان کیا ہے اور قاضیؒ کا قول شرح حدیث کے لئے نقل کیا کہ عام طور سے لوگ عورتوں کے نکاح میں ان چار باتوں میں سے کوئی بات دیکھا کرتے ہیں،لیکن شرافت ودیانت کا صحیح تقاضہ یہ ہے کہ اوّل درجہ میں عورت کا دین واسلامی سیرت مطمع نظر ہو،اور باقی اوصاف کا لحاظ ثانوی درجہ میں ہو،محقق ابن الہمامؒ نے فرمایا کہ اگر نکاح کے وقت عورت کی صرف عزت مال وحسب نسب پر نظر ہو تو وہ نکاح شرعاً ممنوع ہوگا (یعنی اگر دین کا لحاظ بالکل نظرانداز کیا گیا تو وہ شریعت کی نظر میں کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتا جبکہ نکاح ایک شرعی چیز ہے اور اس میں شریعت کی پسندیدگی کو پہلا درجہ ملنا چاہیے) چنانچہ اوسطِ طبرانی کی حدیث ہے کہ جو کوئی عورت کی عزت ومنصب کی وجہ سے نکاح کرے گا اس کے نصیب میں اللہ تعالیٰ ذلت دیں گے،جو مال کی وجہ سے کرے گا اس کو فقر وافلاس میں مبتلا کریں گے،جو حسب ونسب کی وجہ سے کرے گا،اس کو پستی میں ڈال دیں گے،اور جو صرف اس بہتر مقصد کے لئے کرے گا کہ اپنی نگاہ کو پاک رکھے اور عفت وتقویٰ اختیار کرے یا صلہ رحمی کے لئے کرے تو اللہ دونوں میاں بیوی کو خیر وبرکت سے نوازے گا ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ حسن وجمال کی وجہ سے نکاح مت کرو،ان کا حسن وجمال تکبر وغرور میں مبتلا کر کے ان کو برباد کرنے کا سبب ہو سکتا ہے اور مال کی وجہ سے بھی نہ کرو اس کی وجہ سے ان میں سرکشی پیدا ہو جاتی ہے،البتہ دین کی حیثیت سے جو بہتر ہو اس سے نکاح کرو،کیونکہ دیندار عورت اگر کالی صورت کی اور جسمانی عیب والی بھی ہو تو وہ سب سے افضل وبہتر ہے،شرح السنہ میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت حسنؓ سے اپنی بیٹی کے بارے میں مشورہ طلب کیا کہ رشتے بہت سے آئے ہیں کس سے

کروں؟ آپ نے فرمایا ایسے شخص سے کرو جو خدا سے ڈرتا ہو، کہ وہ اگر اس کو پسند کرے گا تو اس کا اکرام کرے گا، اگر ناپسند ہوگی تب بھی ظلم سے تو باز رہیگا، یعنی جو دیندار و متقی نہ ہوگا، وہ ظلم و زیادتی تک بھی نوبت پہنچادے گا (مرقاۃ ۳۰۳؍۳)

(۱۴) ارشاد فرمایا کہ دنیا کی ساری نعمتیں محدود، عارضی اور تھوڑے وقت کے فائدہ کی ہیں، اور ان میں سب سے بہتر دنیا کی نعمت نیک بیوی ہے (مسلم شریف) کیونکہ وہ آخرت والی ہمیشہ کی زندگی سنوارنے میں مدد دیتی ہے، اسی لئے حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ میں حسنہ سے مراد نیک بیوی ہے اور فی الاخرۃ حسنۃ سے مراد حورِ جنت ہے اور وقنا عذاب النار سے مراد زبان دراز و بدزبان عورت ہے، علامہ طیبی نے کہا کہ صالحہ کی قید نے بتلایا کہ اگر عورت میں صلاح نہ ہو تو وہ موجب شر و فساد ہے۔ (مرقاۃ ۳۰۴؍۳)

(۱۵) فرمایا: جب کبھی تمہیں کسی اچھے دین واخلاق والے لڑکے یا لڑکی کا رشتہ میسر ہو، اس کو قبول کر کے نکاح میں جلدی کرو، اگر ایسا نہ کرو گے تو بڑے فساد و فتنہ کا اندیشہ ہے (ترمذی شریف) یعنی اگر تم مال و جاہ کی تلاش میں رہ کر تاخیر کرو گے تو بہت سے لڑکے اور لڑکیاں بغیر نکاح کے رکی رہیں گی، جس سے بداخلاقی زنا وغیرہ کا شیوع ہوگا اور اس کی وجہ سے تباہی و بربادی آئے گی، علامہ طیبی نے کہا کہ اس حدیث سے امام مالکؒ کی دلیل ملتی ہے جو کہتے ہیں کہ کفاءت میں صرف دین کا اعتبار ہے اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ چار چیزوں میں برابری دیکھی جائے، دین، حریت، نسب اور پیشہ لہٰذا مسلمان عورت کا نکاح کافر سے، نیک عورت کا فاسق فاجر سے، آزاد عورت کا غلام سے، اعلیٰ نسب والی کا کم نسب سے تاجر یا اچھے پیشہ والی کی لڑکی کا اس مرد سے جو کوئی خبیث وگندہ پیشہ کرتا ہو، نکاح درست نہیں ہوتا، لیکن اگر خود عورت یا اس کا ولی غیر کفو میں نکاح پسند کرے تو نکاح ہو جائے گا۔ (مرقاۃ ۳۰۶؍۳)

(۱۶) تقوائے خداوندی کے بعد سب سے بڑی نعمت ایک مومن کے لئے نیک بیوی ہے جس کو حکم کرے تو وہ فرمانبرداری کرے، اور اس کو دیکھے تو شوہر کا دل خوش کردے، اگر اس کے بھروسہ پر شوہر کوئی قسم اٹھالے تو وہ بیوی اس کو پورا کر دکھائے اور اگر شوہر باہر چلا جائے تو وہ بیوی اپنے بارے میں پاکدامن اور شوہر کے مال میں خیرخواہ ثابت ہو (ابن ماجہ)

اطاعت کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کا حکم حدِ شرع میں ہو کیونکہ شریعت کے خلاف امور میں اطاعت جائز نہیں، دل خوش کرے یعنی اچھی صورت وسیرت وحسنِ معاشرت سے ہنس مکھ اور با اخلاق ہو، قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم اٹھالے جو بیوی کو ناپسند ہو پھر بھی وہ شوہر کی قسم پوری کرنے کو اپنی مرضی کے خلاف اس کام کو کردے یا ترک کردے کیونکہ اس سے وہ شوہر کی موافقت کے لئے اپنی مرضی پر اس کی مرضی کو ترجیح دینے کا ثبوت پیش کرے گی (مرقاۃ ۳۰۸؍۳)

(۱۷) فرمایا: سب سے بڑی برکت وخیر والا نکاح وہ ہے جس میں بوجھ بار کم سے کم ہو (بیہقی) یعنی مہر و نفقہ وغیرہ کا بار زیادہ نہ ہو (مرقاۃ ۳۰۸؍۳)

(۱۸) فرمایا نکاح کے ذریعہ آدھا دین محفوظ ہو جاتا ہے چاہیے کہ خدا سے ڈر کر باقی نصف دین کی بھی حفاظت کرے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ دین میں خرابی بدکرداری یا حرام خوری دو طریقوں سے آتی ہے نکاح کرنے سے نفس وشیطان کے مکائد سے بچ سکتا ہے کہ نگاہ کے گناہ اور بدچلنی کی راہ سے دور ہو جاتا ہے، آگے روزی کمانے اور کھانے پینے کے حرام طریقوں سے بچنا آدھے دین کی حفاظت کا سبب ہو جائے گا۔ (مرقاۃ ۳۰۸؍۳)

(۱۹) رسول اکرم ﷺ سے کسی اجنبی عورت پر اچانک بلا ارادہ نظر پڑ جانے کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا آئندہ نظر کو ہٹالو (مسلم شریف) یعنی دوبارہ نظر مت ڈالو، کیونکہ پہلی نظر بلا اختیار ہونے کی وجہ سے معاف ہے اور اگر دیکھے جائیگا تو گناہ ہوگا، قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ اگر عورت اپنا چہرہ بھی نہ چھپائے تب بھی مرد کو اپنی نگاہ نیچی کرنا ضروری ہے صرف ضرورتِ شرعی صحیح کے وقت نظر جائز ہے (مرقاۃ ۳۱۰؍۳)

(۲۰) فرمایا: عورت سامنے سے آئے یا پیچھا پھر کر جائے شیطان کی صورت میں ہوتی ہے (کہ اس سے بھی دل میں برے خطرات ووساوس آتے ہیں اور گمراہی، فتنہ وفساد کا سروسامان ہوتا ہے، لہٰذا اگر اتفاقاً کوئی عورت سامنے آجائے اور قلب ونظر کو اچھی معلوم ہو اور برے خیالات آئیں تو چاہیے کہ اپنی بیوی کا خیال وتصور کرے اور اسکے پاس جائے اس سے وہ دل کے برے خیالات ختم ہو جائیں گے (مسلم شریف)

علامہ نوویؒ نے لکھا کہ عورت کو شیطان سے مشابہت اس لئے ہے کہ وہ بھی برائی وشر کی طرف بلاتا ہے اور برائی کو مزین کر کے پیش کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو بلا ضروت کے اپنے گھر سے نکلنا نہ چاہیے اور نہ لباس فاخرہ پہنے، اور مردوں کو چاہیے کہ اس کی طرف اوراس کے لباس کی طرف نہ دیکھیں الخ (مرقاۃ ۱۰؍۳)

(۲۱) ارشاد فرمایا: عورت جب باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو مردوں کی نظروں میں حسین وجمیل بنا کر پیش کرتا ہے (ترمذی شریف) یا اس کو شیطان امید وطمع کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کو بھی گمراہ کرے گا، اوراس کی وجہ سے دوسروں کو بھی (کہ دونوں طرف جنسی میلانات کو ابھارے گا، اسی لئے عورتوں کو شیطان کے جال بھی کہا گیا، یا شیطان سے مراد انسانوں میں کے شیطان ہیں اہل فسق وفجور میں سے کہ جب وہ عورت کو باہر نکلتے دیکھتے ہیں تو شیطانی وساوس وخیالات دل میں ڈالتے ہیں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ عورت جب باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے خیالات وجذبات پر تسلط کر کے اس کو خبیثات کے زمرے میں داخل کرا دیتا ہے، حالانکہ وہ پہلے سے طیبات میں سے تھی (مرقاۃ ۱۱؍۲)

(۲۲) کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے، کیونکہ ان کا تیسرا شیطان وہاں ضرور ہوتا ہے (ترمذی شریف) یعنی شیطان اس موقع پر ضرور دونوں کے خیالات خراب کر کے گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرے گا، اس لئے ایسی صورت سے سخت اجتناب کرنا چاہیے (مرقاۃ ۱۳؍۴)

(۲۳) ایسی عورتوں کے پاس ہرگز نہ جاؤ، جن کے شوہر گھر پر نہ ہوں، کیونکہ شیطان تمہاری رگوں میں خون کی طرح دوڑتا پھرتا ہے (یعنی تم محسوس بھی نہیں کر سکتے اور وہ اپنا کام شروفساد پر آمادہ کرنے کا برابر کرتا رہتا ہے) صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ کے لئے بھی شیطان ایسا ہی ہے؟ آپ نے فرمایا! ہاں! میرے لئے بھی، مگر حق تعالیٰ نے میری مدد فرمائی کہ اس کے شر سے مامون رہتا ہوں (مرقاۃ ۱۳؍۳) اس حدیث کی مکمل ومفصل شرح مرقاۃ ۱۶؍۱ میں ہے۔

(۲۴) ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ بری نظر ڈالنے والے پر اور اس پر بھی جو بغیر کسی عذر وضرورت کے اپنے کو دکھائے لعنت بھیجتا ہے یعنی ان دونوں کو اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے (بیہقی) معلوم ہوا ہر ناجائز نظر لعنت کی مستحق ہے (مرقاۃ ۱۵؍۳)

(۲۵) فرمایا: جس مسلمان مرد کی پہلی نظر اتفاقاً کسی عورت کے حسن وجمال پر پڑ جائے اور وہ اپنی نظر ہٹا لے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسی عبادت کی توفیق عطا فرمائے گا جس کی حلاوت اس کو محسوس ہوگی۔ (مسند احمد) علامہ طیبی نے فرمایا کہ ایسے شخص کے لئے عبادات کی مشقت وتکلیف باقی نہیں رہتی اور ایسے مقام سے سرفراز ہو جاتا ہے، جس میں نماز وغیرہ عبادات آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہیں (مرقاۃ ۱۴؍۴) پہلے بدنظری کے نقصانات ومضرتیں معلوم ہوئی تھیں اور یہاں اس سے بچنے پر انعام عظیم بتلایا گیا ہے۔ وللہ الحمد والمنہ۔

(۲۶) ارشاد فرمایا: اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ سڑا کرتا، اور اگر حواؑ نہ ہوتیں تو کوئی عورت ساری عمر کبھی اپنے شوہر کی خیانت نہ کرتی (بخاری ومسلم) یعنی بنی اسرائیل نے حکم خداوندی کے خلاف بٹیروں کا گوشت ذخیرہ کیا تھا اس لئے سزا ملی کہ وہ سڑنے لگا، اس سے پہلے کتنے ہی دن رکھا رہتا تھا تب بھی نہ سڑتا تھا، قال تعالیٰ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وا ما بانفسھم اور حضرت حواؑ نے حکم خداوندی کے خلاف شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے کا پہلے ارادہ کیا پھر حضرت آدم علیہ السلام کو بھی رغبت دے دے کر آمادہ کر لیا، پھر دونوں نے ساتھ کھایا، اور نافرمانی کی، جس پر عتاب الٰہی کے مستحق ہوئے، خیانت کا صدور اسی عوج وٹیڑھ پن کے سبب ہوا جو عورت کی طینت

وجہیت میں رکھا گیا ہے بعض نے کہا کہ خیانت یہ تھی کہ حضرت حواءؑ نے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے اس پھل کو کھایا تھا، حالانکہ انہوں نے بھی حضرت حواؑ کو اس سے روکا تھا، پھر حضرت حواءؑ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی کھانے پر آمادہ کرلیا (مرقاۃ ۲۶۱؍۳)

بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت حواءِ کو سب سے پہلے گناہ کا مرتکب قرار دینا عورت کے مرتبہ کو گرانا ہے، وہ لوگ بخاری و مسلم کی اس حدیث کا کیا جواب دیں گے؟ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے ابتداء نہیں کی تو کیا حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلا مرتکبِ گناہ قرار دیا جائے گا، جو سب سے پہلے خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے، رہا یہ احتمال کہ دونوں نے بیک وقت آنِ واحد میں گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا، تب بھی تو اولیت کی نسبت دونوں ہی کی طرف ہوگی، اور ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمت و عصمت کی رعایت غیر پیغمبر کی عصمت کے مقابلہ میں فرق مراتب کے اصول سے بھی نہایت ضروری ہے معلوم نہیں صنف نازک کی اس قدر حمایت کا بے پناہ جذبہ دل ودماغ کی گہرائی میں کیسے اتر گیا کہ نہ صرف مرد کے مقابلہ میں بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کے مقابلہ میں بھی اس کو ابھار کر آگے لانے کی سعی کرنی پڑی، والد نیادارالعجائب ہم اس بارے میں پہلے بھی کچھ لکھ آئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۲۷) ارشاد فرمایا:۔ جو شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے، اور وہ بغیر کسی عذرِ شرعی کے انکار کردے اور شوہر کو ناراض کرے تو فرشتے صبح تک اس عورت پر لعنت بھیجتے ہیں (بخاری و مسلم) ایک روایت ہے کہ حق تعالیٰ آسمان پر اس عورت سے ناراض ہوتے ہیں یہاں تک کہ شوہر اس سے راضی ہوجائے، جب شوہر کی مذکورہ حاجت کے لئے اطاعت نہ کرنے پر حق تعالیٰ کی ناراضی اس طرح متوجہ ہوتی ہے تو ظاہر ہے اگر شوہر کسی دینی امر کے لئے حکم کرے اور بیوی تعمیل نہ کرے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا غضب وغصہ کس قدر رہتا ہوگا؟! (مرقاۃ ۲۶۳؍۳/۲)

(۲۸) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ سے سخت غم وغصہ کے تحت ایک ماہ تک علیحدہ رہنے کہ قسم کھائی تھی (بخاری ۷۸۲) یہ واقعہ بخاری وغیرہ میں تفصیل سے آیا ہے اور مشہور ہے اس کے بعد آیتِ تخییر نازل ہوئی جس میں ازواجِ مطہرات کو اختیار دیا گیا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ رہنا ہے تو تنگی ترشی سے جس طرح بھی آپ چاہیں گے گزارہ کرنا پڑیگا کیونکہ آپ کو اختیاری طور سے فقر وفاقہ کی زندگی ہی محبوب و پسندیدہ تھی، ورنہ ان کو آپ سے الگ ہوجانے کا اختیار ہے، اس پر سب نے حضور علیہ السلام کی رفاقت ہی کو اختیار کرلیا تھا۔

معلوم ہوا کہ عورتوں کی طینت وسرشت میں حبّ جاہ ومال اور شوق زیب وزینت رکھدیا گیا ہے، اور جب بھی اس جذبہ کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے یہ ضرور ابھرتا ہے حتی کہ اس سے سید المرسلین علیہ افضل الصلوات والتسلیمات کا گھرانہ بھی محفوظ ومستثنیٰ نہیں رہا، اور بڑی آزمائشوں کے بعد آخری دورِ نبوت میں ازواجِ مطہراتؓ کے مزاج پوری طرح سے مزاج نبوت کے موافق ہوسکے، اور آپ کی گھریلو زندگی کے واقعات سے بہت بڑا سبق اور ہدایت کا سرچشمہ ملتا ہے اور ان واقعات سے حضورِ اکرم علیہ السلام کی انتہائی اولوالعزمی اور صبر عظیم کا ثبوت ملتا ہے۔

ومایلقها الا الذین صبروا وما یلقها الا ذو حظ عظیم !صبرِ عظیم اور حظِ عظیم والے ہی اس آزمائش میں کامیاب ہوسکتے ہیں) مرقاۃ ۳/۴۶۰ میں ایک قول نقل کیا گیا ہے، الصبر عنهن الیسر من الصبر علیهن، والصبر علیهن اهون من الصبر علے النار، قال تعالیٰ وان تصبر واخیر لکم (نساء) ای علیهن اور عنهن، یعنی عورتوں کے بغیر اس دنیا میں گزر کرنا بھی دشوار تو ہے مگر اس سے آسان ہے کہ ان کے ساتھ رہ کر ان کی وجہ سے پیش آنے والی تلخیوں پر صبر کرے، اور ان پر صبر کرنا آگ پر صبر کرنے سے آسان ہے گویا عورتوں کے ابتلاء سے بڑا ابتلاء صرف آگ یا دوزخ ہی کا ابتلاء ہوسکتا ہے یا یہ کہ اس سے بڑا ابتلاء دنیا میں دوسرا نہیں ہے اس لئے کہ یہ اپنوں سے اور اپنے گھروں میں پھر ہر وقت اور خلافِ توقع پیش آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۲۹) ارشاد فرمایا:۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم کرتا تو عورت کو حکم کرتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے اور فرمایا کہ جو عورت شوہر کو راضی چھوڑ کر مرجائے وہ جنت کی مستحق ہوجاتی ہے (ترمذی شریف) یعنی عورت پر اپنے شوہر کے اتنے زیادہ حقوق ہیں کہ وہ ان کو ادا

کرنے سے عاجز ہیں اور صرف سجدہ سے اس کی ادائیگی یا شکر بجا آوری ہو سکتی تھی، جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ یہ حق صرف معبودِ حقیقی کے لئے مخصوص ہو چکا، یہ مجبوری نہ ہوتی تو عورت اپنا حقِ شکر ادا کر دیتی، اور عورت کا شوہر اگر عالم متقی ہو تو ظاہر ہے اس کی اطاعت و رہنمائی میں عورت نے تمام حقوقِ خداوندی و حقوقِ عباد ادا کئے ہوں گے اس لئے اس کا مستحق جنت ہونا بھی بے شبہ ہے (مرقاۃ ۴۶۷/۳)

(۳۰) حضرت لقیط بن صبرہؓ راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری بیوی زبان دراز اور بدزبان ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو طلاق دے دو، میں نے کہا اس سے میرے بچے ہیں اور ایک مدت سے میرا اس کا ساتھ ہے (یعنی طلاق دینا مصلحت و مروت کے خلاف ہے) فرمایا اچھا اس کو نصیحت کرو، سمجھاؤ، اگر اس میں خیر کا کچھ جزو ہے تو تمہاری نصیحت قبول کرے گی اور دیکھو کبھی اپنی بیوی کو باندیوں کی طرح نہ مارنا (ابوداؤد) دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ کی بندیوں کو مت مارو، حضرت عمرؓ نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا کہ (آپ کے ارشاد پر) عورتیں مردوں پر اور زیادہ حاوی ہو گئی ہیں آپ نے مارنے کی اجازت دے دی تو پھر بہت سی عورتوں نے حضور علیہ السلام کے گھروں میں جا کر اپنے شوہروں کی مار کی شکایت کی، اس پر آپ نے فرمایا کہ میرے اہل وعیال کے پاس بہت سی عورتیں اپنے ازواج کی شکایت لے کر آئی ہیں، ایسے لوگ اچھے نہیں ہیں۔ (ابوداؤد) یعنی تم میں سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کی باتوں پر صبر وتحمل کریں، اور بغیر مار پیٹ کے ہی سمجھا بجھا کر کام لیں، ان کو ادب وسلیقہ بتائیں، اور اتنی مار پیٹ تو کبھی بھی نہ کریں جس کی وہ شکایت کرتی پھریں، ترتیب احکام اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام نے پہلے مارنے سے روکا ہوگا، اس پر وہ اور دلیر ہو گئیں، اور حضرت عمرؓ کو اس امر کی حضور علیہ السلام کی خدمت میں شکایت کرنی پڑی تو آپ نے مارنے کی اجازت دی اور اس کی موافقت میں آیت بھی اتری جس میں دوسری تدابیر موثر نہ ہونے کی صورت میں مارنے کی اجازت ہوئی، پھر جب لوگوں نے زیادہ مار پیٹ کی اور اس کی شکایت آئی تو آخر میں آپ نے فرمایا کہ گو عورتوں کی بداخلاقی وغیرہ پر ان کو مارنا مباح ہے لیکن ان کے اس طرزِ عمل کے مقابلہ میں بھی تحمل وصبر کرنا اور نہ مارنا ہی زیادہ بہتر و افضل ہے، امام شافعیؒ سے بھی یہی مراد نقل ہوئی (مرقاۃ ۴۶۸/۳)

(۳۱) مومنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہوں اور جو اپنے اہل کے ساتھ زیادہ لطف ومحبت سے پیش آنے والے ہوں دوسری حدیث میں فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے بہتر ہیں (ترمذی شریف) اس لئے کہ کمالِ ایمان حسنِ خلق اور تمام انسانوں کے ساتھ احسان کرنے کا مقتضی ہے (مرقاۃ ۴۶۸/۳)

(۳۲) فرمایا جس شخص کو چار چیزیں مل گئیں، اس کو دنیا وآخرت کی خیر وفلاح مل گئی، شکر گذار دل خدا کو یاد کرنے والی زبان، دنیا کی مصیبتوں اور بلاؤں پر صبر کرنے والا بدن اور پاکدامن ہمدرد بیوی (بیہقی) یعنی ایسی پاک دامن اور عفت مآب ہو کہ وہ دوسرے مرد کو نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھے اور نہ اس سے کسی قسم کی خیانت کا احتمال وخطرہ ہو، اور شوہر کے مال وسامان کے بارے میں پوری طرح خیر خواہ وہمدرد ہو (مرقاۃ ۴۷۱/۳)

(۳۳) فرمایا:۔ علیحدگی پسند اور خلع وطلاق سے رغبت رکھنے والی عورتیں منافقوں میں شمار ہیں (نسائی شریف) یعنی جو عورتیں دل سے اپنے شوہروں کی محبت نہیں کرتیں، یا ان کے تعلق کو پسند نہیں کرتیں، اور جو عورتیں بغیر کسی معقول سبب کے خلع وطلاق کے لئے موقع اور بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہیں، (ان کا یہ عمل منافقانہ ہے اس لئے) وہ منافقوں کی طرح گنہگار ہیں (مرقاۃ ۴۸۱/۳)

(۳۴) ایک شخص نے عرض کیا، میری بیوی غیر مردوں سے احتیاط نہیں کرتی، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کو طلاق دے دو اس نے کہا مجھے اس سے بہت تعلق ومحبت ہے، فرمایا، ایسا ہے تو اس کو روکو (ابوداؤد ونسائی شریف) اس سے معلوم ہوا کہ کسی مجبوری میں ایسی عورت سے بھی شادی کر سکتے ہیں جس سے فجور یا بدچلنی کا اندیشہ ہو مجبوری مثلاً یہ کہ دوسری اس کو پسند یا میسر نہ ہو اور بغیر نکاح کے زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، وغیرہ ایسی صورت میں واجب ہے کہ اس کو ہر طرح سے سمجھائے اور پوری کوشش اس کی حفاظت میں کرے (مرقاۃ ۵۰۵/۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بہتر یہی ہے کہ ایسی عورت کو طلاق دے دو، جس طرح حضور علیہ السلام نے بدزبان عورت کے لئے بھی طلاق ہی کا مشورہ دیا تھا، مگر حالات کی مجبوری سے رکھ لینا بھی حدّ جواز میں ہے بشرطیکہ صبر وتحمل اور حفاظت پر قادر ہو۔

(۳۵) ارشاد فرمایا:۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مال ودولت عطا کرے تو پہلے اسکو اپنے اوپر اور اپنے اہل بیت (ازواج واولاد) پر خرچ کرے (مسلم شریف)

(۳۶) ایک عورت دوسری سے اتنی بے تکلف نہ ہو جائے کہ اپنے شوہر کی راز وتنہائی کی باتیں بھی اس سے کہہ دے اور اس غیر مرد کے علم میں وہ باتیں اس طرح آجائیں جیسے وہ خود ان کو دیکھ رہا ہو (ابوداؤد وترمذی) معلوم ہوا کہ اس طرح کا راز افشاء کرنا شرعاً حرام ہے، اور چونکہ شرعی حکم کی قیمت واہمیت صرف مسلمان عورتیں ہی سمجھ سکتی ہیں، اسلئے علماءِ نے لکھا کہ غیر مسلم عورتوں کے سامنے بھی مسلمان عورتوں کو بے محابا وبے حجاب نہ آنا چاہیے اور اپنی خاص زیب وزینت اور جسمانی زیبائش ان پر ظاہر نہ کرنی چاہیے کہ وہ اپنے مردوں سے کہیں گی، جس سے خرابیوں کا دروازہ کھلے گا، اسی طرح بدچلن عورت کا بھی حکم ہے خواہ وہ مسلمان ہی ہوں کیونکہ اول تو ان کی صحبت وزیادہ اختلاط سے بھی احتراز چاہیے' دوسرے وہ بھی اس کی عادی ہوتی ہیں کہ عورتوں کے محاسن، غیر مردوں تک پہنچاتی ہیں۔

(۳۷) سب سے زیادہ بدترین اور خدائے تعالیٰ کی نظر میں گراہوا وہ مرد یا عورت ہے، جو زن وشوہر کی راز کی باتیں دوسروں سے کہے (مسلم وابوداؤد)

(۳۸) جو شخص حالتِ حیض میں اپنی بیوی سے مقاربت کرے اور پھر اس سے جو بچہ پیدا ہو وہ جذام میں مبتلا ہو جائے تو اسے اپنے ہی نفس کو ملامت کرنی چاہیے۔ (اوسط)

(۳۹) جو عورت اپنے شوہر کو تکلیف دیتی ہے اس کو حورِ جنت کہتی ہے کہ خدا تیرا بُرا کرے اس کو ایذا مت دے، وہ تو تیرے پاس چند روز کا مہمان ہے، جلد ہی تجھ سے جُدا ہو کر ہمارے پاس آجائے گا (ترمذی شریف)

(۴۰) دو آدمیوں کی نماز سر سے اوپر نہیں جاتی (یعنی قبول ہو کر خدا کے حضور نہیں جاتی) ایک غلام مالک سے بھاگا ہوا، دوسرے وہ عورت جو شوہر کی نافرمانی کرے، جب تک وہ دونوں باز نہ آئیں (اوسط • وصغیر بحوالہ جمع الفوائد ۲۲۷/۱)

(۴۱) حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ میری نظر میں وہ عورت مبغوض ہے جو اپنے گھر سے نکل کر دوسروں سے اپنے شوہر کی شکایتیں کرتی پھرے (کبیر واوسط)

(۴۲) فرمایا:۔ عورتیں حمل وولادت کی سختیاں جھیلتی ہیں اور بچوں کو رحم وشفقت سے پالتی ہیں، اگر وہ شوہروں کے ساتھ بدسلوکی وکج خلقی وغیرہ کی باتیں نہ کریں تو ان میں سے نماز پڑھنے والیاں تو ضرور ہی جنت میں داخل ہو جائیں گی (قزوینی)

(۴۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک دن حضور علیہ السلام کے لئے حریرہ تیار کیا، حضرت سودہؓ بھی موجود تھیں میں نے ان سے کھانے کو کہا تو انکار کر دیا، میں نے کہا یا تو کھاؤ ورنہ یہ حریرہ تمہارے منہ پر مل دوں گی، اس پر بھی انہوں نے انکار ہی کیا تو میں نے حریرہ کے پیالہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے منہ پر خوب اچھی طرح سے مل دیا، حضور علیہ السلام یہ دیکھ کر ہنسے اور پھر حضرت سودہ سے فرمایا کہ اب تم اسی طرح عائشہ کا منہ خراب کرو، انہوں نے ایسا ہی کیا، اور حضور دیکھ کر ہنستے رہے اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے آپ نے فرمایا جاؤ! اٹھ کر اپنے اپنے منہ دھولو، اس کے بعد میں حضرت عمرؓ سے ڈرنے لگی، کیونکہ حضور علیہ السلام کو ان کا لحاظ کرتے دیکھا (موصلی ۲۲۹/۱)

(۴۴) حضرت رزینہؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت سودہؓ حضرت عائشہؓ وحفصہؓ کے پاس عمدہ لباس وزینت میں آئیں، حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ یہ اس طرح آئی ہیں اور ایسی حالت میں حضور علیہ السلام آجائیں گے تو ہم کو پھٹے پُرانے کپڑوں میں بُرے حال سے دیکھیں گے اور یہ ہمارے بیچ میں زرق برق لباس پہنے بجی بیٹھی ہوگی، دیکھو! میں اس کا علاج کروں گی، پھر حضرت سودہؓ سے کہا تمہیں کچھ خبر بھی ہے وہ کانا دجال نکل آیا، وہ یہ سُن کر ڈر گئیں اور سارا بدن کپکپانے لگا، اور کہنے لگیں میں کہاں چھپوں؟ حضرت حفصہؓ نے کہا کہ یہ سامنے خیمہ

ہے اس میں چھپ جاؤ، وہ جا کر اس میں گھس گئیں اور وہاں گندگی اور مکڑی کے جالے وغیرہ تھے، اتنے ہی میں حضور علیہ السلام تشریف لے آئے اور ان دونوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا کہ بات نہ ہوسکتی تھی، آپ نے پوچھا ہنسنے کی کیا بات ہے؟ تین مرتبہ دریافت کرنا پڑا، تب انہوں نے ہاتھوں سے اشارہ کر کے بتلایا کہ خیمہ میں جا کر ملاحظہ کریں، آپ وہاں گئے تو حضرت سودہ وہاں موجود ہیں اور کپکپی سے ان کا بُرا حال ہے، آپ نے فرمایا، سودہ! تمہیں کیا ہوا، یہاں کیوں چھپی ہو؟ کہا یارسول اللہ! کانا دجال ظاہر ہوگیا ہے، آپ نے فرمایا نہیں، کہیں نہیں نکلا! البتہ کبھی نکلے گا ضرور، پھر آپ نے ان کو خیمہ کے اندر سے نکالا اور ان کے کپڑوں پر سے گردوغبار اور مکڑی کے جالوں کو جھاڑا (موصلی وطبرانی)

فائدہ! اس قسم کے حضور علیہ السلام اور ازواجِ مطہرات کے خوش طبعی کے واقعات میں بھی بہت کچھ سبق اور ہدایت ملتی ہے کہ کچھ وقت اگر غم غلط کرنے کے لئے یا کسی کا دل خوش کرنے میں صرف ہوجائے تو وہ بھی دین ودیانت کے خلاف نہیں اسی لئے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ سے مزاح اور خوش طبعی کا ثبوت بھی ملتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ غلط یا جھوٹی بات نہ کہی جائے، دوسرے یہ کہ اُس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اگر کسی کا دل دکھایا گیا تو جائز نہ ہوگا، کتبِ حدیث میں کتاب الادب کے تحت مزاح کا باب بھی باندھتے ہیں، امام بخاریؒ نے باب الانبساط الی الناس (۹۰۵) میں بھی دو حدیث روایت کیں، ایک حضرت انسؓ سے کہ حضور علیہ السلام ہم سے بے تکلف ہوکر گھل مل کر رہتے تھے اور ہمارے ایک چھوٹے سے بھائی کو مزاحاً فرمایا کرتے تھے اے ابوعمیرؓ! کیا ہوا تمہارا نُغیر؟ اس نے لال پال رکھا تھا اور اس سے کھیلا کرتا تھا، دوسری حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کی کہ جب میں حضور علیہ السلام کے پاس (شادی کے بعد شروع زمانہ میں) رہی تو لڑکیوں کے ساتھ گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی تھی، اگر حضور اس حالت میں آجاتے تو وہ میری سہیلیاں دوڑ کر پردہ کے پیچھے چلی جاتیں، اور آپ انھیں پکڑ کر میرے پاس لاتے اور وہ پھر میرے سامنے کھیلنے لگتی تھیں، اس کے علاوہ امام بخاریؒ نے جو مستقل کتاب ''الادب المفرد'' کے نام سے لکھی ہے وہ دوضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے، اس میں سب احادیث اخلاق ومعاشرت ہی سے متعلق ہیں، اس میں بھی مستقل بابِ مزاح لائے ہیں اور احادیث ذکر کی ہیں، کتاب فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد ۳۶۳/۱ میں شرح الاحیاء وغیرہ سے نقل کیا کہ بطور حسنِ معاشرت اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ تواضع وحسنِ اخلاق وغیرہ کا ثبوت پیش کرنے کو خوش طبعی ومزاح میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ تو مزاح وملاطفت کا برتاؤ کرنا اخلاقِ نبوت سے ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا'' آدمی کو اپنے گھر میں بچوں کی طرح بے تکلف رہنا چاہیے (یہ نہیں کہ منہ چڑھا ہوا ہو اور سب پر رعب وہیبت طاری کی جائے) پھر جب ضرورت پیش آجائے تو وہ ہر طرح مرد ثابت ہو'' یعنی مردانگی، جراءت اور کمالِ عقل کا بھی بہترین نمونہ نکلے، یہی بات حضرت لقمان حکیم سے بھی نقل ہے، امام غزالیؒ نے فرمایا:۔ عورتوں کے ساتھ مزاح اور بے تکلفی اختیار کرنے میں اعتدال ہونا چاہیے، یعنی اتنا انبساط اور ضرورت سے زیادہ خوش خلقی بھی نہ برتے کہ وہ بالکل نڈر ہوکر بداخلاقیوں پر اُتر آئیں، اور ان کی کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوسکے، یا ہو تو بے اثر ہو، اسی لئے اگر کسی وقت بھی ان کا کوئی غلط رویہ علم ومشاہدہ میں آئے تو اس پر اپنے انقباض وناراضگی کا صاف طور سے اظہار کردے اور کسی حالت میں بھی برائیوں کا دروازہ ان کے لئے نہ کھلنے دے، نہ شریعت کی مخالفت کو برداشت کرے، ایسے وقت بھی اگر مزاح اور خوش طبعی کا ہی رویہ جاری رکھا جائے تو اس کو حضرت عمرؓ نہایت ناپسند کرتے تھے، اور فرماتے تھے، یہ مزاح، زاح عن الحق سے ہے جو حق وطریقِ شرعی مستقیم سے دور ہونے کا مرادف ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی نظر کتنی گہری تھی اور وہ ہر معاملہ میں اعتدال کی کتنی رعایت کرتے تھے اور شریعت کا مقصود

لے حضرت عائشہؓ کے ساتھ تو حضور علیہ السلام نے ایک سفر میں دوڑ کا مقابلہ بھی کیا ہے جس میں وہ جیت گئی تھیں، پھر بعد کو ان کا بدن بھاری ہوگیا تھا اور دوسری دوڑ میں حضور علیہ السلام جیت گئے تھے، اور آپ نے فرمایا کہ یہ پہلے کا بدلہ ہوگیا (مشکوۃ ۲۸۱ عن ابی داؤد)

ومنشاء سمجھنے میں وہ کس قدر آگے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

(۴۵) حضرت عائشہؓ وحفصہؓ دونوں ایک سفر میں حضور علیہ السلام کے ساتھ تھیں، سفر عموماً رات کے وقت طے ہوتا تھا اور حضرت عائشہ حضور علیہ السلام کے ساتھ اونٹ پر ہوتی تھیں تو آپ ان سے باتیں کرتے ہوئے چلتے تھے، حضرت حفصہؓ کو اس کا خیال ہوا اور حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج ایسا نہ کریں کہ تم میرے اونٹ پر سوار ہونا میں تمہارے اونٹ پر، پھر مناظرِ سفر کا مشاہدہ کریں، انہوں نے کہا اچھا ایسا ہی کریں گے رات کو سفر شروع کرنے کے وقت حضور علیہ السلام حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے، جس پر حضرت حفصہ تھیں، آپ سلام مسنون کے بعد ان کے ساتھ سوار ہو گئے، سفر پورا ہونے کے بعد اُتر گئے، حضرت عائشہؓ کی یہ رات بڑی مشکل سے کٹی، کیونکہ وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ سفر کی عادی تھیں، اور حالتِ سفر میں بہت سی کام کی باتیں بھی سُننے میں آتی تھیں وہ اپنی علمی و دینی مذاق میں سب پر فائق تھیں، اس لئے بڑا صدمہ گزرا اور اونٹ سے اُتر کر اذخر گھاس پر پاؤں ڈال کر بیٹھ گئیں اور لگیں بددعا کرنے، اے میرے رب! کوئی سانپ بھیج دے جو مجھے ڈس لے اور میرا کام تمام ہو جائے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس وقت غم وغصہ اور غیرت کے جذبہ سے میں اتنی متاثر تھی کہ زبان سے اس بددعا کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکتی تھی (بخاری ۷۸۴ و مسلم)

(۴۶) حضرت عائشہؓ نے فرمایا:۔ میرے علم میں حضرت صفیہؓ سے بہتر کھانا پکانے والی نہ تھی، ایک دن انہوں نے حضور علیہ السلام کے لئے کوئی چیز پکائی، اور وہ لے کر آئیں کہ آپ اس روز میرے گھر میں تھے اور میں رشک وغیرت کے شدید جذبہ کا شکار ہو گئی، اس برتن کو جس میں کھانا تھا، زمین پر دے مارا اور توڑ دیا، پھر ندامت ہوئی اور حضور علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ اس فعل کا کفارہ بتلائیں، آپ نے فرمایا، اسی جیسا برتن اور ویسا ہی کھانا دو (ابوداؤد و نسائی)

بخاری شریف ۷۸۶ میں یہ بھی ہے کہ کھانا لانے والے خادم کے ہاتھ سے پیالا گرا اور ٹوٹ گیا تو حضور علیہ السلام نے اس پیالہ کے ٹکڑے زمین سے اٹھا کر جمع کئے اور وہ کھانا بھی زمین پر سے اٹھایا اور فرمایا کوئی بات نہیں، تمہاری امی کو غیرت آگئی، پھر خادم کو روک کر ویسا ہی پیالہ منگوا کر دیا اور ٹوٹا ہوا توڑنے والی بیوی کے گھر میں رہنے دیا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کے مزاج میں غیرت، زود تاثری وانفعال کا مادہ کچھ زیادہ تھا، اس لئے اور واقعات بھی اس قسم کے پیش آئے ہیں جن کی حیثیت محض وقتی وہنگامی تھی اور جلد ہی وہ اثر زائل بھی ہو جاتا تھا (جیسے یہاں برتن توڑنے کے بعد فوراً ہی ندامت کا اظہار فرما دیا) مثلاً قصہ افک میں آتا ہے کہ جب براءت کی آیات نازل ہوئیں اور حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو اِس کی خوش خبری سنائی تو انہوں نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں، مگر آپ کا اور آپ کے صاحب کا نہیں جنھوں نے آپ کو بھیجا ہے۔

اکثر احادیث میں اسی قدر ہے مگر ازالۃ الخفاء ۸۵/۱ میں کسی روایت سے یہ اضافہ بھی ہے کہ پھر حضور علیہ السلام بھی ان کے پاس تشریف لائے اور ان کا بازو پکڑ کر بات کی تو انہوں نے آپ کا دستِ مبارک پکڑ کر جھٹک دیا، اور اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جوتہ اٹھا کر ان کو مارنا چاہا، یہ دیکھ کر حضور علیہ السلام کو ہنسی آگئی اور حضرت ابوبکرؓ کو قسم دے کر مارنے سے روک دیا۔

ایسا ہی دوسرا واقعہ مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے حضور علیہ السلام کے درِ دولت پر حاضر ہو کر اجازت طلب کی، اندر سے حضرت عائشہؓ کی آواز سُنی جو حضور علیہ السلام سے اونچی آواز میں بول رہی تھیں، حضور علیہ السلام نے ان کو اندر آنے کی اجازت دی تو انہوں نے حضرت عائشہ کو سخت لہجہ میں پکارا اے ام رومان کی بیٹی! تو حضور اکرم ﷺ سے اپنی آواز بلند کر کے بات کرتی ہے اور پکڑ کر مارنا چاہا، حضور علیہ السلام نے ان کا غصہ دیکھا تو ان کے درمیان ہو گئے اور حضرت عائشہ کو بچا دیا، جب حضرت ابوبکرؓ چلے گئے تو بطور مزاح وتلطف کے ان سے کہا دیکھو! میں نے آج کس طرح آڑے آکر تمہیں بچا دیا، اس کے بعد پھر کسی دن حضرت ابوبکرؓ آئے اور اجازت طلب

کی آپ نے سنا کہ حضور علیہ السلام حضرت عائشہؓ سے ہنس کر باتیں فرما رہے تھے، اجازت پر اندر گئے تو حضور علیہ السلام سے گزارش کی کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ دونوں اپنی صلح میں بھی شریک کریں، جس طرح آپ دونوں نے مجھے اپنی لڑائی میں شریک کیا تھا۔ (الفتح الربانی ۲۳۳/۱۶)

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حضور علیہ السلام میری باری کے دن شب کو بعد (عشاء) تشریف لائے (حسب معمول) چادر ایک طرف رکھی، جوتے نکالے اور تہمد کا کچھ حصہ بستر پر بچھا کر لیٹ گئے، کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھے سوتا ہوا خیال کر کے آہستہ سے چادر اٹھائی، نرمی سے جوتے پہنے، آہستہ سے کواڑ کھولے اور باہر ہو کر آہستگی کے ساتھ ہی کواڑ بند کئے اور چل دیئے، میں نے یہ ماجرا دیکھا تو اپنا کرتہ پہنا، دوپٹہ اوڑھا اور تہمد سے چادر کی طرح بدن کو لپیٹ کر آپ کے پیچھے ہولی، آپ بقیع پہنچے، دیر تک کھڑے رہے تین بار دونوں ہاتھ اُٹھائے، پھر لوٹ پڑے اور میں بھی لوٹی آپ نے جلدی کی اور میں نے بھی جلدی کی، آپ تیز قدم چلے تو میں بھی تیز قدم چلی، آپ اور تیز چلے تو میں دوڑ کر آپ سے آگے بڑھ گئی اور گھر میں داخل ہو کر جلدی سے لیٹ گئی، آپ تشریف لائے تو فرمایا، عائشہ! کیا ہوا تمہارا سانس کیوں چڑھا ہوا ہے؟ میں نے کہا کچھ نہیں، آپ نے فرمایا تو بتادو، ورنہ مجھے حق تعالیٰ جو لطیف و خبیر ہے وہ بتلا دے گا، میں نے کہا یا رسول اللہ ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں ساری بات ایسی تھی اور سب سنادی، آپ نے فرمایا، اچھا تم ہی آگے آگے چلتی نظر آرہی تھیں، میں نے کہا جی ہاں! اس پر آپ نے میرے سینہ پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا چلو بھی کیا تم نے سوچا کہ خدا اور اس کا رسول تمہارے ساتھ ناانصافی کریں گے؟ میں نے کہا، جو بات لوگوں سے چھپائی جاسکتی ہے اس کو بھی خدا جانتا ہے، میں اس کو خوب جانتی ہوں، آپ نے فرمایا اُس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے تھے تمہارے کپڑے اتارنے کی وجہ سے وہ اندر تو آنہیں سکتے تھے، پھر تمہاری ہی وجہ سے انہوں نے مجھے آہستہ سے پکارا تا کہ تمہاری نیند خراب نہ ہو، میں اٹھا اور خیال کیا کہ تم سوگئی ہو اس لئے اٹھانا پسند نہ کیا، اور یہ بھی خیال کیا کہ جاگ جاؤ گی تو تنہائی کی وجہ سے گھبراؤ گی، لہذا بہت خاموشی سے نکل کر چلا گیا تھا، حضرت جبرئیل علیہ السلام حق تعالیٰ کا یہ حکم لے کر آئے تھے کہ اہل بقیع کے پاس جا کر ان کے لئے دعائے مغفرت کرو، حضرت عائشہؓ نے فرمایا، پھر میں نے مُردوں کے لئے دعاءِ مغفرت کس طرح ہوئی ہے آپ سے دریافت کی الخ (مسلم شریف، نووی ۳۱۳/۱)

دوسری حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے واپسی پر گفتگو میں حضرت عائشہؓ سے یہ بھی جملہ فرمایا تھا، اَغِرتِ؟ یعنی کیا تمہیں غیرت آگئی تھی؟ (اس لئے میرے پیچھے گئیں، کہیں میں کسی دوسری بیوی کے یہاں نہ چلا جاؤں) حضرت عائشہؓ نے کہا کہ مجھ جیسا آپ جیسے پر غیرت کیسے نہ کرے گا؟! (مسلم، نسائی، جمع الفوائد ج ۱)

اسی طرح حضور علیہ السلام کے مرضِ وفات میں بھی وارأساہ' والا قصہ مروی ہے، جس کی تفصیل بخاری ۸۴۶ اور السیرۃ النبویہ (ابن ہشام ۶۶۳/۲) میں مذکور ہے۔

حضرت خدیجہؓ کے ذکر پر بھی حضرت عائشہؓ کی غیرت کا واقعہ مشہور ہے وغیرہا، اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم اور قابلِ اتباع بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایسے مواقع میں کتنی بڑی وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے تھے اور کسی قسم کی تلخی اور ناگواری کا اظہار نہ فرماتے تھے۔

الفتح الربانی ۱۵۰/۲۲ میں ہے:۔ ابو یعلی نے حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً حضور علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے کہ غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر عورت اونچ نیچ کبھی نہیں دیکھتی اور بزار و طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حصہ میں غیرت اور مردوں کے حصہ میں جہاد لکھ دیا پس جو شخص عورتوں کی غیرت کے جذبہ کی تلخ باتوں پر صبر کرلے گا اس کو شہید کا اجر ملے گا (ذکرہ الزرقانی شرح المواہب)

نسائی شریف میں یہ حدیث بھی مروی ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ انصاری عورتوں سے شادی کیوں نہیں فرماتے؟ آپ نے فرمایا:۔ ان میں غیرت کا مادہ بہت زیادہ ہے (جمع الفوائد ۲۱۵/۱)

بخاری ومسلم وغیرہ میں یہ حدیث بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ حضرت خولہ بنت حکیمؓ نے اپنے کوحضورعلیہ السلام کے لئے ہبہ کیا تو مجھے بڑی غیرت آئی اور کہا کہ عورتوں کوشرم نہیں آتی مردوں کے لئے پیش ہوتی ہیں، پھر جب آیت ترجی من تشاء الیٰ تو میں نے کہا یارسول اللہ! آپ کا رب بھی آپ کی خوشنودی چاہتا ہے الخ (جمع الفوائد ۲۰۹/۱)

(۴۷) حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں ایک سفر (حج) میں حضورعلیہ السلام کے ساتھ تھی، حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا، اور حضرت زینبؓ کے پاس سواری کے زائد اونٹ تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ صفیہ کا اونٹ بیمار ہوگیا ہے تم ان کو ایک اونٹ دیدوتو اچھا ہے، انہوں نے کہا میں اس یہودیہ کو دوں گی؟ اس پر حضور اکرم ﷺ کو غصہ آ گیا، اور آپ نے باقی ماہ ذی الحجہ، اور پورے محرم وصفر اور کچھ دن ربیع الاوّل میں ان سے کلام نہیں کیا، حتیٰ کہ وہ مایوس ہوکر اپنا سامان اور چارپائی بھی اٹھا کر لے گئیں اور خیال کرلیا کہ آپ ان سے تعلق نہ رکھیں گے، اس کے بعد ایک دن ایسا ہوا کہ وہ دوپہر کے وقت بیٹھی تھی اچانک کسی آدمی کا سایہ اپنی طرف آتے ہوئے محسوس کیا (یہ رحمتِ دوعالم کا ظلِ شفقت تھا جو پھر ان کی طرف متوجہ ہوگیا تھا، اور حضرت زینبؓ اپنا سامان و چارپائی لے کر خدمتِ اقدس میں باریاب ہوگئیں۔

(ابوداؤد واوسط جمع الفوائد ۲۳۰/۱) مسند احمد کے حوالہ سے مجمع الزوائد ۳۲۳/۴ میں یہ ہے کہ حضورعلیہ السلام ان کے پاس آئے اور خود اُن کی چارپائی اٹھا کر لے گئے اور ان سے راضی ہوگئے۔

فائدہ! یہ وہی حضرت زینبؓ تھیں، جن کا نکاح حق تعالیٰ نے عرش پر آپ سے کیا، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سفیر بن کر اس کی خبر دی تھی، اور یہ رشتہ میں آپ کی بنتِ عمّہ بھی تھیں، ان کے علاوہ ازواجِ مطہرات میں کوئی آپ کی رشتہ دار نہ تھیں، خود بھی فخر سے کہا کرتی تھیں کہ میرا نکاح سب سے اونچا، اور رشتہ حضور سے قریب کا تھا، اور کہتی تھی کہ سب سے زیادہ پردہ کا التزام واہتمام کرنے والی بھی میں ہی ہوں (گویا یہ بھی فخر کی چیزوں میں داخل تھا، اور حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ تمام بیویوں میں سے وہی اپنے حسن وجمال اور قربِ نبوی کے سبب میری مدمقابل تھیں، ایک دفعہ تقسیم غنیمت کے وقت حضرت زینبؓ نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں جسارت کر کے کچھ کہہ دیا تو حضرت عمرؓ نے ان کو ڈانٹ دیا، اس پر حضور نے فرمایا:۔ عمر! ان کو کچھ نہ کہو، یہ اوّاھہ ہیں، یعنی بارگاہِ خداوندی میں خشوع وخضوع کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حلم والے اور اوّاہ ومنیب تھے (الفتح الربانی ۱۳۵/۲۲)

باوجود ان سب فضائل ومناقب کے بھی حضورعلیہ السلام نے ان کی بے جابات پر کئی ماہ تک ترکِ تعلق کو ترجیح دی، یہ سب اس لئے تھا کہ عورتوں کے اخلاق وکردار کی اصلاح ہر ممکن بہتر طریقے سے ہوسکے، اور ان میں جو غیرت اور رشک وحسد کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، اس کو حدِ اعتدال میں لایا جاسکے، اور یہ اصلاح کا معاملہ اب بھی ہر مرد کے حلم وعقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ ان کے بغیر بھی گزارہ نہیں، اور ان کو ہر طرح کی آزادی بھی نہیں دی جاسکتی، ہر معاملہ میں سختی بھی ان کی افتادِ طبع وسرشت کے منافی، اور حد سے زیادہ ملاطفت وانبساط اور نرمی بھی نقصان دہ، کیا عجیب وغریب صورت ہے اور مشکلات والجھنوں سے عہدہ برآ ہو کر دین ودنیا کی سلامتی کا تمغۂ زریں حاصل کرلینا ہر مرد کے بس کی بات نہیں، واللہ الموفق۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(۴۸) ایک دفعہ مسجد نبوی سے فراغتِ نماز کے بعد مرد عورتیں باہر نکلیں تو اختلاط ہوگیا، حضورعلیہ السلام نے عورتوں کو حکم دیا کہ تم رک جاؤ اور پیچھے چلو اور تمہیں راستوں کے بیچ نہ چلنا چاہیے بلکہ کنارے پر سے گزرنا چاہیے، اس کے بعد عورتوں نے ارشادِ نبوی پر اتنی سختی سے عمل کیا کہ سڑک کے کنارے دیواروں سے اتنی رگڑ کھا کر گزرتی تھیں کہ کپڑے دیواروں سے اُلجھ جاتے تھے (ابوداؤد)

(۴۹) حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ کسی راستہ سے گزر رہے تھے، اور آپ کے آگے آگے، ایک عورت چل رہی تھی، آپ نے اس سے فرمایا کہ بیچ راستہ سے ہٹ کر چلو، اس نے کہا راستہ تو بہت چوڑا ہے آپ نے ساتھیوں سے فرمایا اس کو چھوڑ دو، یہ

ہماری بات نہیں سنے گی، اونچے دماغ والی ہے(رزین، جمع الفوائد۱۳۱؍۱) آج کل بیچ سڑک میں نازوانداز کے ساتھ چلنے والی اونچے دماغ والیوں کی کثرت روزافزوں ہے اللہ رحم کرے۔

(۵۰)ارشادفرمایا:۔ تین قسم کے آدمی کبھی جنت میں داخل نہ ہوں گے، دیوث، عورت جومردوں کا سالباس وغیرہ اختیار کرے، اور شراب کا عادی، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! دیوث سے کیا مراد ہے؟ فرمایا:۔ جومرداس کی پروانہ کرے کہ اس کی بیوی کے پاس کون کون آتا ہے، کبیر، بحوالہ جمع الفوائد۱۳۱؍۱) یعنی مرد کواس امر کی پوری احتیاط رکھنی چاہیے کہ اجنبی و بدچلن مرد وعورتیں اس کے گھر میں نہ آئیں نہ اس کے گھر والے ایسے لوگوں کے گھروں میں جائیں، اگر وہ اپنی بیوی بیٹیوں کو غیروں کے اختلاط اور میل جول سے نہیں روکتا تو وہ دیوث ہے جوحق تعالیٰ اوراس کے رسول کی غیرت کو چیلنج کرتا ہے، اس لئے اس کے واسطے آخرت میں گرم جگہ(جہنم ہی موزوں ہے، جہاں سب اوباش وآبرو باختہ بداطوار لوگ ہی جمع ہوں گے، جنت جو پاکباز متقی پرہیزگاروں کے لئے ہوگی، وہاں ایسے لوگوں کا کام نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم!

(۵۱) حضرت انسؓ (خادم خاص نبی اکرم ﷺ) نے فرمایا کہ حدبلوغ کو پہنچنے پر صبح ہی کو میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور بلوغ سے مطلع کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تم گھروں میں عورتوں کے پاس نہ جانا، مجھے اس سے اتنا رنج ہوا کہ اس دن سے زیادہ سخت دن مجھ پر نہیں گزرا(اوسط وصغیر بحوالہ جمع الفوائد۱۳۰؍۱)

اس سے معلوم ہوا کہ لڑکے جوان ہوجائیں اور پندرہ سال کی عمر کے ہوں تو دوسرے گھروں میں ان کو اپنی آمدورفت بند کردینی چاہیے، اور عورتوں کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ تو بچپن سے ہمارے گھر آتا ہے اس سے کیا پردہ؟ یہ جہالت کی بات ہے اوراس میں کسی کی رعایت کی ضرورت نہیں، حضرت انسؓ سے زیادہ پاکباز کون ہوسکتا ہے اوروہ زمانہ بھی نہایت مقدس نبوت کا تھا، خود حضور اکرم ﷺ موجود تھے اوران کو حضرت انسؓ کے خادم خاص ہونے کی وجہ سے آپ کے گھروں میں جانے کی ضرورت بھی تھی، پھر ازواج مطہرات دنیا کی افضل ترین صنفِ نسواں اور ساری امت کے لئے ماؤں کے درجہ میں تھیں، اس پر بھی حضور علیہ السلام نے بلاتوقف ان پر پابندی لگادی، تاکہ ساری امت اس سنتِ نبویہ کی پیروی کرے، پھر خاص طور سے جبکہ حضرت انسؓ کو آپ کے حکم مذکور سے سخت صدمہ بھی ہوا کہ آئندہ کے لئے آپ کی خدمت میں کمی وکوتاہی کا خیال آیا ہوگا، اوراس کا بھی امہات المومنین اوران کے مقدس ومنور گھروں کی حاضری سے محروم ہوئے، رنج وصدمہ کی بات اپنی جگہ بجا تھی اور یقیناً ایک حد تک اس کا افسوس وخیال خود ازواجِ مطہرات کو بھی ہوا ہوگا، مگر شریعت کے احکام میں رعایت کسی کی نہیں، اس لئے رحمتِ مجسم ﷺ نے کوئی پرواہ ان سب کے رنج وصدمہ کی نہیں کی اور شریعت کے حکم کو جاری فرمادیا، علیہ وعلی آلہ وازواجہٖ افضل الصلوٰات والتسلیمات المبارکات۔

(۵۲)ارشادفرمایا:۔ وہ ہم میں سے نہیں جو کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بھڑکائے اور بدگمان کرے، یا غلام کو اس کے مالک کے خلاف اُکسائے(ابوداؤد) یعنی وہ امتِ محمدیہ سے خارج ہوگا، جو اس قسم کا کام کرے گا، مثلاً کسی عورت سے اس کے شوہر کی برائیاں کرے یا کسی غیر مرد کی خوبیاں بیان کرے، جس سے اس کا دل اپنے شوہر سے پھر جائے مرقاۃ ج۳ اس زمانہ میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ کسی عورت سے خیرخواہی جتانے کو یا شوہر سے کسی مخالفت کی وجہ سے اس کے سامنے شوہر کی برائیاں کھود کرید کر نکالتی اور بتلاتی ہیں، اور کبھی دوسرے شوہروں کے بہتر حالات اس کو سُناتی ہیں جس سے اپنے شوہر کی وقعت اس کے دل میں کم ہوکر فساد وفتنہ اور خرابیوں کی بنیاد قائم ہوجاتی ہے بلکہ بعض مرتبہ خود بیٹی کے باپ اور ماں بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہوکر ایسا کرگزرتی ہیں، یہ سخت ممنوع اور حرام ہے، اوراس سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ کا اپنا طریقہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک دفعہ کسی شکررنجی کے تحت حضرت فاطمہؓ نے حاضرِ خدمت نبویہ ہوکر حضرت علیؓ کی

---

[1] حضرت حفصہؓ کو کسی وجہ سے حضور ﷺ نے طلاق دیدی تھی، اس کا علم حضرت عمرؓ کو ہوا تو ان کو اور دوسرے عزیزوں نیز سب ہی صحابہ کو غیرمعمولی صدمہ ہوا، اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام اترے اور نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ حضرت عمرؓ پر رحم کی نظر کرکے حفصہ سے رجوع کرلیں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شکایت کی تو آپ نے فرمایا ''بیٹی! تم یہ تو سوچو کہ دنیا میں کون سا مرد ایسا ہے جو اپنی بیوی کے پاس خاموش چلا آتا ہے''؟

علماءِ نے لکھا ہے کہ اس کے بعد پھر وہ کبھی حضور علیہ السلام کے پاس حضرت علیؓ کی شکایت لے کر نہیں آئیں، سب جانتے ہیں کہ زن وشوہر کے تعلق کی نوعیت نہایت نازک ہوتی ہے، اس لئے ذرا سی بات پر بگاڑ کی صورت بن سکتی ہے اسی پر بند لگانے کو حضور علیہ السلام نے مذکورہ بالا ارشاد صادر کیا ہے، اور دونوں کے تعلقات خراب کرنے والے کو سخت وعید سے ڈرایا ہے، اس کے علاوہ یہ کہ بہت سے احادیث میں دو مسلمانوں کے مابین جھوٹ بول کر بھی صلح وصفائی کرا دینے کی ترغیب وارد ہوئی ہے، تو میاں بیوی میں تو اس امر کی رعایت اور بھی زیادہ ہونی چاہیے اور افساد کی بات اتنی ہی زیادہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہوگی اور اسی لئے شیطان کو سب سے زیادہ محبوب وپسندیدہ صرف یہی بات ہے کہ کسی طرح بھی میاں بیوی کے تعلقات خراب کرا دیئے جائیں اور شیاطین الجن والانس اس کے لئے ہر قسم کے دھوکے فریب جھوٹ وغیرہ کے حربے استعمال کرتے ہیں، جس کا ذکر اگلی حدیث میں ہے۔

(۵۳) ارشاد فرمایا:۔ ابلیس اپنا تختِ شاہی پانی پر بچھا کر بیٹھتا ہے اور اپنے لشکروں کو لوگوں کی گمراہی کے لئے سب طرف بھیج دیتا ہے پس اس سب سے زیادہ مقرب ومحبوب شیطان وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا گمراہی کا کارنامہ انجام دے کر آوے، پھر سب اس کے پاس جمع ہو کر اپنی اپنی کارگزاریاں سناتے ہیں، ایک آتا ہے کہ میں نے یہ گناہ فلاں شخص سے کرا دیا، دوسرا بھی اسی طرح (مثلاً چوری کرائی، ڈاکہ ڈلوایا، شراب پلوائی، جھوٹ بلوایا، غیبت کرائی، نماز ترک کرائی، وغیرہ وغیرہ) ایک کہتا ہے کہ میں ایک میاں بیوی کے پیچھے لگا رہا، اور ان میں سے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتا رہا، اور دونوں کو لڑانے کے لئے ہر قسم کے ظاہری باطنی حربے استعمال کر کے بالآخر ان دونوں میں تفریق کرا دی، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کی کارگزاری سن کر شیطانوں کا بادشاہ ابلیس خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کو قریب بُلا کر کہتا ہے کہ ہاں! تو میرا سب سے لائق بیٹا اور میرا نہایت قابل قدر معین ومددگار ہے راویِ حدیث اعمش کہتے ہیں کہ غالباً حضرت جابرؓ نے یہ بات بھی حضور علیہ السلام سے نقل کی کہ ابلیس تفریق زوجین کے عمل سے اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے کہ اس شیطان کو اپنے سینہ سے لپٹا لیتا ہے، یعنی معانقہ کرتا ہے (مسلم شریف)

وجہ یہ ہے کہ ابلیس کو زنا کی کثرت اور دنیا میں اولادِ زنا کا غلبہ بہت زیادہ پسند ہے، کیونکہ ایسے بدنسل لوگ ہی زیادہ شر وفساد زمین پر پھیلاتے ہیں اور حدودِ شرعیہ کے خلاف محاذ بنواتے ہیں، اسی لئے حدیثِ دارمی میں ہے کہ جنت میں حرامی بچے داخل نہ ہوں گے کہ ان پر کریمانہ اخلاق وفضائل کا حاصل کرنا دشوار، اور کمینہ اطوار وعادتیں حاصل کرنا آسان ہوتا ہے، (مرقاۃ ۱۸/۱۱) جو بچے بہتر تربیت وتعلیم سے آراستہ ہوسکیں وہ خود ہی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

جائز وشرعی طریق پر نکاح والے جوڑوں میں تفریق کرا دینے سے، وہ بھی مجبور ہو کر زنا کے راستوں پر چل پڑیں گے اور اس طرح زنا اور اولادِ زنا کی تعداد میں ترقی اور اضافہ در اضافہ ہوتا رہے گا، جو شیاطینِ انس وجن کو سب سے زیادہ محبوب اور حق تعالیٰ، اس کے برگزیدہ بندوں اور فرشتوں کو زیادہ سے زیادہ مبغوض وناپسندیدہ ہے، قال تعالیٰ ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس (لوگوں کے بُرے کرتوتوں ہی کے سبب سے ہر جگہ فساد پھیلتے ہیں)

غرض موجودہ دنیا میں جو شر وفساد اور علوم نبوت کے خلاف دوسرے نظریات پھیل رہے ہیں وہ سب کثرتِ زنا اور اولاد الزوانی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) حضرت عمرؓ اس طرف سے مطمئن ہو کر حضرت حفصہ کے پاس گئے دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، آپ نے کہا کیوں روتی ہو، اس لئے کہ حضور علیہ السلام نے تمہیں طلاق دے دی ہے، دیکھو! اب تو انہوں نے طلاق کے بعد میری وجہ سے رجوع کر لیا ہے، واللہ! اگر پھر انہوں نے تمہیں طلاق دی تو میں تم سے کبھی کلام نہ کروں گا۔

دوسری روایت اس طرح ہے کہ حضرت حفصہؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے تو میں نے (طلاق کی وجہ سے) چادر اوڑھ لی، آپ نے فرمایا، میرے پاس ابھی جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا حفصہ سے رجوع کر لو، وہ صوّامہ اور قوّامہ (بہت روزے رکھنے والی، اور بہت نمازیں پڑھنے والی) اور جنت میں بھی آپ کی زوجہ رہنے والی ہے (الفتح الربانی ۲۳۱/۲۲)

غلبہ واقتدار کے نتائج ہیں، اللہ تعالیٰ امتِ محمد یہ کو ان کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے، اس وقت زنا اور دواعیِ زنا کی روک تھام کے لئے ہر قسم کی کوشش کرنا عالم انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے، اور علماءِ امت کو خاص طور سے اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ واللہ المیسر !

(۵۴) ارشاد فرمایا: ۔وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو اپنا امیر کسی عورت کو بنائے گی، (بخاری ۲/۶۳۷)

حافظؒ نے لکھا کہ امارت وقضا سے ممانعت جمہور کا قول ہے، امام مالک سے ایک روایت جواز کی ہے، امام ابوحنیفہؒ سے روایت ہے کہ جن معاملات میں عورت کی شہادت جائز ہے ان کی حاکم بن سکتی ہے (فتح الباری ۹۰/۸) محقق عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث کی روایت امام بخاریؒ نے ابواب الفتن ۱۰۵۲ میں بھی کی ہے اور امام ترمذی نے فتن میں، امام نسائی نے فضائل میں کی ہے الخ (عمدہ ۹/ ۳۷)

(۵۵) ایاکم وخضراء الدمن (کوڑیوں پر اُگی ہوئی سبزی و ہریالی سے بچو) علامہ محدث صاحب مجمع البحار نے لکھا کہ اس سے مراد وہ خوبصورت عورت ہے جو خراب ماحول میں پلی بڑھی ہو، جس طرح گندی جگہوں میں درخت اُگ آتے ہیں اور وہ دیکھنے میں خوش منظر ہوتے ہیں، اس کو کمینہ اخلاق و منصب والی حسینہ وجمیلہ سے تشبیہ دی گئی ہے (۲/۵۰) معلوم ہوا کہ صرف ظاہری حسن و جمال پر نظر نہ کرنی چاہیے، بلکہ باطنی خلاق وفضائل کو معیارِ انتخاب وترجیح بنانا چاہیے۔

(۵۶) حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک دن حضور علیہ السلام نے مجلس صحابہ میں سوال کیا کہ عورتوں کے لئے سب سے بہتر کیا چیز ہے ؟ سب خاموش رہے میں نے حضرت فاطمہؓ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ بتایا کہ ان پر مردوں کی نگاہیں نہ پڑیں میں نے یہ جواب حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا تو تصویب کے طور پر فرمایا، وہ میری لخت جگر ہے یعنی وہی صحیح جواب دے سکتی تھی (مجمع الزوائد ۴/۲۵۵ وجمع الفوائد ۱/۲۱۷)

اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کا ارشاد بھی یادداشت میں رہے کہ آپ نے ازواجِ مطہرات کے لئے فرمایا تھا'' اگر میری بات مانی جائے تو میری تمنا تو یہ ہے کہ تمہیں کوئی آنکھ نہ دیکھ سکے، اس کے بعد ہی پردہ کا حکم نازل ہوا تھا (الادب المفرد للبخاری ۲۹۶)

حضرت حسن بصریؒ کا یہ ارشاد بھی قابل ذکر ہے کہ اگر تم سے ہوسکے تو اپنے گھر والیوں کے بالوں پر نظر نہ ڈالو بجز اپنی بیوی کے یا چھوٹی بچی کے (الادب المفرد ۲/۱۶۲) لہذا مردوں عورتوں سب کو اس کی احتیاط چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی مریض کی عیادت کو گئے، آپ کے ساتھ اور لوگ بھی تھے، ان میں سے ایک شخص اس گھر کی عورت کو دیکھنے لگا تو آپ نے فرمایا: ۔تمہاری آنکھ پھوٹ جاتی تو تمہارے لئے بہتر ہوتا (الادب المفرد ۶۲۸) یعنی اس گناہ کے ارتکاب سے آنکھ کا پھوٹ جانا بہتر تھا۔

(۵۷) ارشاد فرمایا: ۔میں تمہیں بتلادوں مردوں میں سے کون جنت میں جائے گا؟ نبی جنت میں جائیں گے، صدیق بھی اور وہ شخص بھی جو صرف خدا کے لئے اپنے ایک بھائی کی ملاقات کے لئے شہر کے دوسرے کنارے تک جائے، اور عورتوں میں سے ہر بچے جننے والی، ان سے محبت کرنے والی، جب شوہر کی کسی بات کی وجہ سے غصہ کرے، یا نافرمانی کا ارتکاب کرے تو نادم ہو کر اس سے کہے کہ یہ میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں ہے، مجھ پر نیند حرام ہے جب تک تو مجھ سے راضی نہ ہو جائے (مجمع الزوائد ۴/۳۱۲)

(۵۸) ارشاد فرمایا: ۔کسی عورت کو جائز نہیں کہ اپنے شوہر کے گھر میں ایسے شخص کو آنے دے جس کو وہ ناپسند کرے، اور نہ یہ کہ گھر سے بغیر رضا مندی شوہر کے باہر جائے، اور شوہر کے بارے میں کسی اور کی بات ماننا بھی جائز نہیں ہے نہ اپنے شوہر کو غصہ دلا کر اس کے دل کو بھڑکائے، نہ اس کے بستر سے دور ہو، نہ اس کو مارے اگر چہ وہ ناحق پر ہی ہو، اور اس کو ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کرے، پھر اگر وہ عذر قبول کر کے راضی ہو جائے تو بہتر ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس عورت کو معاف کرے گا، اور اس کو سرخرو کرے گا، اور اگر اس پر بھی شوہر راضی نہ ہو تو عورت اپنا فرض ادا کرچکی، رواہ الطبرانی (مجمع الزوائد ۳۱۳)

(۵۹)ارشادفرمایا:۔ جوشخص خداپر بھروسہ کر کے اور صحیح طور سے خالص نیتِ ثواب کر کے نکاح کرے گا، تو اللہ تعالیٰ ضرور اپنی اعانت اور خیر و برکت سے نوازیں گے (جمع الفوائد ۲۱۶) یہ بھی روایت ہے کہ غنی کر دیں گے۔

(۶۰)فرمایا:۔سب سے بہتر سفارشوں میں سے یہ ہے کہ دوآدمیوں میں نکاح کی کوشش کر دے (جمع الفوائد ۲۱۷) یعنی دونوں کو صحیح حالات بتلا کر ترغیب دے، ایسا نہیں کہ غلط سلط باتیں کہہ کر آمادہ کر دے۔

(۶۱)ارشادفرمایا:۔دومحبت کرنے والوں کے لئے نکاح جیسی اچھی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی (جمع الفوائد ۲۲۳) یعنی اگر شرعی موانع نہ ہوں، اور دونوں میں محبت جڑ پکڑ چکی ہو تو نکاح ہی بہتر ہے، اگر چہ اسکی وجہ سے کچھ دنیوی نقصانات بھی برداشت کرنے پڑیں کیونکہ اس نکاح کی وجہ سے بہت سے دوسرے مفاسد اور خرابیوں سے بچا جاسکے گا، خاص حالات میں اہل علم و دانش کے مشورہ سے اس حدیث کی روشنی میں عمل کرنا چاہیے۔

(۶۲)امام بخاریؒ نے مستقل باب میں عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک وحسنِ اخلاق کی تاکید والی مشہور حدیث ۷۷۹ میں ذکر کرنے کے بعد اگلا باب قول باری تعالیٰ **قوا انفسکم و اھلیکم نارا** پر قائم کیا ہے، جس سے یہ بتلایا کہ ان کے ساتھ نرمی واخلاق کا برتاؤ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو فرائض و واجبات کے لئے بھی تاکید نہ کی جائے بلکہ مسلمان مردوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ اہل وعیال کو بھی مستحقِ جہنم بنانے والی باتوں سے روکتے رہیں، یعنی جہاں تک عورتوں کے اخلاق و مزاج کی کجی وخرابی کا تعلق ہے وہ کم وبیش جتنی بھی جس میں ہے اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہیں، اس لئے اس کی فکر تو بے سود ہے لیکن فرائض و واجباتِ شرعیہ کی ادائیگی اور معاصی وفواحش سے احتراز کیلئے تاکید وتنبیہ تو ضرور ہی کرنی ہے ورنہ ان کی بے راہ روی اور مستحقِ نار ہونے کی ذمہ داری سے تم بھی نہ بچو گے۔ (کذا فی الفتح والقسطلانیؒ)

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ شوہر کیلئے چار باتوں پر بیویوں کو مارنا بھی درست ہے، ترکِ زینت پر بشرطیکہ شوہر زینت کا مطالبہ کرے، بحالت طہارت (عدم حیض ونفاس) مقاربت سے انکار پر ترکِ نماز و دیگر فرائض و واجبات پر، گھر سے بغیر اجازت شوہر نکلنے پر، (امام محمدؒ نے فرمایا کہ ترکِ فرائض پر مارنے کا حق نہیں اور تنبیہ کرسکتا ہے (انوار المحمود ۲؍۳۲)

مسندِ احمد میں حدیث ہے کہ ''عورت تمہارے لئے ایک عادت وخصلت پر مستقیم نہیں رہ سکتی، وہ تو پسلی کی طرح سے ٹیڑھی ہے اگر بالکل سیدھا کرو گے تو توڑ دو گے، بالکل اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو کجی کے باوجود تمتع کرلو گے'' اس سے اشارہ نکلا کہ پہلے نرمی کے ساتھ سیدھا کرنا چاہیے، کیونکہ سختی کے ساتھ ٹوٹ جائے گی، لیکن یہ ان امور میں ہے جو شوہر کے اپنے حقِ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں، پس اگر وہ حد سے تجاوز کرے اور ارتکابِ معصیت بھی کرنے لگے تو اس کو کجی کی حالت پر چھوڑ دینا جائز نہیں، اور اسی کی طرف حق تعالیٰ نے **قوا انفسکم و اھلیکم نار** سے اشارہ فرمایا ہے اور اس وقت طلاق دینا بھی صحیح ہوگا (الفتح الربانی ۳۳۴؍۳)

(۶۳)امام بخاریؒ نے مستقل باب حسنِ معاشرتِ اہل قائم کر کے ۷۷۹ میں ام زرع والی مشہور حدیث روایت کی ہے جس میں گیارہ عورتوں نے ایک مجلس میں جمع ہو کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے اپنے شوہروں کے صحیح وسچے احوال بلا رد رعایت یا خوف وڈر کے بیان کریں گی اور کوئی بات نہ چھپائیں گی، پھر سب نے نمبروار نہایت فصیح وبلیغ زبان میں بیان دے کر یہ داستان مکمل کی، اور حضرت عائشہؓ نے یہ پوری داستان حضور علیہ السلام کو سنائی، پوری حدیث طویل ہے اسلئے اس کا مکمل ترجمہ و مطلب اپنے موقع پر آئے گا، یہاں صرف گیارہویں عورت ام زرع کا بیان کردہ حال مختصر کر کے پیش کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا ہمارے موضوعِ بحث سے تعلق ہے، اس نے کہا کہ میرا شوہر ابوزرع اس کا تو کہنا ہی کیا، اس نے زیور، مال مویشی وغیرہ ہر نعمتِ دنیوی سے میرا جی خوش کر دیا، اس کی ماں (میری ساس) بھی ہر لحاظ سے قابلِ تعریف اور بڑی لائق فائق عورت تھی، اس کا بیٹا چھریرے بدن کا کم خوراک، اس کی بیٹی ماں باپ کی فرمانبردار، فربہ اندام اور خوبصورت خوب سیرت ایسی کہ جلنے والیاں اس کو دیکھ کر جلا کریں، اس کی باندی بھی قابل تعریف کہ ہمارے گھر کی بات باہر نہ کہتی، نہ چوری چکوری کی

عادت، نہ گھر کی ستھرائی میں کمی کرتی تھی، پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن ابوزرع صبح کو گھر سے نکلا، ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوگیا اور مجھے طلاق دے دی، پھر میں نے ایک دوسرے مالدار شخص سے شادی کر لی، جس نے مجھے بہت کچھ دیا اور پوری آزادی بھی دی کہ جس کو چاہوں کھلاؤں پلاؤں، مگر اس کا سارا دیا ہوا مال بھی ابوزرع کے تھوڑے مال کے برابر نہ ہوگا۔

حضرت اقدس رسول اکرم ﷺ نے پوری داستان سن کر اس پر حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ میں بھی تمہارے لئے ابوزرع جیسا ہوں ، بجز اس کے کہ اس نے ام زرع کو طلاق دیدی تھی، اور میں طلاق نہیں دوں گا، اس پر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تو میرے لئے ابوزرع سے کہیں بہتر ہیں۔

حافظؒ نے لکھا کہ روایت ہثیم بن عدی میں یہ زیادتی بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہارے لئے ابوزرع ہی جیسا ہوں بہ لحاظ اس کی ابتدائی الفت ووفاشعاری کے نہ کہ آخری فرقت و بے وفائی کے لحاظ سے (اسی کو دوسری روایت میں **الا انہ طلقھا وانی لا اطلقك** سے بیان کیا گیا ہے دونوں کا مفہوم ایک ہے درحقیقت میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لئے وفاشعار ہونا اور باہمی الفت کا نباہنا، اور جنسی میلانات کسی بھی دوسری طرف متوجہ نہ ہونے دینا ہے سب سے بڑا زوجیت کا شرف ہے، دوسرے درجہ میں بیوی کے لئے شوہر کے گھر کا ماحول بھی بہتر ہونا ضروری ہے کہ بیوی اپنے نہایت مانوس ماحول، ماں، باپ، عزیز، بھائی، بہنوں اور دوسرے قرابت داروں سے جدا ہو کر شوہر کے گھر میں بالکل اجنبی ماحول میں پہنچتی ہے اس لئے صرف شوہر کی محبت والفت اور بہتر سلوک ہی کافی نہیں بلکہ شوہر کے گھر والوں خصوصاً ماں، باپ، بہن، بھائی، بھاوجوں، کا سلوک بھی محبت، خلوص وحسن اخلاق کا ہونا چاہیے، اور اس کے لئے بھی شوہر کی بڑی ذمہ داری ہے خصوصاً جبکہ وہ بیوی کو سب سے الگ گھر میں نہ رکھ سکتا ہو، اور چونکہ گیارہ عورتوں میں سے اور کسی عورت نے شوہر کے گھر والوں کے احوال ذکر نہیں کئے تھے، صرف ام زرع نے کئے تھے، اس لئے تشبیہ کا ایک بڑا جزو وہ بھی تھا، تیسری بات مال ودولت کی فراوانی تھی، جس کو ام زرع نے اتنی زیادہ اہمیت دی تھی کہ اپنے بعد والے مالدار بہترین شوہر کو بھی اس لحاظ سے کنڈم کر دیا تھا، اور باوجود طلاق کے بھی اس کی زیادہ دولت کا ہی دم بھرتی رہی یہ اس کی زمانہ فطرت کا قصور فہم تھا کہ عورت پہلے بُرے شوہر کا دوسرے بہتر شوہر کے مقابلہ میں تعریف سے ذکر کرتی ہے! خواہ اس سے لڑ جھگڑ کر اس سے طلاق ہی لے آئی ہو، اور اس کے لئے اس کی فطرت کے علاوہ شیطان بھی آمادہ کرتا ہے تاکہ نئے شوہر سے بھی تعلقات بہتر نہج پر نہ چل سکیں، خود حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ عورت کا عجیب حال ہے کہ طویل مدت تک بغیر نکاح کے اپنے ماں باپ کے گھر میں پریشانی کے دن گزار کر بھی جوانی ونکاح کی بیشتر عمر گزار چکتی ہے اگر اس کو شوہر نصیب ہوتا ہے اور اس سے مال سرپرستی کے علاوہ بچوں جیسی نعمت بھی اس کو مل جاتی ہے تب بھی اس کی فطرت ایسی ہی ہے کہ شوہر کی طرف سے کوئی ناگوار یا خلاف مزاج بات ہو جائے تو کہنے لگتی ہے کہ اس سے تو میں نے کسی دن بھی خیر و بھلائی نہیں دیکھی۔ (الفتح الربانی ۲۲۹؍۱۹) یعنی غصہ وغضب سے مغلوب ہو کر ناشکری جیسے گناہ کا ارتکاب کر لیتی ہے۔

مجمع الزوائد ۴؍۳۱۲ میں بھی طبرانی سے حدیث نقل ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے عورتوں کو خطاب میں فرمایا تم میں زیادہ جہنم کا ایندھن بنیں گی، انہوں نے پوچھا کس لئے؟ آپ نے فرمایا: تمہیں دیا جائے تو شکر نہیں کرتیں اگر دینے میں کمی ہو جائے تو شکوے شکایات کے دفتر کھولتی ہو، کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا ہوتی ہو تو صبر نہیں کرتیں، تمہیں ان سب بری عادتوں کو ترک کرنا چاہیے اور خاص طور سے کفر منعمین سے بچنا چاہیے! سوال کیا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایک عورت اپنے شوہر کے پاس رہتی ہے اور اس سے دو تین بچے بھی ہو جاتے ہیں ، پھر وہ غصہ میں اس کو کہتی ہے کہ تجھ سے کوئی خیر میں نے نہیں دیکھی، سلمٰی بنت قیسؓ کہتی ہیں کہ میں نے دوسری انصاری عورتوں کے ساتھ حضور علیہ السلام سے بیعت کی تو آپ نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ تم اپنے شوہروں کی خیانت نہ کروگی، ہم چلے آئے، راستہ میں کہا کہ ہمیں اس بات کا مطلب دریافت کرنا چاہیے تھا، تو ہم پھر لوٹ کر گئے اور پوچھا کہ شوہروں کی خیانت کیا ہے آپ نے فرمایا وہ یہ ہے کہ تم

شوہروں کے مال میں سے غیروں کو ہدیے تحفے دو، یعنی بلا اجازت شوہر کے گھر کی چیز کسی کو دینی نہیں چاہیے۔

اوپر کی احادیث سے معلوم ہوا کہ اولاد بھی بہت بڑی نعمت ہے اور میاں بیوی دونوں کو اس کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کی قدر کرنی چاہیے اور اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت خدیجہؓ کا ذکر اکثر کرتے اور ان کی خوبیاں بیان کرتے تھے، بعض مرتبہ حضرت عائشہؓ کا جذبہ غیرت ابھرتا تو وہ کچھ کہہ بیٹھتیں، آپ ان کا ذکر کیوں کرتے ہیں تو آپ فرماتے میں ان کے فضائل اخلاق واحسانات کیسے بھول سکتا ہوں، پھر یہ کہ یہ میری ساری اولاد بھی صرف ان سے ہے، دوسری کسی بیوی سے مجھے اولاد نصیب نہیں ہوئی، حضرت عائشہؓ خاموش ہوگئیں اور یہ بھی مروی ہے کہ چند مرتبہ کے بعد آپ نے عرض کیا واللہ آج کے بعد میں آپ کو ان کے بارے میں ناراض نہیں کروں گی (استیعاب ۲/۷۲۱) گویا آپ کے دل میں اولاد کی وجہ سے بھی ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی، غرض ام زرع کی بیان کردہ شوہر کی خوبیوں میں سے مال ودولت والی بات کو آپ نے کچھ اہمیت نہیں دی جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کا فقر وفاقہ اختیاری تھا، اور وہ آپ کو نہایت محبوب تھا، ورنہ آپ کے پاس بھی بہت بڑی دولت ہوسکتی تھی، آپ کی عادت تھی کہ جو بھی دولت آتی، دوسروں کو تقسیم کردیتے تھے۔

حرفِ آخر! ''صنفِ نسواں'' سے متعلق ''احادیثِ نبویہ'' کا اکثر حصہ نہایت ضروری ومفید سمجھ کر ہم نے حوالوں کے ساتھ ایک جگہ پیش کر دیا ہے تاکہ ان کی روشنی میں گھریلو زندگی سنوارنے میں مدد ملے، حضور اکرم ﷺ نے اپنے اقوال وافعالِ مبارکہ سے ان کے بارے میں سب اونچ نیچ اور جلی وخفی کو نمایاں فرمادیا ہے، اور خود آپ کے طرزِ عمل کو بھی مجسم رحمت وشفقت ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کے تعامل سے الگ یا مختلف قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ہجران، طلاق، ایلاء، اور تخییر کے مراحل سے حضور علیہ السلام کو بھی گزرنا پڑا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم! حدیث نبوی "ماترکت بعدی فتنة اضر علے الرجال من النساء" کی روشنی میں گہری غور وفکر کی ضرورت ہے۔

نکتہ! ایک نہایت اہم نکتہ قابل گزارش یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے بہ نسبت دیگر ازواجِ مطہرات کی حضرت عائشہؓ کے ساتھ تعلق ورعایت کا معاملہ زیادہ رکھا ہے اس کی بہت سی وجوہ ذکر کی گئی ہیں، جن کا تعلق ان کے ذاتی محاسن وفضائل سے ہے لیکن سب سے بڑی وجہ وہ ہے جس کا ذکر حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ ان کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے لحاف کے اندر وحیِ خداوندی کا نزولِ اجلال ہوا ہے، یہ فضیلت کسی اور زوجہ محترمہ کو نصیب نہیں ہوئی، اور یہ اتنی عظیم الشان منقبت ہے کہ اس کی عظمت کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو عظمت وحی سے واقف ہو یختص برحمتہ من یشاء والله ذو لفضل العظیم!

عنوان ''حجابِ شرعی'' اور حضرت عمرؓ کی موافقتِ وحیِ الٰہی کے تحت ہم نے کوشش کی ہے کہ صنفِ نسواں کی صحیح اسلامی پوزیشن سامنے آجائے، اور جن حضرات نے موجودہ دور کی آزادیِ نسواں سے مرعوب ہوکر مساواتِ مرد وزن کے نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دینے اور کسی ایک کی فضیلت دوسرے پر غیر ثابت ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اسکی غلطی بھی واضح ہوجائے، چنانچہ ارشاد خداوندی الرجال قوامون الآیہ اور وللرجال علیھن درجہ پھر حدیثِ نبوی کہ اگر خدائے تعالیٰ کے بعد کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز ہوتا تو عورتوں کو اپنے شوہروں کے لئے جائز ہوتا، اور عورت کی گواہی کا آدھا ہونا، بعض امور میں ان کی گواہی کا بالکل معتبر نہ ہونا، میراث میں صرف آدھے حصہ کا استحقاق، امامتِ صغریٰ وکبریٰ کی اہلیت نہ ہونا، طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہونا اور عورت کے لئے نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ[1] کتنے ہی امور ہیں جن سے

---

[1] عورتوں کی عقل وسمجھ پر بھروسہ کرکے اگر ان کو کوئی اختیار دیا جاتا تو سب سے زیادہ موزوں ان کے لئے اپنی اولاد کے نکاح کرانے کا اختیار ہوسکتا تھا، کیوں وہ لڑکوں لڑکیوں کے حالات سے بظاہر مردوں سے بھی زیادہ واقف ہوتی ہیں لیکن ان کی قوتِ فیصلہ کے نقص اور بعد کی ذمہ داریوں کا بار نہ سنبھال سکنے کے باعث یہ اختیار بھی ان کو سب سے آخر میں بدرجہ مجبوری دیا گیا ہے، چنانچہ ولی نکاح بننے کی ترتیب حسب ذیل ہے:۔ باپ، دادا، سگا بھائی، سوتیلا بھائی، بھتیجہ، بھتیجے کا لڑکا، پوتا، سگا چچا، سوتیلا چچا، سگے چچا کا لڑکا، پوتا، سوتیلے چچا کا لڑکا، پوتا، باپ کا چچا، اس کی اولاد، دادا کا چچا، اس کی اولاد، جب ان سب مردوں میں سے کوئی بھی موجود نہ ہوتب ماں ولی ہوگی، پھر دادی، پھر نانی وغیرہ۔ (درمختار ۱۹۳)

مساوات مرتبہ کی نفی اور فضیلت رجال کا ثبوت ہوتا ہے غرض فضیلت واختیار میں کون زیادہ ہے یہ بحث الگ ہے اور حقوق کی مد الگ ہے کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، ان کے بھی مردوں پر ہیں، اور ہر ایک کو دوسرے کے حقوق پوری طرح ادا کرنا فرض وواجب ہے، اور ان کی تفصیل اور ادائیگی کی تاکید بھی شریعت محمدیہ میں اتنی زیادہ ہے کہ کسی اور مذہب وملت میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔

ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ حضور علیہ السلام میں چونکہ رحمت وشفقت کا وجود بے حد وبے حساب تھا، اور حضرت سیدنا عمرؓ میں ان کی نسبت سے شدت وسختی تھی، اس لئے دونوں کے نظریات میں بھی فرق سمجھ لیا گیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، پھر حضور علیہ السلام کے زمانہ سعادت میں جتنی نرمی نبھ گئی، آپ کے بعد بھی اس کو باقی رکھا جاتا تو مفاسد کے دروازے کھل جاتے، خود حضرت عائشہؓ ہی نے اپنی بعد کی زندگی میں فرق ملاحظہ فرمالیا تھا، اور اسی لئے فرمایا کہ اب جو کچھ عورتوں نے اپنے اندر تبدیلیاں کر لی ہیں وہ اگر حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ظاہر ہوجاتیں تو آپ ان کو مساجد کی نماز سے ضرور روک دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو بعد میں روک دیا گیا تھا۔

ایسے ہی جامع مسانید الامام الاعظم ۲۴۳/۲ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے روایت مروی ہے کہ حضور علیہ السلام کے دور میں ایک جنازہ کے ساتھ عورتیں بھی تھیں، حضرت عمرؓ نے چاہا کہ ان کو گھروں کی طرف واپس کر دیں لیکن حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ انھیں رہنے دو[1] کیونکہ ابھی ان کا صدمہ وغم تازہ ہے، یعنی میت سے دور ہوکر ان کو تکلیف زیادہ ہوگئی کچھ دیر غم والم کی کیفیت میں کمی رہی تو اچھا ہے، یہ حضور علیہ السلام کی غایت رافت ورحمت کی بات تھی، جو آپ کی موجودگی میں نبھ بھی گئی کیونکہ آپ کے سامنے کوئی فتنہ رونما نہیں ہوسکتا تھا، حضرت عمرؓ دور تک دیکھ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ایسی چیزوں کی روک تھام حضور کے سامنے ہی سے ہونے لگے تو بہتر ہے، آں حضرت ﷺ بھی ان سب امور کی اہمیت اور آگے آنے والے واقعات کا اندازہ فرماتے تھے اس لئے ایک عام حکم دے گئے کہ میرے بعد ابوبکر وعمرؓ کا اتباع کرنا، آپ جانتے تھے کہ شریعت کا اصل مزاج یہ دونوں حضرات اچھی طرح سمجھ چکے ہیں، یہ نہ خود غلطی کریں گے نہ غلطی کرنے دیں گے، حضرت ابوبکرؓ کا دور خلافت اور حضور علیہ السلام کے بعد زندگی بہت تھوڑی تھی پھر ارتداد وغیرہ کے فتنے فرو کرنے میں مشغولیت زیادہ رہی، حضرت عمرؓ نے اُن کے مختصر دور میں بھی اور پھر اپنے طویل دور میں شریعت کے تمام تقاضوں کو صحیح طور سے پورا کرانے میں اپنی ساری صلاحیت صرف کردی تھی، اس لئے آپ کے تمام ہی فیصلوں کی بڑی اہمیت ہے، اور خاص طور سے ''صنف نسواں'' کے سلسلہ میں ان کی آراء اور فیصلوں کو حرف آخر سمجھنے کے سوا چارۂ کار نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ نصف امت محمدیہ (صنف نسواں) کے بارے میں ہم شریعت محمدیہ کے مزاج کی تشخیص صحیح ومکمل طریقہ پر کرلیں، اور باقی نصف (رجال) کے بھی حقوق، اختیارات اور فرائض کو اچھی طرح سمجھ لیں تو پوری امت کی فلاح وبہبودی کا مسئلہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہوجاتا ہے، اور ہم ہر غلط قدم اٹھانے سے باز رہ سکتے ہیں، ورنہ بیشتر مصائب ومشکلات کا باعث وسبب ہم خود بنیں گے۔ وفقنا اللہ لما یحب ویرضیٰ!

ازواجِ مطہرات کا نعم البدل؟

امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں آیت عسیٰ ربہ ان طلقکن پر مستقل باب ۷۳۱ میں باندھا ہے اور حضرت عمرؓ کی روایت نقل کی کہ نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات نے غیرت نسوانی کے جذبہ سے متاثر ہوکر اجتماعی تحریک کی تو میں نے ان سے کہا اگر نبی علیہ السلام تمہیں سب کو طلاق دیدیں تو جلد ہی ان کا پروردگار تم سے بہتر بیویاں آپ کو بدلہ میں عطا کرے گا، چنانچہ بعینہ ان ہی الفاظ میں اوپر کی آیت

---

[1] خیال کیجئے کہ آج بھی اگر عورتوں کو جنازہ کے ساتھ جانے کی اجازت باقی رکھی جائے تو کتنی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں، یا حضور علیہ السلام کے زمانہ میں عورتیں عیدگاہ جاتی تھیں، اگر آج بھی ان کے لئے جانے کی شرعاً اجازت سمجھی جائے جیسا کہ اس زمانہ کے اہل حدیث حضرات سمجھتے ہیں تو فتنہ کی روک تھام کون کر سکے گا؟! ''مؤلف''

کا نزول ہوا، مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ واللہ! ہم ایام جہالت میں عورتوں کو کچھ اہمیت نہ دیتے تھے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خاص ہدایات واحکام نازل فرمائے، اور ان کو مال میں بھی حصہ دار ٹھیرایا، ایک دن میں اپنے طور پر کسی کام کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری بیوی نے کہا کہ تم اس اس طرح کرو تو اچھا ہے میں نے کہا تمہیں ان معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے اور ہم تمہیں اپنے کاموں کے فکر کی تکلیف دینا بھی نہیں چاہتے، اس نے کہا! عجیب بات ہے آپ کی بھی، میرا بولنا تو آپ کو ناگوار گزرا اور آپ کی بیٹی حضور ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہے حتی کہ حضور علیہ السلام پورا پورا دن غم وغصہ میں گزارتے ہیں، حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ یہ سُنتے ہی میں نے فوراً اپنی چادر سنبھالی اور سیدھا حفصہؓ کے پاس پہنچ گیا، اور اس سے کہا بیٹی! یہ کیا معاملہ ہے تو حضور علیہ السلام کو جواب دیتی ہے اور ان کو سارے دن غم وغصہ میں مبتلا رکھتی ہے؟ حفصہؓ نے کہا، واللہ! بات تو صحیح ہے ہم حضور علیہ السلام کو جواب دیتے ہیں، میں نے کہا دیکھ! میں تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے غضب سے ڈراتا ہوں، اور تو دوسری (بیوی حضرت عائشہؓ) کی وجہ سے دھوکہ میں نہ رہنا کہ اس سے تو حضور علیہ السلام کو خاص طور سے محبت ہے، پھر میں نکلا کہ ام سلمہ کے پاس جاؤں کیونکہ وہ میری رشتہ دار تھیں (توقع زیادہ تھی کہ بات مانیں گی) ان سے بات کی تو انہوں نے کہا ابن الخطاب! تمہاری بھی عجیب بات ہے کہ تم ہر معاملہ میں دخل دیتے ہو، اور حد ہوگئی کہ اب تم چاہتے ہو کہ حضور علیہ السلام اور آپ کی بیویوں کے معاملات میں بھی مداخلت کرو، حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ان کا یہ جواب سن کر میرا دل ٹوٹ گیا، حوصلہ پست ہوگیا، اور عجیب کشش وپنج میں مبتلا ہوگیا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، آگے قصہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے کا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ جب میں ام سلمہ والی بات پر پہنچا اور آپ کو سُنائی تو آپ مسکرائے الخ! نووی ۴۸۱/۱[1]

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے بھی کچھ ایسا ہی جواب دیا تھا، اور شاید اُس پر بھی آپ مسکرائے ہوں گے بلکہ مسلم شریف کی طویل حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ آپ کسی بات پر کھلکھلا کر بھی ہنسے تھے۔

بخاری شریف ۶۴۴ اور تفسیر ابن کثیر ۳۹۰ میں یہ روایت بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے جب ازواجِ مطہرات سے حضور علیہ السلام کی ناراضی کا علم ہوا تو میں ان کے پاس ایک ایک کے گھر گیا اور سمجھایا کہ یا تو تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کو تمہارے بدلے میں تم سے بہتر ازواج عطا فرماوے گا، اور جب آخر میں ایک[1] کے پاس پہنچا تو وہ کہنے لگیں:۔ اے عمر! کیا خود رسول اکرم ﷺ اپنی بیویوں کو نصیحت نہیں فرما سکتے کہ تم اس فریضہ کو ادا کرتے چلے ہو؟ میں یہ سُن کر رُک گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت **عسى ربه ان طلقكن ان يبدله ازواجا خيراً منكن مسلمات** الخ نازل فرمائی۔

مسلم شریف میں زیادہ تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ جب نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار کی تو میں مسجد نبوی میں گیا، دیکھا کہ لوگ غمگین بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے یہ واقعہ حکم حجاب سے پہلے کا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں ابھی اس معاملہ کی تحقیق کرونگا چنانچہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا اور کہا مجھے معلوم ہوا کہ تم رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتی ہو، انہوں نے کہا تمہارا مجھ سے کیا کام، تم اپنے گھر کی خبر لو، پھر میں حفصہ کے پاس گیا اور کہا تمہارے بارے میں بھی مجھے معلوم ہوا کہ تم رسول اکرم ﷺ کو ایذا پہنچاتی ہو، مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ تمہاری ان باتوں کو پسند نہیں کرتے، اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ

---

[1] علامہ قسطلانیؒ نے کہا کہ یہ جواب دینے والی حضرت ام سلمہ تھیں جیسا کہ تفسیر سورۂ تحریم (بخاری ۷۳۰) میں ہے اور خطیب نے کہا کہ وہ زینب بنت جحش تھیں، امام نووی نے بھی یہی کہا (حاشیہ بخاری ۶۴۴) سب ازواجِ مطہرات کے جوابات کہیں نظر سے نہیں گزرے، صرف حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینبؓ کے نقل ہوئے، اور حضرت حفصہؓ خاموش رہیں کچھ جواب نہیں دیا، اور بہت زیادہ روئیں، شاید اس لئے کہ ان چاروں میں سے سب سے زیادہ اپنی غلطی کا احساس ان ہی کو ہوا تھا، اور اس میں حضرت سیدنا عمرؓ کی تربیت کا بھی خاص اثر معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!" مؤلف"

تمہیں طلاق بھی دے چکے ہوتے، اس پر وہ بہت روئیں، میں نے پوچھا، رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟ کہا وہ بالا خانہ پر ہیں، میں وہاں گیا تو رباح غلام رسول علیہ السلام کو دیکھا کہ بالا خانہ کے دروازہ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے، میں نے کہا حضور علیہ السلام سے میرے حاضر ہونے کی اجازت لے، اس نے اندر کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھ کر چپ ہو گیا، میں نے پھر کہا اجازت لے، اُس نے پھر اسی طرح اندر دیکھا اور میری طرف دیکھ کر خاموش رہا، پھر میں نے بلند آواز سے پکار کر کہا کہ میرے لئے حضور سے اجازت لے، شاید آپ کو یہ خیال ہو کہ میں حفصہ کی سفارش کو آیا ہوں، واللہ! اگر حضور علیہ السلام اس کی گردن ماردینے کا حکم کریں گے تو میں اس کی بھی فوراً تعمیل کروں گا، اس پر اُس نے میری طرف اشارہ کیا کہ آ جایئے، میں رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ آپ ایک بوریئے پر لیٹے تھے میں بیٹھ گیا، آپ نے اپنا تہمد درست کیا، اس کے سوا اس وقت اور کوئی کپڑا آپ کے بدن پر نہیں تھا، اور بوریئے کے نشان پہلوئے مبارک پر نمایاں تھے۔ اس کمرے میں نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک صاع کے قریب جو رکھے ہوئے تھے، اور ایک کھونٹی پر نیم دباغت شدہ کھال لٹکی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضور علیہ السلام نے فرمایا، روتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں کیوں نہ روؤں، دیکھتا ہوں کہ چٹائی کے نشان آپ کے پہلوئے مبارک پر نمایاں ہیں اور آپ کے گھریلو سامان کا کمرہ ہے جس میں کچھ بھی قابل ذکر چیز نہیں، یہ قیصر وکسریٰ تو دنیا کی عیش وبہار کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور آپ خدا کے برگزیدہ رسول ہیں، آپ کے پاس دنیا کا کچھ بھی سامان نہیں، آپ نے فرمایا، اے ابن الخطاب! کیا تم اس بات کو پسند نہ کرو گے کہ ہمارے لئے آخرت اور اس کی ابدی نعمتیں ہوں اور ان کے لئے صرف دنیا کی عارضی لذات ہوں، میں نے عرض کیا کیوں نہیں، یعنی مجھے تو آخرت ہی پسند ہے۔

حضرت عمرؓ نے آگے بیان کیا کہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے کے وقت میں نے آپ کے چہرہ پر غضب وغصہ کے آثار دیکھے تھے، اس لئے میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! آپ کو عورتوں کے بارے میں کسی فکر وغم میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اگر آپ ان کو طلاق دے چکے ہیں تو آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے فرشتے اور خاص طور سے حضرت جبرئیل ومیکائیل علیہ السلام اور میں اور ابوبکرؓ اور سارے مومن آپ کے ساتھ ہیں، پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ میں خدا کا بڑا شکر کرتا ہوں کہ میں نے جب بھی کوئی بات کہی ہے اللہ تعالیٰ سے ضرور امید رکھی کہ وہ میری بات کی تصدیق کریگا، چنانچہ یہ آیت آیتِ تخییر، عسى ربه ان طلقكن اور وان تظاهرا عليه فان الله هو مولاه الايه اتریں، اور حضرت عائشہؓ وحفصہؓ دونوں ہی مل کر باقی دوسری ازواجِ مطہرات کے مقابلہ میں مظاہرے کیا کرتی تھیں، میں نے حضور سے سوال کیا کہ کیا آپ نے ان کو طلاق دے دی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ! میں جب مسجد میں آیا تو سارے لوگ غمگین بیٹھے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے، کیا مجھے اجازت ہے کہ ان کو جا کر خبر کردوں کہ آپ نے طلاق نہیں دی ہے، آپ نے فرمایا ہاں! تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔

اس کے بعد میں برابر آپ سے باتیں کرتا رہا، یہاں تک کہ آپ کے چہرۂ مبارک سے غضب وغصہ کے آثار جاتے رہے بلکہ آپ کو کسی بات پر ہنسی بھی آ گئی، اور میں نے آپ کے نہایت خوبصورت دندان مبارک دیکھ لئے، پھر میں آخری دن بھی حضور علیہ السلام کے پاس ہی تھا، جب آپ بالا خانہ سے اترے اور میں بھی ساتھ اترا مگر میں تو زینہ کی لکڑی کا سہارا لے کر اترا اور آپ اس طرح بے تکلف بغیر کسی سہارے کے اترے جیسے زمین پر چل رہے ہوں، میں نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تو صرف ۲۹ دن بالا خانہ میں رہے آپ نے فرمایا، ہاں! مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے، اسی درمیان میں نے مسجد نبوی کے دروازہ پر بلند آواز سے اعلان کر دیا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی ازواجِ مطہرات کو طلاق نہیں دی ہے۔

اور چونکہ میں نے حضور علیہ السلام سے واقعہ کی تحقیق کرنی چاہی تھی لہذا یہ آیت بھی نازل ہوئی تھی واذا جاء هم امر من الامن او الخوف الايه (ان لوگوں کو جب کبھی کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے تو بلا تحقیق) اس کو مشہور کر دیتے ہیں، اگر وہ اس کی جگہ رسول

اللہ علیہ و سلم اور اہل حل وعقد یا ذمہ دار سمجھدار حکام کی طرف رجوع کرتے وہ صحیح بات کی کھوج نکال کر بتا دیتے (پھر اسی کے موافق جتنی بات عام لوگوں میں مشہور کرنے کی ہوتی اس کو مشہور کیا جاتا، اور جس کا چرچا کرنا بے سود یا مضر ہوتا اس کے کہنے سننے میں احتیاط برتی جاتی) لہذا میں استنباط کر کے صحیح علم حاصل کرنے والا تھا، (نووی ۴۸۰ کتاب الطلاق) اس طویل ومفصل حدیث مسلم شریف سے کئی امور میں حضرت سیدنا عمرؓ کی موافقت وحی ثابت ہوئی جن میں ایک کا تعلق آیات قرآنی عسیٰ ربه ان طلقکن الا یه سے ہے۔

اہم سوال وجواب! یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور اکرم علیہ السلام کی ازواج مطہرات ساری دنیا کی عورتوں سے افضل اور اعلیٰ مرتبہ کی تھیں تو ان کا نعم البدل کہاں سے ملتا؟ محقق عینیؒ نے صاحب کشاف سے یہ سوال اور پھر اس کا جواب بھی ان سے نقل کیا کہ اگر حضور علیہ السلام ان کو نافرمانی اور ایذاء دہی کے باعث طلاق دیدیتے تو پھر وہ افضل ہی کب باقی رہتیں، بلکہ دوسری عورتیں آپ کے شرف زوجیت کے ساتھ آپ کی طاعت ورضامندی وخوشنودی کے اوصاف کی بھی جامع ہوتیں تو وہ اس سے بھی یقیناً بہتر ہو جاتیں۔

علامہ نسفیؒ نے کہا کہ آیت مذکورہ میں صرف قدرت کی خبر دی گئی ہے، وقوع کی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان طلقکن (اگر طلاق دیدیں) اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ وہ طلاق نہیں دیں گے، لہذا اس قدرت کے اظہار کا موقع بھی نہیں آئے گا، جس طرح آیت وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم میں بھی صرف اخبار قدرت اور امت محمدیہ کو ڈرانا ہے کہ تم روگردانی کرو گے، تو تمہاری جگہ دوسری قوم کو دیدی جائے گی جو تم سے بہتر ہوگی، یہ نہیں کہ واقع میں کوئی دوسری امت یا قوم امت محمدیہ سے بہتر عالم وجود میں تھی، جس کو امت محمدیہ کا مرتبہ دیا جاسکتا تھا۔ (عمدہ ۲۲/۲۳۷)

ایلاء کے اسباب: حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے حسب روایت امام بخاریؒ شدت غضب وغصہ کی وجہ سے جو ایک ماہ کے لئے ازواج مطہرات سے علیحدہ رہنے کا حلف کیا تھا اس کے وجوہ واسباب کیا تھے اس کے بارے میں آراء واقوال مختلف ہیں اور حافظؒ نے ان سب کو ایک جگہ نقل کر دیا ہے پھر اپنی یہ رائے بھی لکھی ہے کہ ممکن ہے یہ سب ہی اسباب جمع ہونے کے بعد حضور علیہ السلام نے ایسا اقدام فرمایا ہو، کیونکہ حضور علیہ السلام کے مکارم اخلاق، وسعت صدر اور کثرت مسامحت وصلح کی عادت سے ایسی ہی توقع ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسباب تو سب جمع ہو چکے ہوں لیکن اشارہ صرف اہم واقعہ کی طرف کیا گیا ہو پھر حافظؒ[1] نے لکھا کہ یہ بھی لطائف میں سے ہے کہ حضور علیہ السلام میں جو ایک ماہ کی قسم کھائی حالانکہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے نہ بولنا یا قطع تعلق کرنا مشروع نہیں ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ سب ازواج مطہرات کی تعداد نو تھیں ان کے ۲۷ دن ہوئے اور حضرت ماریہؓ کے دو دن کہ وہ باندی تھیں اس طرح کل ۲۹ دن ہوئے (اور وہ مہینہ بھی اتفاق سے اتنے ہی دن کا تھا) وہ سب اسباب یہ ہیں۔

(۱) مسلم شریف میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے پاس سب ازواج جمع ہوئیں اور نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کیا، اور آپ ناراض ہو کر ایک ماہ کے لئے ان سے الگ رہے، اور پھر آیت تخییر اتری۔

(۲) قصہ تحریم عسل، کہ ازواج مطہرات کی وجہ سے حضور علیہ السلام نے شہد کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

(۳) قصہ تحریم ماریہؓ کہ حضرت عائشہ وحفصہؓ کی وجہ سے آپ نے حضرت ماریہ کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

(۴) حضرت حفصہؓ نے حضور علیہ السلام کی ایک بات کا افشاء کر دیا تھا، جس کو پوشیدہ رکھنے کی آپ نے ان کو تاکید فرمائی تھی۔

(۵) حضور علیہ السلام کے پاس کوئی چیز ہدیہ میں آئی، جو آپ نے سب ازواج طیبات کے پاس حصہ رسدی بھیج دی لیکن حضرت زینب بنت جحش نے اپنے حصہ کی چیز کو کم سمجھ کر واپس کر دیا، دوبارہ آپ نے بھیجی اس کو بھی واپس کر دیا، حضرت عائشہؓ نے حضور علیہ السلام

---

[1] فیض الباری ۲۲ میں یہ توجیہ حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب ہوگئی ہے، غالباً حضرتؒ نے حافظ کا حوالہ دیا ہوگا جو ضبط نہ ہوسکا، ورنہ حضرتؒ دوسروں کی تحقیق اپنی طرف سے بیان فرمانے کے عادی نہ تھے، واللہ تعالیٰ اعلم!"مؤلف"

سے کہا کہ دیکھئے! انہوں نے آپ کو آپ کا ہدیہ واپس کر کے ذلیل کیا، آپ نے فرمایا: تم سب مل کر بھی خدائے تعالیٰ کے یہاں اتنی بڑی عزت نہیں رکھتیں کہ وہ تمہاری وجہ سے مجھے ذلیل کرائے، میں تم سے ایک ماہ تک نہ ملوں گا (رواہ ابن سعد عن عائشہؓ) دوسری روایت زہری کی بھی حضرت عائشہؓ سے اسی طرح ہے اتنا فرق ہے کہ اس میں ہے آپ نے کوئی ذبیحہ کیا اور اس کا گوشت ازواجِ مطہرات کے پاس بھیجا، حضرت زینبؓ کو بھی ان کا حصہ ارسال کیا تو انہوں نے اس کو واپس کر دیا، آپ نے فرمایا زیادہ کرے کے بھیج دو، اس طرح تین بار بھیجا، مگر ہر مرتبہ انہوں نے واپس کر دیا، اس پر آپ ناراض ہوئے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا خاص ریمارک

اوپر کے اقوال ذکر کر کے حافظؒ نے کہا کہ ابن الجوزیؒ نے ذبیحہ کا قصہ بغیر اسناد کے ذکر کیا، حالانکہ وہ ابن سعدؒ نے سند کے ساتھ نقل کیا ہے تفقہ والے واقعہ کو مبہم کر دیا حالانکہ وہ صحیح مسلم میں ہے اور راجح سب اقوال میں سے حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے کیونکہ اس کا تعلق خاص طور سے حضرت عائشہ وحفصہؓ دونوں کے ساتھ ہے، بخلاف قصہ عسل کے کہ اس میں تو ازواجِ مطہرات میں سے ایک جماعت نے شرکت کی تھی۔ (فتح الباری ۲۴۶)

مظاہرہ پر تنبیہ اور حمایتِ خداوندی

حضرت عائشہ وحفصہؓ نے جو مظاہرہ کی صورت اختیار کی تھی، اس پر ان کو متنبہ کیا گیا اور توبہ وانابت کی تلقین کی گئی، حضرت علامہ محدث صاحبِ تفسیر مظہری نے آیت وان تظاهرا عليه کے تحت لکھا ہو کہ اگر تم دونوں آپس میں تعاون کر کے ایسی باتیں کرتی رہیں جن سے حضور علیہ السلام کو قلبی اذیت ہو خواہ وہ غیرت کی غیر معمولی افراط وزیادتی کے سبب ہو یا افشاءِ راز کی صورت میں ہو اور تم اس سے توبہ نہ کرو گی تو تمہیں ناکامی ونامرادی کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کی مدد پر ہیں، اور حضرت جبرئیل ونیکوکار مسلمان سب ہی ان کے معین ومددگار ہیں، اور پھر سارے ہی فرشتوں کی امداد آپ کو حاصل ہوگی۔

بظاہر یہ سب تنبیہ اور حضرت عائشہؓ وحفصہؓ کے مقابلہ میں نصرت وحمایت کی ضمانت ان کی سابقہ غلطی کا احساس دلانے اور آئندہ کے لئے ایسی ہر بات سے روکنے کے واسطے تھی جس سے حضور علیہ السلام کے قلبِ مبارک کو اذیت ہو اور اکثر مفسرین نے اتنا ہی لکھا ہے لیکن سیرۃ النبی ۷؍۵۵ میں اس کے پس منظر میں منافقوں کی شرانگیزی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جس کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا، اور نہ اب تک ہماری نظر سے گزری، مگر وہ بات دل کو لگتی ہے، اس لئے یہاں ذکر کی جاتی ہے:۔ ''روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں، اور اگر حضرت ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں، لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں؟ اور حضرت عائشہ وحفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پر خطر ہو سکتی ہے، جس کی مدافعت کے لئے ملاءِ اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا، جس کی تعداد چار سو تک بیان کی گئی ہے یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آں حضرت ﷺ کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوادیں (ابن حجر نے اصابہ میں ام جلدح کے حال میں لکھا ہے وکانت تحرش از واجِ النبی ﷺ، یعنی وہ ازواجِ مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آ چکی تھی، رسول اللہ ﷺ پندرہ دن تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسان افک میں شریک ہو گئے تھے، آں حضرت ﷺ کی سالی حمنہ (حضرت زینبؓ کی بہن) سازش میں آ گئی تھیں، چنانچہ اس بات کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریکِ تہمت طرازی تھے، مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہؓ کی براءت پر وحی نہ آ جاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہو چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہرات کی کشش خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بھڑکانا چاہا ہوگا، چونکہ مظاہرہ کے ارکانِ اعظم حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں ان کو خیال ہوا ہوگا کہ ان کے ذریعہ سے ان کے والدین (حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ) کو بھی اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اکرم ﷺ کی خاک پر قربان کر سکتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذن نہ ملا تو انہوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا سر لے کر آؤں۔

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے یعنی اگر عائشہ وحفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خدا پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے اور خدا کے ساتھ جبرئیل وملائکہ بلکہ تمام عالم ہے''۔

ضروری فائدہ! مذکورہ بالا واقعہ اگر صحیح ہے تو اس سے ایک بڑا سبق یہ بھی ملتا ہے کہ دوسری غیر عورتوں کا مسلمان گھروں میں آنا جانا اور گھریلو معاملات میں دراندازیاں کرنا نہایت مضر ہوتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے صرف اونسائھن (اپنی عورتوں) کو حجاب کے احکام سے مستثنیٰ کیا ہے ان کے علاوہ غیر مسلم عورتوں اور بدچلن، شر پسند اور تفریق بین الازواج کی خوگر عورتوں سے اجتناب واحتراز ضروری ہے اور خاص طور سے غیر مسلم عورتوں کی دراندازیوں سے بچانا اس لئے بھی ضروری تر ہے کہ وہ بداندیش وشر پسند مردوں کی الہ کار بن سکتی ہیں، نیز مسلمان گھرانوں کے بھید بھاؤ سے واقف ہو کر دوسرے نقصانات بھی پہنچا سکتی ہیں۔

عورتوں میں تاثر وانفعال کا مادہ بہ نسبت مردوں کے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لئے جہاں وہ اچھی تعلیم وصحبت کے بہتر اثرات جلد قبول کر سکتی ہیں، بری تعلیم وصحبت کے برے اثرات بھی بہت جلد قبول کرتی ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

''ہم قریش کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ عورتوں پر ہماری بالادستی تھی، لیکن جب مدینہ میں آئے تو ہم ان لوگوں کے ساتھ رہے سہے جن میں عورتوں کو بالادستی حاصل تھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ہماری عورتیں بھی یہاں کی عورتوں کے اثرات قبول کرنے لگیں اور ان کے اطوار واخلاق سیکھنے لگیں، ایک دن میں نے اپنی بیوی پر غصہ کا اظہار کیا تو خلافِ توقع وہ جواب دینے لگی، اور مجھے یہ عجیب سی نئی بات محسوس ہوئی تو وہ کہنے لگی کہ آپ میری جوابدہی کا برا ماننے لگے، حالانکہ رسول اکرم ﷺ کی ازواج بھی تو آپ کو برابر کا جواب دیتی ہیں، اور کوئی تو آپ سے سارے سارے دن بات کرنا بھی چھوڑ دیتی ہیں۔ الخ (ابن کثیر ۳۸۸/۴)

حافظؒ نے حضور علیہ السلام کے واقعہ ایلاء کے ذیل میں لکھا کہ حضور علیہ السلام چونکہ عورتوں پر سختی کرنے کو پسند نہ فرماتے تھے اس لئے آپ نے انصار کی سیرت وعادت اختیار فرمائی تھی جو ان کی اپنی بیویوں کے بارے میں تھی، اور اپنی قوم (قریش) کی سیرت وطریقہ کو آپ نے ترک فرما دیا تھا۔ (فتح الباری ۲۳۴)۔

حافظؒ کے اس تبصرہ سے بہت سی چیزوں کا جواب خود بخود مل جاتا ہے، اور عورتوں کے بارے میں جو کچھ فرق حضور علیہ السلام اور حضرت عمرؓ وغیرہ، صحابہ کے طور وطریقہ میں معلوم ہوتا ہے، اس کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے درحقیقت حضور علیہ السلام رحمت ورافتِ مجسم تھے، اور آپ کا طرۂ امتیاز خلق عظیم تھا، پھر یہ کہ آپ کی ہر قسم کی حفاظت وصیانت حق تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی، اور آپ ہی کا اتنا عظیم حوصلہ بھی تھا کہ ساری کدورتوں کے اسباب جمع ہو کر بھی آپ کی یکسوئی وسکونِ خاطر کو پراگندہ نہیں کر سکتے تھے اور صبر واستقامت[1] کے لئے وہ

[1] اسی سے ہے کہ حضور اکرم ﷺ ازواجِ مطہرات کے آپسی جھگڑوں پر بھی صبر کرتے اور ان میں مصالحت واصلاح کی سعی فرماتے تھے (الفتح الربانی ۱۵۳/۲۲) اور حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنے بعد تمہارے احوال ومعاملات کی بڑی فکر ہے اور تمہارے بارے میں بڑی صبر والے اور اصحابِ صدق وصفا ہی کامیاب ہو سکتے ہیں (الفتح الربانی ۱۵۴) بظاہر روئے سخن سب ہی عورتوں کی طرف اور عام ہے کہ تمہارے اوپر صبر واستقامت کے ساتھ شفقت ورافت کا برتاؤ صرف صادق الایمان صبر والے ہی کر سکیں گے واللہ اعلم!

اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ اولوالعزمی کا تامل تھا، جو سارے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں بھی فائق تھا، ایسی صورت میں اس فرق پر کوئی تشویش ونکارت نہ ہونی چاہیے، اور عورتوں کے بارے میں معتدل راہ وہی اختیار کرنی بہتر ہوگی جو حضور علیہ السلام کے ارشادات، اور حضرات صحابہ کرامؓ کے تعامل کی روشنی میں منقح ہوکر سامنے آئے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

استنباطِ سیدنا عمرؓ! اس بارے میں موافقت وحی (آیت لعلمه الذين يستبطونه منهم۔ سورۂ نساء) سے اوپر کی احادیث میں ثابت ہو چکی ہے

اسارٰی بدر سے فدیہ نہ لینے کی رائے

اس واقعہ کی پوری تفصیل حضرت علامہ عثمانیؒ نے فوائدِ قرآن مجید ۲۴۴ میں آیت ماكان لنبي ان يكون له' اسرىٰ کے تحت بیان کردی ہے، جس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کی رائے بابتہ قتل اُساریٰ بدر زیادہ صواب تھی بہ نسبت رائے صدیق اکبرؓ کے کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس وقت کفار خصوصاً کفار قریش کے ساتھ زیادہ سختی کا معاملہ کرنا ہی زیادہ موزوں ومناسب تھا، پھر ان کو چھوڑ دینا رحم وشفقت کے جذبہ تک بھی کسی قدر معقول بات تھی، لیکن اسی کے ساتھ مالی ضروریات کا بھی لحاظ بالکل مناسب نہ تھا کہ کفر کا زور توڑنے کی وقتی اہم ترین ضرورت کے مقابلہ میں اس کی کچھ قیمت نہ تھی، پھر اسی کے ساتھ آئندہ ستر مسلمانوں کی شہادت کی شرط بھی قبول کر لینا اور بھی سخت بات تھی، جو مسلمانوں کو ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے تھی، ایسی حالت میں عذابِ الٰہی کا آجانا مستبعد نہ تھا، چنانچہ حضور علیہ السلام کو وہ عذاب متمثل کر کے دکھا بھی دیا گیا، اور اس عذاب کو روکنے والی جو چیزیں ہو سکتی تھیں وہ بطور احتمال مندرجہ ذیل تھیں:۔

(۱) مجتہد کو اجتہادی خطا پر عذاب نہیں دیا جاتا (۲) جب تک کوئی حکم امر ونہی کا پوری طرح واضح نہ ہو اس کے خلاف کرنے پر عذاب نہیں ہوتا (۳) اہل بدر کی خطاؤں سے حق تعالیٰ نے درگذر کرنے کا وعدہ فرمالیا تھا (۴) فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا جواز حق تعالیٰ کے علم میں طے شدہ تھا اور اس کا اجراء جلد ہی ہونے والا تھا، اس لئے اس سے قبل بھی قابلِ درگزر قرار دیدیا گیا (۵) پیغمبر علیہ السلام کی موجودگی میں عذاب نہ اتارنے کا وعدہ کیا گیا تھا، وما كان الله ليعذبهم وانت فيهم (سورۂ انفال) (۶) جب تک لوگ استغفار کرتے رہیں گے اُن پر عذاب نہ آئے گا، وما كان الله معذبهم وهم يستغفرون (سورۂ انفال) ان قیدیوں میں سے بہت سے لوگوں کی قسمت میں اسلام لانا خدا کے علم میں تھا ان وجود میں سے اکثر کا ذکر تفسیر ابن کثیر، تفسیر روح المعانی اور تفسیر مظہری میں بھی ہے اور صاحب روح المعانی نے اس اعتراض کا بھی جواب دے دیا ہے کہ چوتھی وجہ کو وجہ رفع عذاب بنانا درست نہیں کیونکہ جب تک کسی چیز کا جواز مشروع نہ ہو جائے، عدم جواز ہی کے احکام نافذ ہوتے ہیں، لہٰذا آئندہ خدائے تعالیٰ کے علم میں فدیہ کا جواز ہونے والا تھا، اس لئے پہلے ہی عذاب رک جائے، یہ بات بظاہر معقول نہیں معلوم ہوتی، جواب یہ ہے کہ یہاں مراد آیت میں عذابِ دنیوی ہے جو رفع کر دیا گیا، باقی مواخذۂ اخروی کا ترتب وہ ضرور ہر غیر مشروع کے ارتکاب پر ہوگا، حاصل یہ ہے کہ جو تم نے (اخذِ فدیہ کا عمل) کیا وہ فی نفسہ بہت ہی بڑی غلطی ہے جو عذابِ عظیم کی مستوجب ہے، لیکن اس سے درگذر کرنے اور عذابِ دنیوی کو روکنے والی وجہ یہ ہے کہ اس کو عنقریب تمہارے لئے حلال وجائز کیا جانے والا ہے، کیونکہ میری رحمت عذاب پر سبقت کرنے والی ہے پھر صاحبِ روح المعانی نے لکھا کہ اعتراض مذکور کے لئے جواب مذکور کا تکلف کرنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ محدث ابن ابی حاتم، اور ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے اور محدث بیہقی، ابن جریر، ابن المنذر وغیرہم نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی اس وجہ کو نقل کیا ہے (روح المعانی ۳۵/۱۰)

لہ اس اعتراض کو تفہیم القرآن ۱۵۹ میں بھی نقل کیا گیا ہے لیکن آگے جو صاحب روح المعانی اور حافظ ابن کثیر نے جواب نقل کیا ہے، اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور پھر صاحبِ تفہیم نے جو جواب اپنی طرف سے لکھا ہے وہ خود محل نظر ہے ہم اس کو بھی لکھیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ ''مؤلف''

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا کہ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے قول باری تعالیٰ لو لا کتاب من اللہ سبق کی تفسیر میں نقل کیا کہ کتاب سے مراد ام الکتاب الاول ہے اس میں اگر یہ بات لکھی نہ ہوتی کہ اموال غنیمت اور اساریٰ کے فدیے اس امت کے لئے حلال ہوں گے تو تم پر عذاب عظیم آجاتا، اسی لئے بعد کو فکلو امما غنمتم حلا لا طیبا اتری، اور اسی طرح عوفی نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن مسعود، سعید بن جبیر، عطاء حسن بصری، قتادہ، اور اعمشؒ سے بھی منقول ہے کہ آیت لو لا کتاب من اللہ سبق سے مراد اسی امتِ محمدیہ کے لئے غنائم کا حلال ہونا ہے اور اسی کو ابن جریرؒ نے اختیار کیا ہے، نیز اس کی تائید صحیحین کی حدیثِ جابرؓ سے بھی ہوتی ہے کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئیں جو پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں، ان میں سے ایک غنائم کا حلال ہونا بھی ہے (تفسیر ابن کثیر ۳۲۶؍۲)

اگلی آیت فکلو امما غنمتم حلالا طیبا و اتقوا اللہ ان اللہ غفور رحیم کے تحت صاحب روح المعانی نے لکھا کہ اس سے مراد فدیہ کی رقوم ہیں، جیسا کہ محی السنہ نے فرمایا کہ جب پہلی آیت اتری تو صحابہ کرام نے فدیہ کی رقوم کا استعمال روک دیا تھا، پھر جب یہ دوسری آیت اتری تو ان کا استعمال جائز تھا، اور یہ سمجھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد مطلق تمام اموالِ غنیمت ہوں، جس میں فدیہ کی رقوم بھی تھیں، ورنہ صرف غنیمت کی حلت تو اس سے قبل ہی آیتِ واعلموا انما غنمتم الخ سے معلوم تھی، بلکہ اس سے بھی پہلے سریہ عبداللہ بن جحش والے واقعہ سے معلوم ہو چکی تھی کہ اس میں مالِ غنیمت کو صحابہ نے تقسیم کر لیا تھا تو حضور علیہ السلام نے اس کو بھی جائز رکھا تھا۔ الخ، پھر آگے حق تعالیٰ نے تقویٰ اور مخالفتِ ظاہری سے بھی بچنے کی تلقین فرما کر اخذِ فدیہ والی غلطی سے درگذر کر کے اپنی مغفرت و رحمت سے نوازنے کی بھی بشارت دیدی (روح المعانی ۳۶؍۱۰)

مفسرین پر صاحب تفہیم کا نقد

آیتِ مذکورہ لولا کتاب من اللہ سبق کے تحت آپ نے لکھا:۔ ''مگر مفسرین آیت کے اس فقرے کی کوئی معقول تاویل نہیں کر سکے ہیں کہ ''اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا'' وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد تقدیر الٰہی ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی ارادہ فرما چکا تھا کہ مسلمانوں کے لئے غنائم کو حلال کر دے گا میرے نزدیک اس مقام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے سورۂ محمد میں جنگ کے متعلق جو ابتدائی ہدایات[1] دی گئی تھیں ان میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ فاذا لقیتم الذین کفروا الایہ اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت تو دیدی گئی تھی مگر اس شرط کے ساتھ کہ دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے، پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے، اس فرمان کی رو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کئے اور اس کے بعد ان سے جو فدیہ وصول ہوا تھا تو اجازت کے مطابق مگر غلطی یہ ہوئی کہ ''دشمن کی طاقت کو کچل دینے کی'' جو شرط مقدم رکھی گئی تھی تو اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی، جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک گروہ غنیمت لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا کچھ دور تک تعاقب کیا۔ الخ (تفہیم القرآن ۱۵۹؍۲)

---

[1] مولانا آزاد نے لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذ تم کے ترجمہ میں جنگ بدر کا مالِ غنیمت لکھا ہے، حالانکہ مالِ غنیمت کا جواز پہلے آچکا تھا، اس کی وجہ سے عذاب آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، دوسرے انھوں نے عدمِ قتل اساریٰ بدر اور اخذِ فدیہ کی وجہ صرف مسلمانوں کی بڑی تنگی و افلاس کو قرار دیا، حالانکہ متعدد وجوہ تھے، جن میں سب سے بڑی وجہ رافت و رحمت اور ان کے قبولِ اسلام کی امید تھی۔'' مؤلف''

[2] تفسیر مظہری ۱۱۲؍۴ میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آیت ما کان لنبی ان یکون لہ اسری کا تعلق بدر سے ہے جبکہ مسلمان اس وقت کم تھے، پھر جب بہت ہو گئے اور ان کا خوب غلبہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو (سورۂ محمد کی) آیت فاما منا بعد و اما فداء سے منسوخ کر دیا، اور نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو قیدیوں کے بارے میں اختیار دیدیا کہ چاہیں قتل کریں چاہیں غلام بنائیں، چاہیں فدیہ لیں، اور چاہیں آزاد کر دیں۔
اس سے بھی معلوم ہوا کہ سورۂ محمد کی آیت جس میں فدیہ لینے کا جواز ہے، بعد کی ہے نہ بدر سے پہلے کی، جس کا دعویٰ صاحب تفہیم نے کیا ہے۔'' مؤلف''!

اوّل تو یہی ایک نیا انکشاف ہے کہ سورۂ محمد جنگِ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی، سب سے پہلے سال میں سورۂ بقرہ کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا، جس کو صاحبِ تفہیم بھی مانتے ہیں (تفہیم ۱/۴۹) پھر ۲ھ میں سورۂ انفال اُتری جنگِ بدر کے بعد (تفہیم ۱۱۸) پھر آلِ عمران اتری جس کا ابتدائی حصہ جنگِ بدر کے بعد قریبی زمانہ کا ہے (تفہیم ۱/۲۲۸) پھر احزاب اتری جس میں ۵ھ کے واقعات ہیں (تفہیم ۴/۵۴) اس کے بعد نزولی ترتیب کے لحاظ سے ۵ ممتحنہ کا ۶ نساء کا ۷ زلزال کا ۸ حدید کا اور ۹ سورۂ محمد کا ہے، لہذا سورۂ محمد کو انفال سے بھی مقدم کر دینا اور اس کو بنیاد بنا کر اپنی تفسیر کو جمہور اکابر مفسرین کے مقابلہ میں صحیح تفسیر قرار دینا کیا موزوں ہے؟!

اکابرِ امت حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرۃؓ، حضرت ابن مسعودؓ، اور دوسرے صحابہ و تابعین جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور دوسرے اکابرامت میں سے کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ سورۂ محمد میں فدیہ لینے کا جواز نازل ہو چکا ہے، پھر تو اشکال یہ ہوتا کہ عذاب آتا کیوں، نہ یہ کہ عذاب ٹلا کیوں؟ رہا یہ کہ صحابہ نے کوتاہی کی تھی اور اس کو حضرت سعد بن معاذ کی کراہت سے ثابت کیا گیا، اور بھی عجیب ہے۔

صحابہ کا بڑا گروہ غنیمت لوٹنے میں لگ گیا، اور بہت کم صحابہ نے دشمنوں کا کچھ دور تک تعاقب کیا، صحابہ پر بار بار لالچ کا غالب ہونا، غنیمت پر جھگڑنا، یہ سب بدرات ناروا جرامت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں جن کا ثبوت قطعی نہیں اور اسی لئے سلف میں سے کسی نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر کیا کیجئے علامہ مودودی کا قلم حضرات صحابہ کی بدرات کھوج کھوج کر نکالنے اور نمایاں کرنے میں چونکہ بہت تیز گام واقع ہوا ہے اس لئے احتیاط کا پہلو ملحوظ نہیں رہتا، دوسری بات یہ ہے کہ مفسرین نے ۶۔۷ توجیہات دوسری بھی ذکر کی ہیں جو اس توجیہ سے زیادہ قوی ہیں، ان کا علامہ ممدوح نے ذکر ہی ساقط کر دیا، پوری بات نقل کئے بغیر مفسرین پر نقد کر دینا مناسب نہیں تھا، ہمارے نزدیک دوسروں کی بات ادھوری نقل کر کے اپنی تحقیق کو نمایاں کرنا اور اپنے علمی تفوق اور بالاتری کا اظہار اہل علم اہل قلم کے شایانِ شان نہیں ہے ہمیں اعتراف ہے کہ تفہیم القرآن میں بہت سے مباحث کو عمدہ پیرایہ بیان میں اور دل نشین فصیح و بلیغ طرز میں سلجھا کر لکھا گیا ہے، جیسے مسئلہ ختم نبوت کو اور نزولِ مسیح علیہ السلام کی بحث بھی بہت مضبوط لکھی ہے۔

مگر جہاں طریق سلف و جمہورِ امت سے الگ ہو کر کوئی رائے قائم کر کے لکھا ہے، اس کی حضرت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے، اس لئے اس کو چھپایا نہیں جا سکتا، مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات رفعِ جسمانی کو غیر یقینی یا مشتبہ قرار دینا جبکہ اکابر سلف و خلف برابر اس کو ایک عقیدہ اور یقینی مسئلہ کی طرح صاف و صریح سمجھتے آئے ہیں بڑی سخت غلطی ہے قرآن مجید میں ہے **وما قتلوه يقينا بل رفعه الله اليه** (نساء آیت ۱۵۷) یقیناً انھوں نے (یعنی یہودیوں نے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھالیا' اس سے زیادہ صراحت اور وضاحت کیا ہو سکتی ہے؟ اور ساری امت نے ہمیشہ اس کا یہی مطلب سمجھا بھی، مگر صاحبِ تفہیم لکھتے ہیں:۔

''پس قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت اگر کوئی طرزِ عمل رکھتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ رفعِ جسمانی کی تصریح سے بھی اجتناب کیا جائے، اور موت کی تصریح سے بھی، بلکہ مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ایک غیر معمولی ظہور سمجھتے ہوئے اس کی کیفیت کو اُسی طرح مجمل چھوڑ دیا جائے، جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے مجمل چھوڑ دیا ہے''

یہاں الفاظ کے بے محل استعمال کو تو صرف اہل علم ہی محسوس کر سکیں گے، کہ مجمل کے مقابلہ میں مفصل کیا چیز تھی، اور قدرتِ قاہرہ کے ذکر سے اصل مسئلہ کو کیا فائدہ پہنچا، جہاں حق تعالیٰ نے یہود کے زعم باطل قتل کی نفی کر کے اپنی طرف اٹھا لینے کی واضح ترین لفظ رفع سے اور ماضی کے یقینی و واقعی معنی واضح کرنے والے صیغہ کے ساتھ تصریح کر دی ہو، پھر بھی اس تصریح سے اجتناب کا فیصلہ کیا جائے، یہ بات کس طرح معقول کہی جا سکتی ہے؟ رہی یہ بات کہ رفع کی کیفیت کیا تھی؟ تو اس کا یہاں سوال ہی کس نے کیا تھا؟ جو اس کے جواب اور قدرتِ قاہرہ پر محمول کرنے کی ضرورت پیش آئی، غرض بات بالکل صاف تھی، خود صاحبِ تفہیم بھی حیاتِ مسیح اور نزولِ مسیح دونوں کے قائل ہیں، لیکن

اس بارے میں ان کو شبہ ہے کہ وہی پہلی حیات اب تک باقی ہے یا درمیان میں موت طاری ہوئی ہے اس لئے وہ دوسری جگہ یہ بھی لکھ گئے:۔
قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ ان کو جسم وروح کے ساتھ کرۂ زمین سے اٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انھوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اٹھالی گئی، اس لئے قرآن کی بنیاد پر نہ تو ان میں کسی ایک پہلو کی قطعی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات (تفہیم ۴۲۰/۱)

ابھی ہم نے بتلایا کہ قرآن مجید نے صریح جملہ ارشاد فرمایا کہ یہود کا دعویٰ قتل غلطِ محض ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالیا، پھر بھی اوپر کی گومگو والی شبہ در شبہ کی بات کہی جارہی ہے فیاللعجب! پھر یہی صاحبِ تفہیم نزولِ مسیح علیہ السلام کی احادیث ذکر کرکے اس کو ثابت ومتیقن مانتے ہوئے بھی دوسری جگہ کہتے ہیں:۔

اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لا حاصل ہے کہ وہ وفات پاچکے ہیں یا کہیں موجود ہیں، بالفرض وہ وفات ہی پاچکے ہوں تو اللہ تعالیٰ انھیں زندہ کرکے اٹھالانے پر قادر ہے وگرنہ یہ بات بھی اللہ کی قدرت سے بالکل بعید نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات میں کہیں ہزار سال تک زندہ رکھے، اور جب چاہے دنیا میں واپس لے آئے۔ (تفہیم ۱۶۳)

یہاں پہنچ کر ہم اپنی قدیم گزارش کا پھر اعادہ کریں گے کہ اہلِ علم واہل قلم کو جمہور وسلف کے جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹنا چاہیے ورنہ بقول حضرت علامہ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ وہ نہ صرف امتِ مرحومہ کو غلط راستہ پر لگائیں گے، بلکہ خود بھی اس کے دنیوی واخروی نقصانات اٹھائیں گے، جیسا کہ حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ میں خود بھی اس غلط طریقہ پر چل کر نقصان اٹھا چکا ہوں: **واللّٰہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم!**

ایک اہم علمی حدیثی فائدہ

ترمذی شریف میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم علیہ السلام نے فرمایا حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور آپ سے کہا اپنے اصحاب کو اساریٰ بدر کے بارے میں اختیار دید یجئے کہ قتل کو اختیار کرلیں یا فدیہ لینے کو اس شرط پر کہ اگلے سال اِن (صحابہ) میں سے اتنے ہی کفار کے ہاتھوں قتل ہوں گے، صحابہ کرام نے فدیہ اپنے لوگوں کے اگلے سال قتل کئے جانے کی شرط کے ساتھ اختیار کرلیا یعنی پہلی بات بلا شرط تھی کہ اگر اساریٰ بدر کو قتل کرنے کا فیصلہ کرتے تو دشمن سے کوئی ضرر نہ پہنچتا، اور دوسری میں شرط تھی کہ فدیہ اختیار کریں گے تو اگلے سال ستر صحابہ قتل ہوں گے اس کے باوجود بھی اس دوسری صورت کو قبول کرلیا۔

اس موقع پر صاحب تحفۃ الاحوذیؒ [1] نے حدیثِ مذکور کی شرح وتحقیق علامہ ملاعلی قاری حنفیؒ کی مرقاۃ شرح مشکوٰۃ سے نقل کی ہے اگرچہ آخری حصّہ حذف کردیا ہے اور مطبوعہ حاشیہ مشکوٰۃ میں تو بہت ہی ناقص اور تھوڑا حصّہ نقل کیا گیا ہے، علامہ قاریؒ نے لکھا کہ صحابہ نے فدیہ کو اساریٰ بدر کے اسلام لانے کی رغبت وتوقع کے تحت اختیار کیا تھا اور ان کے ساتھ رحم وشفقت کا جذبہ بھی اس کا داعی تھا کیونکہ ان سے قرابت تھی اور اپنے لئے شہادت کا درجہ حاصل کرنا بھی مقصود تھا، لیکن علامہ تور بشتیؒ نے کہا کہ یہ حدیث نہایت ہی مشکل ہے کیونکہ ظاہر تنزیل کے اور اُن احادیث کے خلاف ہے جن سے صرف اتنا ثابت ہے کہ صحابہ نے اپنی اجتہادی رائے سے فدیہ کو اختیار کرلیا تھا، اور اس پر عتاب کیا گیا، لیکن اگر ان کو وحی کے ذریعہ اختیار دیا گیا تھا، تو عتاب کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لئے بظاہر اس حدیث کے بعض رواۃ کو اشتباہ ہوا ہے۔ الخ

علامہ طیبیؒ نے کہا کہ اس حدیث اور آیت میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ اختیار بطورِ امتحان دیا گیا تھا، جیسے ازواجِ مطہرات کو دیا گیا

---

[1] یہ امر قابل ذکر ہے کہ علامہ مبارک پوری نے اپنی شرح ترمذی میں مرقاۃ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے اور اس دور میں ہم سے زیادہ ان حضرات نے ایک شارحِ حدیث حنفی کی قدر پہچانی ہے دوسرے یہ کہ موجودہ مطبوعہ حاشیہ مشکوٰۃ شریف میں بہت سے اہم اور مفید اجزاء نقل ہونے سے رہ گئے ہیں اس لئے ہمارے مشتغلین حدیث اصحابِ درس وتصنیف کو فتح الباری وعمدۃ القاری، نووی وغیرہ کے ساتھ مرقاۃ کو بھی ضرور مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔ ''مؤلف''

تھا کہ حضور علیہ السلام کی رفاقت کو اختیار کرلیں یا دنیا کے عیش و بہار کو، یا جس طرح تعلیم سحر بطور امتحان تھی، وغیرہ!

علامہ قاریؒ نے فرمایا کہ یہ جواب غیر مقبول ہے کیونکہ ازواج کو بھی تخییر کے بعد عذاب نہ ہوتا، صرف حضور علیہ السلام کی مصاحبت مقدسہ ومبارکہ سے محروم ہو جاتیں اور تعلیم سحر والی صورت ابتلاء و امتحان تو ضرور تھی مگر تخییر نہ تھی جس طرح قول باری تعالیٰ :۔ فمن[1] شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر (کہف) میں امر تہدید ہے تخییر نہیں ہے، دوسرے یہ کہ صحابہ کرام نے جو فدیہ کی صورت اختیار کی تھی وہ مال کی محبت[2] وایثار کے سبب ہرگز نہ تھی بلکہ اس مال کے ذریعہ سے بھی کفار پر غلبہ حاصل کرنا مقصود تھا اور اس کے ساتھ رحمی شفقت اور ان کے یا ان کی اولاد کے ایمان لانے کی امید و رغبت تھی، پھر یہ ان کا ایک اجتہاد تھا، اور وہ بھی اس درجہ کا کہ حضور علیہ السلام کی رائے نے بھی اس کی موافقت کی تھی، اس لئے اس کو وجہ عتاب بنانا درست نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد حق تعالیٰ کے نزدیک دوسرے صحابہ کے اجتہاد کے مقابلہ میں زیادہ صواب تھا، اور اسی لئے آیت مذکور کی وحی حضرت عمرؓ کی موافقات میں سے قرار پائی، چنانچہ خود طیبیؒ نے بھی مسلم ترمذی کی حدیث[3] بواسطہ حضرت ابن عباسؓ حضرت عمرؓ سے نقل کی ہے کہ صحابہ نے بدر کے دن کفار کو قید کرلیا، تو رسول اکرم علیہ السلام نے ابوبکر وعمر سے فرمایا تمہاری ان قیدیوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا یا رسول اللہ! یہ سب چچا تاؤں کی اولاد اور اپنے قبیلہ کے لوگ ہیں اگر آپ ان سے فدیہ لے لیں گے تو ہمیں کفار کے مقابلہ میں اس سے قوت ملے گی، پھر یہ بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام کی ہدایت دیدے، حضور علیہ السلام نے فرمایا ابن الخطاب! تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! میری وہ رائے نہیں ہے جو ابوبکر کی ہے، بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان سب کو ہمارے سپرد کردیں اور ہم ان کو قتل کردیں کیونکہ یہ سب کفر کے امام و سردار ہیں، پھر حضور علیہ

---

[1] اس موقع پر آیت میں من شاء فلیؤ من تحفہ ۲/۳۸۵ میں اور مرقاۃ ۴/۲۵۲ میں بھی غلط چھپ گیا ہے صحیح فمن شاء فلیؤ من ہے اور تحفہ میں ویصاعدنا ما ذکرہ الطیبی غلط چھپا ہے، مرقاۃ میں ویباعدنا صحیح ہے۔

[2] تفہیم القرآن میں جو صحابہ کرام پر اس سلسلہ میں مال غنیمت وفدیہ کے لالچ کا نقد بہت نمایاں کر کے لکھا ہے وہ قابل گرفت ہے "مؤلف"!

[3] دوسری مفصل روایت بیہقی وغیرہ میں اس طرح ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ ان قیدیوں کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے قبضہ میں دیدیا ہے، اور وہ تو تمہارے بھائی ہی ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا یا رسول اللہ! یہ آپ کے کنبہ ہی کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے مقابلہ میں فتح ونصرت دی، یہ چچوں، تایوں کی اولاد اور اپنے بھائی ہیں، ان کو باقی رہنے دیجئے اور میری رائے ہے کہ ان سے فدیہ لے لیں، تاکہ اس مال سے کفار کے مقابلہ میں قوت حاصل ہو، اور ممکن ہے خدا ان کو ہدایت دے دے تو وہ ہمارے مددگار بن جائیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ ابن الخطاب تم کیا کہتے ہو؟ آپ نے کہا یا رسول اللہ! ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا، وطن سے نکالا آپ سے لڑائیاں لڑیں، اس لئے میری رائے وہ نہیں ہے جو ابوبکر کی ہے بلکہ یہ ہے کہ آپ مجھے میرا فلاں قریبی رشتہ دار دیں، میں اس کی گردن ماردوں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات آجائے کہ ہمارے دلوں میں مشرکوں کی کوئی محبت نہیں ہے، پھر یہ قریش کے سربراہ سردار، مقتدا اور مطاع ہیں، ان کو تو آپ ختم ہی کردیں تو اچھا ہے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا یا رسول اللہ! ایسی وادی دیکھئے جس میں لکڑی ایندھن بہت ہو اور اس میں آگ لگا کر ان سب کا خاتمہ کردیں حضرت عباسؓ نے ان سے کہا کہ تم نے تو قرابت ورحم کی جڑ ہی کاٹ دی، حضور علیہ السلام یہ سب سن کر گھر میں تشریف لے گئے، اور باہر کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کی، اور کچھ نے حضرت عمرؓ کی اور کچھ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی رائے کو اختیار کیا (تین حصوں میں بٹ گئے) پھر حضور علیہ السلام نے باہر تشریف لاکر سب کی آراء پر تبصرہ کیا اور فیصلہ کیا کہ ہر ایک قیدی سے بلا کسی استثناء کے فدیہ لے لیا جائے، اگلے روز عذاب سے ڈرانے والی آیت اتری تو آپ نے فرمایا کہ اگر عذاب آجاتا تو ابن الخطاب کے سوا کوئی نہ بچتا (تفسیر مظہری ۴/۱۱۲ وابن کثیر ۲/۳۲۵) روح المعانی ۱۰/۳۵ میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ آسمان سے عذاب اترتا تو عمر وسعد بن معاذ کے سوا کوئی نہ بچتا، کیونکہ انھوں نے بھی کہا تھا کہ ان لوگوں کو قتل کردینا ہی میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے۔

اوپر کی روایت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کے تین گروہ ہو گئے تھے اور صرف ایک گروہ فدیہ کی رائے والا تھا، اور اس میں سے بھی صرف مال برائے مال کی نوبت والے تو چند ہی ہوں گے، تاہم وہ خاص طور سے عتاب کے مستحق قرار دیئے گئے اور بہت بڑی تعداد اس گروہ میں بھی ان کی تھی جنھوں نے مال کو بھی کفار پر قوت وغلبہ حاصل کرنے کے لئے چاہا تھا، جیسے حضرت ابوبکرؓ، حضور علیہ السلام کے ارشاد مذکور سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اخذ فدیہ کی رائے والوں کے علاوہ سب ہی عذاب سے بچنے والوں میں سے ہوتے، لہٰذا وہ دو گروہ تھے اور بڑی اکثریت تھی، اس لئے علاوہ اس سبب قوی کے کہ حضور علیہ السلام کی موجودگی میں عذاب نہیں آتا، خود صحابہ کی اکثریت بھی عذاب کو ٹالنے کا بڑا سبب بنی ہوگی، قال تعالیٰ وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون واللہ تعالیٰ اعلم! "مؤلف"

السلام نے بھی اُسی رائے کو پسند کر لیا جو ابوبکر کی تھی اور میری رائے کو قبول نہ کیا، پھر اگلے دن میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور علیہ السلام اور ابوبکر دونوں ایک جگہ بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں، میں نے عرض کیا یارسول اللہ! مجھے بتائیں کہ آپ دونوں کیوں رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تمہارے اصحاب و رفقاء کو فدیہ لینے کے سبب سے جو خمیازہ بھگتنا پڑتا، اس کا تصور کر کے رو رہا ہوں، جو عذاب ان سب پر خدا کی طرف سے اترنے والا تھا، وہ مجھے اس سامنے والے قریب کے درخت سے بھی زیادہ نزدیک دکھایا گیا ہے، پھر یہ آیت اتری **لولا کتاب من اللہ سبق آلایہ!**

حضرت علامہ قاریؒ نے آخر میں اپنی رائے لکھی کہ آیتِ مذکورہ اور حدیثِ ترمذی مذکور میں جمع کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے اختیارِ فدیہ کی بات بالاطلاق یعنی بغیر کسی شرط وقید کے پیش کی گئی ہو اور اس کے بعد بالتقیید پیش کی گئی کہ قتل کی صورت میں تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا، اور فدیہ اختیار کرو گے تو اگلے سال اتنے ہی صحابہ کو کفار کے ہاتھوں سے مقتول ہونا ہوگا واللہ اعلم (مرقاۃ ۲۵۲/۴ و تحفہ ۳۸۶/۳) مرقاۃ میں یہاں علامہ قاضی بیضاویؒ کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھی اجتہاد کرتے ہیں اور ان کے اجتہاد میں غلطی بھی ہو سکتی ہے مگر ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے اور غلطی پر باقی نہیں رہنے دیا جاتا، آگے قاضی بیضاوی سے بھی کتاب من اللہ کی وہی توجیہات نقل کی ہیں جو دوسرے مفسرین نے بھی لکھی ہیں اور ہم نے پہلے ذکر کر دی ہیں، صاحبِ تحفہ نے قاضی کا یہ قول نقل نہیں کیا اور اس کو درمیان سے حذف کر دیا ہے، شاید یہ جوازِ اجتہاد کے لئے ایسا کھلا ہوا ثبوت پسند نہ آیا ہو، کیونکہ اس سے اجتہادِ ائمہ، مجتہدین، اور آگے بڑھ کر تقلید کے دروازے کھلتے ہیں بقول شاعر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

ہمارے نزدیک علامہ قاریؒ کا جوابِ مذکور (تقیید والا) نہایت اہم ہے اور غالباً اسی لئے صاحبِ تحفہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے، سب جانتے ہیں کہ غزوۂ احد میں جو کچھ پیش آیا وہ اِسی مذکورہ غزوۂ بدر والی غلطی کا نتیجہ تھا، غزوۂ بدر جیسے عظیم الشان معرکہ میں صحابہ صرف ۱۳-۱۴ شہید ہوئے تھے، اور کفار و مشرکین کے بڑے بڑے جغادری ستر قتل اور ستر قیدی ہوئے اور باقی کفار ہزیمت کھا کر بہ کثرت مالِ غنیمت چھوڑ کر بد حواس ہو کر میدان سے بھاگ گئے تھے۔

حضور اکرم ﷺ کو کسی قسم کی معمولی پریشانی بھی کفار کی وجہ سے پیش نہ آئی تھی، اس کے برخلاف اگلے سال غزوۂ احد میں کفار کا جانی و مالی نقصان نسبتہً بہت کم ہوا، اکابر صحابہ ستر شہید ہو گئے، جن میں حضرت سیدنا حمزہؓ اور ابن نضر ایسے جلیل القدر اور بے نظیر شجاعت والے بھی بہ کثرت تھے، دوسری سیاسی غلطی خود بعض مسلمانوں کی طرف سے میدان جہاد کے اندر ہوئی، جس کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے مجاہدین اسلام میں انتشار کی کیفیت رونما ہو گئی اور اسی ہنگامہ میں حضور اکرم ﷺ کو بھی نرغہ میں لے لیا گیا، جس سے چہرۂ مبارک زخمی ہوا، دندان مبارک شہید ہوئے، تاہم صحابہ کرام نے پھر سے جمع ہو کر کفار کا پورا دفاع کیا اور ان کو مجبور کر دیا کہ وہ پسپا ہو کر مکہ معظمہ واپس ہوں، چونکہ یہ سارا جہاد دفاعی تھا، اور کفار مسلمانوں کو ختم کرنے اور مدینہ منورہ کو تاراج کرنے کے عزم وارادہ سے چڑھ کر آئے تھے، اس لئے ان کا ناکام و نامراد ہو کر پسپا ہونا ہی اہل اسلام کی بہت بڑی کامیابی تھی اور مسلمانوں کا حوصلہ اتنا بلند تھا کہ ان کے جانے کے بعد اگلے ہی دن حضور اکرم ﷺ کی قیادت میں ستر[1] صحابہ کرامؓ نے ان کا تعاقب کیا اور مدینہ منورہ سے ۸ میل دور حمراء الاسد تک گئے۔

[1] بخاری ۵۸۴ "باب الذین استجابو اللہ والرسول" میں ہے کہ جب مشرکین احد سے واپس ہو گئے تو حضور علیہ السلام کو ڈر ہوا کہ کہیں لوٹ کر نہ آئیں، تو آپ نے فرمایا کہ ان کا تعاقب کون کون کرے گا؟ اس پر ستر صحابہ کرام تیار ہو گئے، جن میں حضرت ابوبکرؓ و زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے" عمدۃ القاری ۲۶۱/۲ اور فتح الباری ۲۶۲/۲ اور قسطلانیؒ شرح بخاری میں بھی، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، عبدالرحمان بن عوفؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت ابوعبیدۃ بن الجراحؓ کے نام بھی ان ستر ۷۰ صحابہ میں نقل کئے گئے ہیں" مؤلف"

ابوسفیان سپہ سالار لشکرِ قریش نے دیکھا کہ حضرت علیہ السلام اور آپ کے صحابہ اب بھی تعاقب کر رہے ہیں تو اس نے اپنا ارادہ لوٹ کر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا ختم کر کے سیدھا مکہ معظمہ کا رُخ کر لیا۔

کیا جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی

تفہیم القرآن کی بعض عبارتوں سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو درمیانِ جنگ کی عارضی ووقتی شکست نہیں بلکہ مستقل اور آخر وقت تک کی شکست ہوئی تھی حالانکہ ایسا نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بھی ذکر کیا کہ کفار قریش مسلمانوں سے چار پانچ گنی طاقت کے ساتھ آکر حملہ آور ہوئے تھے اور شروع میں بھی ان کو شکست ہوئی اور آخر میں بھی ناکام ونامراد ہو کر واپس ہو گئے، صرف درمیان میں ان کو وقتی وعارضی کامیابی ہوئی تھی، اور مسلمان منتشر ہو گئے تھے، اس کے بعد فوراً ہی حضرت سیّدنا حمزہؓ کی پکار پر وہ سب منتشر مسلمان بھی رُک گئے تھے اور پلٹ کر جنگ میں مشغول ہو گئے، اور مسلمانوں کی لغزش معاف کردی گئی تھی جیسا کہ چوتھے پارہ کے دوسرے ربع کی آیات میں مذکور ہے حضرت علامہ عثمانیؒ نے لکھا:۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے تم کو (احد میں) ہزیمت ہوئی تو "بدر" میں اُن (کفار) کو تباہ کن ہزیمت مل چکی ہے اور احد میں بھی جب تم جم کر لڑے تو وہ منہزم (یعنی شکست خوردہ) ہوئے، پھر آخر میں میدان چھوڑ کر چلے گئے، ایسی صورت میں انصافاً تم کو اپنی تکلیف کا شکوہ کرنے اور زیادہ بددل ہونے کا موقع نہیں اگر غور کرو گے تو تم خود ہی مصیبت کا سبب بنے ہو، تم نے جوش میں آکر پیغمبر علیہ السلام کی اور بہت سے تجربہ کاروں کی رائے قبول نہ کی، اپنی پسند اور اختیار سے مدینہ کے باہر محاذِ جنگ قائم کیا، پھر باوجود شدید ممانعت کے تیراندازوں نے اہم مورچہ چھوڑ کر مرکز خالی کر دیا، اور ایک سال پہلے جب اسارٰی بدر کے متعلق تم کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ یا انھیں قتل کر دو، یا فدیہ لے کر چھوڑ دو اس شرط پر کہ آئندہ اتنے ہی آدمی تم سے لئے جائیں گے، تو تم نے فدیہ کی صورت اختیار کی اور شرط کو قبول کر لیا، اور اب وہ ہی شرط پوری کرائی گئی تو تعجب وانکار کا کیا موقع ہے، یہ چیز تو خود ہی اپنی طرف سے تم قبول کر چکے تھے، (۹۳)

تفہیم القرآن ۳۰/۲۳۰ میں لکھا ہے:۔ (۴) جنگِ احد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اس میں اگرچہ منافقوں کی تدبیروں کا ایک بڑا حصہ تھا لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصہ بھی کچھ کم نہ تھا، الخ!

تفہیم القرآن ۴/۵۰۴ میں لکھا:۔ جنگِ احد (شوال ۳ھ) میں نبی کریم علیہ السلام کے مقرر کئے ہوئے تیراندازوں کی غلطی سے لشکرِ اسلام کو جو شکست نصیب ہو گئی تھی، اس کی وجہ سے مشرکین عرب، یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں الخ، پھر آگے لکھا:۔ اس طرح جنگِ احد کی شکست سے جو ہوا اکھڑی تھی، وہ مسلسل سات آٹھ مہینے تک اپنا رنگ دکھاتی رہی۔

پھر ۵۵ میں لکھا:۔ حضور علیہ السلام نے اسلام کے فدائیوں کو پکار کر کفار کے تعاقب میں چلنا ہے تاکہ وہ کہیں راستہ سے پلٹ کر پھر مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائیں، حضور علیہ السلام کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا کہ کفار قریش ہاتھ آئی فتح کا کوئی فائدہ اٹھائے بغیر واپس چلے گئے ہیں لیکن راستے میں جب کسی جگہ ٹھیریں گے تو اپنی حماقت پر نادم ہوں گے اور دوبارہ مدینہ پر چڑھ آئیں گے، اس بنا پر آپ نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور فوراً جانثار آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئے اور یہ لوگ فی الواقع اپنی غلطی کو محسوس کر کے پھر پلٹ آنا چاہتے تھے، لیکن یہ سُن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی کہ رسول اللہ علیہ السلام ایک لشکر لئے ہوئے ان کے تعاقب میں چلے آرہے ہیں، اس کاروائی کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ قریش کے بڑھے ہوئے حوصلے پست ہو گئے بلکہ گردوپیش کے دشمنوں کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اولوالعزم ہستی کر رہی ہے اور مسلمان اس کے اشارہ پر کٹ مرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔"

تفہیم القرآن ۴/۳۰۷ میں یہ بھی ہے:۔ احد سے پلٹتے ہوئے ابوسفیان مسلمانوں کو چیلنج دے گیا تھا کہ آئندہ سال بدر میں تمہارا ہمارا

پھر مقابلہ ہوگا، مگر جب وعدہ کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمت نے جواب دیدیا ستر فدا کار حضور علیہ السلام کے ساتھ چلنے کے لئے کھڑے ہوگئے اور آپ ان ہی کو لے کر بدر تشریف لے گئے، اوپر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیت لے کر چلا، مگر دو روز کی مسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آئندہ سال آئیں گے، چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی واپس ہوگئے، آں حضرت علیہ آٹھ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے اور اس دوران میں آپ کے ساتھیوں نے ایک تجارتی قافلہ سے کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اٹھایا، پھر جب یہ خبر معلوم ہوگئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

کھلا تضاد! کہیں لکھا کہ احد کی شکست کی وجہ سے مشرکین عرب، یہود و منافقین سب ہی کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں کہیں ہے کہ احد کی شکست سے جو ہوا اکھڑی تھی وہ مسلسل سات آٹھ ماہ تک اپنا رنگ دکھاتی رہی، اور کہیں یہ ہے کہ غزوۂ احد کے اگلے ہی روز آپ نے تعاقب کیا تو وہ مقابلہ پر نہ جم سکے اور مکہ معظمہ کو بھاگ گئے، اور اگلے سال بدر کے چیلنج شدہ مقام کے لئے کفارِ قریش کے دو ہزار کے لشکرِ جرار کو بھی ستر مسلمانوں کے مقابلہ پر آنے کی ہمت نہ ہوسکی اور مسلمانوں نے آٹھ روز تک ان کا انتظار کیا۔

یہ سب تضاد بیانی اس فاسد نظریہ کے تحت ہوئی کہ جنگِ احد میں مسلمانوں کو مستقل طور سے شکست خوردہ اور کفار کو فاتح سمجھ لیا گیا، ورنہ حقائق و واقعات کی روشنی میں کوئی بھی الجھن پیش نہیں آسکتی، یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں نے چند سیاسی غلطیاں کیں اور ان کا خمیازہ اسی دنیا میں بھگتنا پڑا، اور سید الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والتحیات کی موجودگی بھی اس سے روک نہ بنے تا کہ آئندہ ایسی سیاسی غلطیاں ہرگز نہ کریں لیکن وہ ابتلاء اور مصیبت محض وقتی و عارضی تھی اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان صحابہ کرام پر ''نعاس'' والی خاص تجلی بھیج کر پھر سے تازہ دم کردیا، اور پھر جو وہ یکجا ہو کر کفار پر پلٹے تو کفار کی ہمت و حوصلہ پوری شکست سے دوچار ہو چکا تھا وہ پسپا ہو کر لوٹ گئے اور اگلے سال کے لئے چیلنج کرتے گئے، خیال کیجئے! فاتح کو کیا ضرورت تھی کہ اگلے سال کی بات کرے، اور لگے ہاتھوں مفتوح اور شکست خوردہ تھوڑے نفوس کا قلع قمع کر کے اور مدینہ کو بھی تاخت و تاراج کر کے نہ جائے۔

واقعات تو کچھ ایسا رُخ بتلاتے ہیں کہ ابوسفیان اور اس کے ہزاروں ساتھی اپنی آئندہ فتح و کامرانی سے احد کے موقع پر ہی قطعاً مایوس ہوچکے تھے، اسی لئے ۵ھ میں غزوۂ احزاب کے موقع پر وہ دس ہزار لشکر کے ساتھ آکر بھی ناکام و نامراد ہی واپس ہوئے اور احد کے موقع پر بھی حضور اکرم علیہ اور آپ کے جان نثار صحابہ کا شکست کھا جانا کیا ایسا ہی ہنسی کھیل تھا، کہ ہم نے ذرا سا قلم ہلا دیا اور جو چاہا لکھدیا، اگر خدانخواستہ وہ عارضی شکست کچھ زیادہ طول پکڑتی تو مدینہ طیبہ کا ایک ایک مرد اور عورت، بوڑھا اور جوان، بچہ اور بڑا نفیر عام کے تحت میدانِ کارزار میں پہنچ کر آخری دم تک کفار کا مقابلہ کرتا، اور کسی طرح ہزیمت خوردہ ہونا گوارہ نہ کرتا، اور کیا حضور اکرم علیہ کی موجودگی میں بہترین افرادِ امت صحابہ کرام کو حق تعالیٰ یوں ہی بلا نصرت و حمایت کفار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا، اور فرشتوں کی مدد بھی نہ آتی، جبکہ آج تک بھی ہر نازک موقع پر خدا کی نصرت اور فرشتوں کی مدد برابر آتی ہے، غرض غزوۂ احد میں مسلمانوں کی شکست بتلانا ایسا ہی ہے جیسے آج بھی کوئی بڑی دشمن طاقت پورے لاؤ لشکر کے ساتھ کسی چھوٹی سی طاقت والے چھوٹے ملک پر حملہ آور ہوجائے اس کو تاخت و تاراج کر کے اپنا محکوم بنانا چاہے، اور وہ کم طاقت والی قوم اپنے نہایت بہادرانہ اور بے نظیر دفاع کے ذریعہ اُس بڑی قوم کو ناکام و نامراد لوٹا دے تو کہہ دیا جائے کہ اُس چھوٹی قوم نے شکست کھالی ہے۔

سیرۃ النبی کا بیان! یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سیرۃ النبی ۱/۳۳۱ میں جو روایتِ ترمذی کی طرف یہ بات منسوب کردی گئی کہ عتاب مالِ غنیمت کے سلسلہ میں آیا تھا، کیونکہ وہ پہلے سے جائز و حلال نہیں تھا، غلط ہے ہم نے اوپر حدیثِ ترمذی نقل کردی ہے جس میں فدیہ لینے پر عتاب کا ذکر ہے، اور مال غنیمت تو پہلے سے حلال تھا، اور مما غنمتم سے مراد بھی فدیہ کا مال یا اس کو شامل اموالِ غنیمت ہیں جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

منافقین کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنا

بخاری شریف ۱۸۲ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ جب عبداللہ بن اُبی (سردار منافقین) مرا تو حضور علیہ السلام کو اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے بلوایا گیا، آپ نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تو میں جلدی سے آپ کے قریب گیا اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ ابن اُبی پر نماز پڑھائیں گے؟ اس نے تو ایسا ایسا کیا تھا، میں نے ایک ایک بات یاد دلائی، آپ سن کر مسکراتے رہے، پھر فرمایا عمر! ہٹ جاؤ، لیکن جب میں برابر آپ کو روکتا رہا تو فرمایا مجھے اختیار دیدیا گیا ہے، اس لئے میں نے اس کو اختیار کرلیا، حق تعالیٰ نے یہی تو فرمایا کہ منافقوں کے لئے اگر ستر بار بھی مغفرت چاہو گے تو وہ ان کی مغفرت نہ کریں گے، لیکن اگر مجھے امید ہو کہ ستر بار سے زیادہ تعداد میں مغفرت چاہنے سے وہ بخش دیئے جائیں گے تو میں اس سے بھی زیادہ کروں گا، حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ آپ نے میری التجاء قبول نہ کی اور اس کی نماز پڑھادی، پھر لوٹ کر آئے ہی تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں سورۂ براءۃ کی یہ آیتیں نازل ہوگئیں **ولا تصل علی احدمنھم مات ابدا تاوھم فاسقون** (منافقین میں سے کوئی مرجائے تو آپ کبھی ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ ان میں سے کسی کی قبر پر کھڑے ہوں، یہ تو خدا اور رسولِ خدا کے منکر ہیں، اور اسی فسق کی حالت پر مرے ہیں)

منافقین کے تمسخر واستہزاء پر نکیر

ازالۃ الخفاء ۱۵ /۴ میں ''موافقاتِ حضرت عمرؓ '' سے نقل کیا کہ ایک شخص نے حضرت ابوالدرداءؓ سے کہا اے گروہ قراء تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم سے سوال کیا جاتا ہے تو ہم سے بھی زیادہ جبانت وبخل سے کام لیتے ہو، اور جب کھانے بیٹھتے ہو تو بڑے بڑے لقمے اڑاتے ہو، آپ سن کر خاموش ہوگئے، حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ اس شخص کے پاس گئے، اور اس کی گردن پکڑ کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں لے گئے، آپ نے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ میں نے یوں ہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی، تو اس واقعہ پر یہ آیت اتری:۔ **ولئن سالتھم لیقولن انما کنا نخوض ونلعب** (سورۂ توبہ) آپ ان سے باز پرس کریں گے تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض دل لگی اور تفریح کی بات کررہے تھے۔

بیان مدارج خلقت انسانی پر حضرت عمرؓ کا تاثر

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سورۂ مومنون کی آیات **ولقد خلقنا الانسان تاخلقا آخر** نازل ہوئیں اور ان میں حق تعالیٰ نے تخلیقِ انسان کی کیفیت ونوعیت تفصیل سے بیان کی تو حضرت عمرؓ فوراً ہی بول اُٹھے **فتبارک اللہ احسن الخالقین** ''(وہ ذاتِ خداوندی بہت ہی مقدس وبابرکت ہے جو چیزوں کو عالم خلق ووجود میں لانے کے لئے سب سے اعلیٰ وبرتر درجہ رکھتی ہے) اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عمرؓ! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ان آیتوں کو حق تعالیٰ نے بھی اسی فقرہ پر ختم کیا ہے جو تم نے ابھی کیا، (ازالۃ الخفاء ۳۲۵) ایک روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عمرؓ! کتاب اللہ میں زیادتی کرتے ہو؟! تو حضرت جبریل علیہ السلام اترے اور کہا یہ تمام آیت ہے (ازالۃ ۳۲۳)

اعداء جبرئیل علیہ السلام پر نکیر

یہود نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ جبرئیل فرشتہ آپ کے صاحب (نبی علیہ السلام) کے پاس وحی لاتا ہے اور وہ ہمارا دشمن ہے اس سے ہمارے پہلے بڑوں کو بہت تکلیفیں پہنچی ہیں، اور اگر جبرئیل کے علاوہ کوئی فرشتہ وحی لاتا تو ہم محمد ﷺ پر ایمان لے آتے، اس پر حضرت عمرؓ نے

لہ تفہیم القرآن ۲۳۴/۲ میں ہے:۔ آخر جب آپ نماز پڑھانے کھڑے ہی ہوگئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور براہ راست حکم خداوندی سے آپ کو روک دیا گیا، اس عبارت سے کوئی خیال کرسکتا ہے کہ عین نماز پڑھانے کے وقت آیت اتری ہو اور آپ کو نماز پڑھانے سے روکا گیا ہو، جس سے آگے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ آپ اس وقت نماز پڑھانے سے رُک گئے ہوں گے، حالانکہ ہم نے بخاری کی حدیث نقل کردی ہے جس میں نماز پڑھانے کی تصریح ہے اور یہ بھی کہ نماز کے بعد لوٹے تو یہ آیتیں اتریں، جن سے آئندہ کے لئے ممانعت کی گئی ہے۔ ''مؤلف''!

کہا من کان عدو اللہ وملائکتہ ورسلہ وجبرئیل ومیکائیل فان اللہ عدو للکافرین (یعنی اگر جبرئیل علیہ السلام سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے تو آپ ان سے کہہ دیں کہ جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اور جبرئیل ومیکائیل میں سے کسی کا بھی دشمن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اِن کافروں کا دشمن ہے راوی نے کہا کہ پھر سورۂ بقرہ کی آیت ۹۸ بعینہٖ ان ہی الفاظ سے اتری جو حضرت عمرؓ کی زبان سے ادا ہوئے تھے (تفسیر ابن کثیر ۱۳۲/۱ - وازالۃ الخفاء ۷۰ یے ۲)

واقعہ افک میں حضرت عمرؓ کا ارشاد! محقق عینیؒ نے موافقاتِ عمری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ان ہی میں سے یہ بھی ہے کہ حضرتِ عائشہؓ کے بارے میں جب بہتان باندھنے والوں نے غلط باتیں پھیلائیں، تو آپ نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کا حضرت عائشہؓ سے نکاح کس نے کیا تھا؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، آپ نے کہا تو کیا آپ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ آپ کے رب نے آپ کے ساتھ تدلیس کی؟! (یعنی ایسی عورت نکاح میں دے دی جو آگے چل کر کسی غلطی روی کا شکار ہو سکتی تھی) "سبحانک هذا بهتان عظیم" (اے خدائے برتر آپ کی ذات ہر برائی سے منزہ ومقدس ہے یہ بات یقیناً بہتان عظیم ہے) اس پر حق تعالیٰ نے بھی یہی آیت نازل فرمائی ذکرنه المحب الطبری فی احکامه۔ (عمدہ ۳/۱۹)

اِس واقعہ کے سلسلے میں حافظ ابن کثیر اور علامہ آلوسیؒ نے عمدہ روایات وابحاث نقل کی ہیں، ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ۱/۲۷۲ وبعدہٗ اور روح المعانی ۲۰/۱۴۰ وبعدہ ان کو دیکھنے کے بعد حضرت عمرؓ کے ارشادِ مذکور کی اہمیت واضح ہوگی۔

تحریم کے لئے بار بار وضاحت طلب کرنا

امام احمدؒ راوی ہیں کہ جب شراب کی حرمت کا ابتدائی حکم آیا تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا:۔ یا اللہ شراب کے بارے میں واضح بیان ارشاد ہو، تو اس پر سورۂ بقرہ کی آیت (۲۱۹) یسئلو نک عن الخمر و المیسر قل فیهما اثم کبیر" **اتمری** - حضرت عمرؓ کو بلا کر آیتِ مذکور سُنائی گئی تو آپ نے پھر عرض کیا سے بارِ خدایا! شراب کے بارے میں وضاحت فرمایئے! اس پر سورۂ نساء کی آیت (۴۳) لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری اتری، یہ بھی حضرت عمرؓ کو بلوا کر سُنائی گئی، اور آپ نے پھر عرض کیا یا اللہ! شراب سے متعلق کافی وشافی بیان ووضاحت عطا کیجئے! تو اس پر سورۂ مائدہ کی آیت (۹۰) انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان اتری (یعنی شراب، جوا، بتوں[1] کے تھان اور فال

---

[1] انصاب وازلام کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ نے بت اور پانسے، حضرت تھانویؒ نے بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ نے بتوں کے تھان اور فال کھولنے کے تیر کیا، ترجمان القرآن میں معبودانِ باطل کے نشان اور پانسے اور تفہیم القرآن میں آستانے اور پانسے ترجمہ کیا گیا، اور تفہیم ۱/۱۴۴ میں آستانہ اور استھان کو ہم معنی کہا گیا، ہمیں اس میں تامل ہے کیونکہ آستانوں اور درگاہوں کا اطلاق عموماً مسلمانوں میں بزرگانِ دین کے مزارات وخانقاہوں کے لئے ہوتا ہے جہاں صحیح وغلط دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں اور استھانوں کا اطلاق صرف معبودانِ باطل کے مراکز ومقامات پر ہوتا ہے جہاں صرف رسوم شرک وکفر ہی ادا کی جاتی ہے اور وہی یہاں آیت میں مراد بھی ہیں، جو اسلامی نقطہ نظر سے باطل رسوم کے اڈے ہیں، باقی رہے بزرگانِ دین کے مزارات یا خانقاہیں، وہاں سب کے اعمال یا سب اعمال کو ممنوع نہیں کہا جا سکتا، اس لئے وہ اس آیت کے اطلاق سے خارج ہیں۔ ہاں! رسوم شرک وبدعت جہاں اور جس جگہ بھی ادا ہوں گی، ان کا خلاف شرع ہونا دوسرے دلائلِ شرعیہ کے تحت یقیناً ثابت ہے اس سے انکار ہرگز نہیں کیا جا سکتا اور غیر اللہ کے نام پر ذبح بھی سب حرام ہوں گے، لہٰذا سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں وماذبح علی النصب کا ترجمہ بھی اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو، حد سے تجاوز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بزرگوں کے آستانوں پر حلال ومشروع ذبیحہ بھی ہوتا ہے اور وہ معبودانِ باطل کے استھانوں کی طرح بتوں کے نام پر ذبح کرنے کے مخصوص مقامات نہیں ہیں لہذا بہتر اور محتاط ترجمہ اس طرح ہے:۔ اور حرام ہے جو ذبیحہ ہوا کسی تھان پر (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ) اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبیحہ کیا جائے (حضرت تھانویؒ) اور وہ جانور بھی جو بتوں کے کسی تھان پر ذبیحہ کیا گیا ہو (کشف الرحمان مولانا احمد سعیدؒ صاحب) اور وہ جانور جو کسی تھان پر چڑھا کر ذبیحہ کیا جائے (یعنی ان مقاموں میں ذبح کیا جائے جو بت پرستوں نے نذر ونیاز چڑھانے کے لئے ٹھہرا رکھے ہیں) ترجمان القرآن گویا مولانا آزاد بھی باوجود اہل حدیث ہونے کے اتنا آگے نہیں گئے، جتنا علامہ مودودی بڑھ گئے ہیں، نیز معلوم ہوا کہ تھان یا استھان مخصوص اصطلاح ہے اور اس کو آستانہ کا ہم معنی قرار دینا صحیح نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم "مؤلف"!

کھونے کے تیر سب ناپاک، شیطان کے کام ہیں، ان سے بچتے رہو تا کہ تم نجات وفلاح پاؤ)

اس آیت مائدہ کے آخر میں ہے فهل انتم منتهون ؟ (سو اب بھی تم باز آؤ گے؟) حضرت عمرؓ نے اسکوسن کر کہا انتهينا انتهينا (ہم باز آگئے اور ان سب برائیوں سے رُک گئے) اسی طرح ابوداؤد، ترمذی ونسائی وغیرہ میں بھی ہے۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں حضرت عمرؓ کا انتهينا کے بعد یہ قول بھی مروی ہے کہ ہم رُک گئے اور جان گئے کہ شراب جوا وغیرہ مال اور عقل کو کھونے والے ہیں (ابن کثیر ۲۵۵/۱- ازالۃ الخفاء ۱/۳۹۲) آج کل شراب ودوسری نشہ آور چیزوں اور جوئے، لاٹریوں وغیرہ کے ذریعہ دین، عقل ومال وغیرہ کی بربادی انتہا کو پہنچ گئی ہے اللہ رحم کرے۔

احکام استیذان کے لئے رغبت

علامہ مفسر آلوسیؒ نے لکھا کہ حضرت عمرؓ کی رائے موافق وحی ہونے کے واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ نے ایک انصاری مدلج نامی کو حضرت عمرؓ کے پاس دوپہر کے وقت بھیجا اس وقت وہ سوئے ہوئے تھے، دروازے پر دستک دی اندر گئے تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اس میں ان کے جسم کا کچھ حصہ کھل گیا، حضرت عمرؓ نے کہا: کیا ہی اچھا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے وقت میں ہمارے آباء، ابناء اور خدام کو بغیر اجازت کے ہمارے پاس داخل ہونے کی ممانعت ہو جائے، پھر حضرت عمرؓ مدلج کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سورۂ نور کی آیت (۵۸) يايها الذين امنوا ليستاذنكم الذين ملكت ايمانكم اتری، حضرت عمرؓ اس کے شکر میں سربسجود ہو گئے (روح المعانی ۱۸/۲۰۹)

معذرتِ حضرت عمرؓ ونزولِ وحی

امام احمدؒ نے روایت کیا کہ رمضان المبارک کے دنوں میں حضرت عمرؓ نے اپنی بعض ازواج کے ساتھ شب باشی کی، پھر معذرت کیلئے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کیا، تو اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت (۱۸۷) نازل ہوئی احل لكم ليلة الصيام الرفث الى نسائكم روزے کی راتوں میں تمہارے لئے شب باشی جائز کی گئی (ازالۃ الخفاء ۱/۳۷۱)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ابتداء میں جب روزے فرض ہوئے تو تفصیلی احکام آنے سے قبل لوگ رات کو سونے سے قبل ہی کھاتے پیتے اور جماع سے فارغ ہو لیا کرتے تھے، پھر اگلی شام تک روزے کی حالت پر رہتے تھے، حضرت عمرؓ سے ایک شب ایسا ہوا کہ سونے کے بعد بھی شب باشی کی، پھر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر ندامت ومعذرت کے ساتھ صورتِ واقعہ عرض کی، آپ نے فرمایا کہ تمہارے لئے مناسب نہ تھا کہ ایسا کرتے اس پر آیت، احل لكم اتری (ابن کثیر ۲۲۰)

حضرت عمرؓ کے ہر شبہ پر نزول وحی

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ اسلام لانے سے قبل ایک دن میں حضور علیہ السلام کا حال معلوم کرنے کو نکلا، آپ کو مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا، میں بھی آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا، آپ نے سورۃ الحاقہ کی تلاوت شروع کی، میں قرآن مجید سن کر تعجب کرنے لگا، اور دل میں کہا کہ قریش سچ کہتے ہیں یہ تو شاعر ہے آپ نے پھر یہ آیت پڑھی "انه لقول رسول كريم وما هو بقول شاعر قليلا ماتو منون" (یہ قرآن ایک معزز فرشتہ کے ذریعہ اُتارا ہوا کلام ہے، اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، تمہاری توجہ ایمان باللہ کی طرف کم ہے) میں نے دل میں کہا یہ شاعر نہیں تو کاہن ہے آپ نے یہ آیت پڑھی "ولا بقول كاهن قليلاما تذكرون ،تنزيل من رب العالمين" (اور یہ کسی کاہن کا کلام بھی نہیں ہے، تم عقل وسمجھ سے کام لینے میں کوتاہی کرتے ہو، یہ تو رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے، پھر آخر تک آپ نے تلاوت کی تو اسلام میرے دل میں پوری طرح اتر گیا (ازالۃ الخفاء ۴۹۷)

اہل جنت ونعیم میں امت محمدیہ کی تعداد کم ہونے پر فکروغم

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب سورۂ واقعہ کی یہ آیت اتری ''ثلة من الاولين وقليل من الآخرين '' (اہل جنت ونعیم میں بڑا گروہ پہلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے) تو حضرت عمرؓ نے خدمتِ اقدس نبویہ میں عرض کیا یارسول اللہ! پہلے زیادہ اور ہم کم ہوں گے؟ راوی کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے کچھ جواب نہ دیا تا آنکہ ایک سال کے بعد اس صورت کے آخری اجزاء اُترے اور اُن میں یہ آیت تھی "ثلة من الاولين وثلة من الآخرين" (ان میں ایک بڑا گروہ پہلوں کا ہوگا اور ایک بڑا گروہ پچھلوں کا ہوگا) اس پر حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا: عمر! آؤ اس بشارت کو سن لو، پھر فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے مجھ تک ایک گروہ ہے اور میری امت دوسرا گروہ ہے اور ہمارا گروہ اس وقت تک پہلوں کے برابر نہ ہوگا جب تک کہ سوڈان کے حبشی اونٹ چرانے والوں کو بھی ہم اپنے گروہ میں شامل نہ کرلیں گے، جو وحدانیت کی شہادت دیں گے (ابن کثیر ۲۸۴/۴-ازالۃ الخفاء ۲۸۴/۱)

حافظ ابن کثیر نے آیتِ مذکورہ سے متعلق دوسرے اقوال اور تفصیل بھی پیش کی ہے، جو اہل علم ونظر کے مطالعہ کے لائق ہے۔

مکالمہ یہود اور جواب سوال کہ جہنم کہاں ہے

سورۂ آل عمران کی آیت (۱۳۳) "وسارعوا الى مغفرة من ربكم وجنة عرضها السموات والارض اعدت للمتقين" (دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، وہ اُن خداترس لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو حسبِ مقدرت اچھے بُرے ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، غصہ وغضب پر قابو رکھتے اور لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ عفو واحسان والوں کو پسند کرتے ہیں) یہود نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا کہ جنت جب اتنی بڑی ہے تو جہنم کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا، تم بتاؤ جب دن آتا ہے تو رات کہاں چلی جاتی ہے اور رات آتی ہے تو دن کہاں چلا جاتا ہے؟ انھوں نے کہا یہ مثال تو تم نے توراۃ سے لی ہے، دوسری روایات سے معلوم ہوا کہ یہی سوال ہرقل (شہنشاہ روم) اور بعض دوسرے لوگوں نے حضور علیہ السلام سے بھی کیا تھا (ابن کثیر ۴۰۴/۱)

حافظ ابن کثیرؒ نے سب روایات نقل کرنے کے بعد لکھا کہ جواب مذکور کی دو مراد ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ دن کے وقت ہمارے رات کو مشاہدہ نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سرے سے اس کا وجود ہی اس وقت نہ ہو، اور اسی طرح رات کے وقت دن کا مشاہدہ نہ کرنے کی حالت ہے۔

دوسری یہ کہ جب ہماری طرف کے سارے عالم کو دن گھیر لیتا ہے اور روشنی پھیل جاتی ہے تو دوسری جانب رات اور تاریکی ہو جاتی ہے، اسی طرح جنت کا علاقہ اعلیٰ علیین میں آسمانوں کے اوپر اور عرشِ الٰہی کے نیچے ہے، اور اس علاقہ جنت کی وسعت وچوڑائی آسمان وزمین کی وسعت وچوڑائی کی طرح[1] ہے، اور جہنم کا علاقہ اسفلِ سافلین ہے لہذا جنت کے آسمان وزمین کے برابر وسیع ہونے اور جہنم ونار کے وجود میں کوئی منافات نہیں ہے (ابن کثیر)

صدقہ کے بارے میں طعن کرنے والوں کو قتل کرنے کی خواہش

ازالۃ الخفاء ۲۱۳/۱ میں موافقاتِ سیدنا حضرت عمرؓ میں سے آیتِ سورۂ توبہ (۵۹) "ومنهم من يلمزك في الصدقات" بھی

---

[1] سورۂ حدید میں ہے "سابقوا الى مغفرة من ربكم وجنة عرضها كعرض السماء والارض اعدت للذين آمنوا بالله ورسله" جنت وجہنم کے علاقوں کی تفصیل ہم نے حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ کے ملفوظات "نطق انور" میں درج کر دی ہے، حافظ ابن کثیرؒ کی تشریح مذکور ہے وہ تحقیق پوری طرح منطبق ہو جاتی ہے، کیونکہ جس طرح ہماری نسبت سے دنیا کا نیچے کا حصہ امریکہ وغیرہ ہے، اسی طرح آسمانوں کے اوپر کے علاقہ میں جنتوں کا وجود ہوگا، اور یہ دنیا کا موجودہ سارا علاقہ جہنم کا ہوگا، جو جنتوں کے علاقہ کی نسبت سے اسفل سافلین ہوگا، کیونکہ درمیان میں اربوں کھربوں نوری سالوں کی مسافت حائل ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم! "مؤلف"

ذکر کی ہے (یعنی بعض لوگ اُن میں سے وہ ہیں جو آپ کی تقسیم صدقہ پر طعن و اعتراض کرتے ہیں) اور لکھا کہ بخاری و نسائی میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام لوگوں میں صدقہ کا مال تقسیم فرمارہے تھے کہ اس وقت ذوالخو یصرہ آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ !عدل کیجئے! آپ نے فرمایا:۔افسوس ہے اگر میں عدل نہ کروں گا، تو اور کون کرے گا، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیں کہ اس کی گردن ماردوں، آپ نے فرمایا جانے دو، اس کے ساتھ کے اور بھی لوگ ہیں جن کی نماز روزوں کے مقابلہ میں تم اپنی نماز روزوں کو حقیر جانو گے، یہ لوگ دین سے اس طرح سے جدا ہوں گے، جس طرح شکار کے اندر سے تیر جلدی سے نکل جاتا ہے، اور اُس تیر پر شکار کے خون وغیرہ کا کوئی اثر تک نہیں ہوتا، الخ حضرت سعیدؓ کا بیان ہے کہ میں نے یہ حدیث سُنی اور یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے اس قسم کے بداعتقاد لوگوں کو اپنے زمانہ خلافت میں قتل کیا، یعنی جب ان لوگوں کی کثرت ہوگئی تو حسب فرمانِ نبوی قتل کئے گئے، اور حضرت عمرؓ کی خواہش پوری ہوگئی کہ ایسے لوگوں کا قتل ضروری ہے۔

تفسیر ابن کثیر ۳۶۳؍۲ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا، جب ایسے لوگ خروج کریں تو ان کو قتل کردینا، تین بار یہی فرمایا، اور آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ لوگ قرآن مجید کی تلاوت بھی کریں گے مگر (فسادِ عقیدہ کے باعث) وہ ان کے حلق سے تجاوز کر کے سینوں تک نہ اُترے گا، نیز فرمایا کہ یہ دنیا کے بدترین مقتول ہوں گے۔

بشارتِ نبویہ دخولِ جنت اور حضرت عمرؓ کی رائے کی قبولیت

مسلم شریف میں حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوہریرہؓ کو بطورِ نشانی اپنے نعلین مبارکین دے کر یہ پیغام سپرد کیا کہ جو شخص دل کے یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دے اس کو جنت کی بشارت دیدو، راستہ میں حضرت عمرؓ ملے، پوچھا کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا حضور علیہ السلام نے اس کام کے لئے بھیجا ہے، حضرت عمرؓ نے ان کے سینہ پر زور سے ہاتھ مارا کہ وہ گر گئے، اور روتے ہوئے حضور علیہ السلام کے پاس پہنچے، آپ نے وجہ پوچھی، بتلائی، اتنے میں حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے آپ نے ان سے مارنے وغیرہ کا سبب دریافت فرمایا، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایسا نہ کیجئے! مجھے ڈر ہے کہ اس کو سن کر لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے، ان کو عمل کرنے دیجئے، حضور علیہ السلام نے فرمایا "اچھا! رہنے دو۔" ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کی رائے مذکور کو وحیِ الٰہی کے تحت ہی قبول فرمایا ہوگا "**وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ**" اس لئے حضرت عمرؓ کی رائے وحی کے مطابق ہوئی۔

نمازوں میں فصل کرنا! ابوداؤد شریف ۱۴۳ (**باب الرجل یتطوع فی مکانہ الذی صلیٰ فیہ المکتوبہ**) میں حدیث ہے کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ اگلی صف میں داہنی جانب کھڑے ہوا کرتے، جوں ہی حضور علیہ السلام نے نماز ختم کر کے دونوں طرف سلام پھیرا ایک شخص نے جس نے آپ کے پیچھے تکبیر اولیٰ سے آخر تک نماز پوری کرلی تھی، یکدم کھڑا ہو کر نفل یا سنت پڑھنے لگا، حضرت عمرؓ جلدی سے اس کے پاس گئے اور اس کے مونڈھے پکڑ کر ہلائے، پھر کہا کہ ابھی بیٹھ جاؤ، کیونکہ اہل کتاب پر ہلاکت اس لئے آئی تھی کہ وہ اپنی نمازوں میں فاصلہ نہیں کرتے تھے، حضور علیہ السلام نے نظر اٹھا کر یہ سب ماجرا، دیکھا اور فرمایا:۔ اے ابن خطاب! اللہ تعالیٰ نے تم کو حق وصواب کے لئے موفق کیا ہے" گویا جو بات حضرت عمرؓ نے درست سمجھی تھی، وہ مرضی شارع علیہ السلام سے بھی مطابق ہوئی، اور یہ بھی موافقتِ وحی ہے۔

بدائع میں ہے کہ جس فرض نماز کے بعد سنتیں ہوں، تو فرض کے بعد بیٹھنا مکروہ ہے، اور یہ کراہت صحابہ کرام سے مروی ہے، حضرت ابوبکر و عمرؓ سے مروی ہے کہ نماز فرض کے بعد وہ اتنی جلد وہاں سے اُٹھ جاتے تھے جیسے کوئی گرم پتھر پر سے جلد اُٹھ جاتا ہے، یعنی اُٹھ کر اس جگہ سے الگ ہوجانا چاہیے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کیا کوئی تم میں سے اس امر سے عاجز ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر آگے پیچھے ہو کر جگہ

بدل لے، اور مستحب امام ومقتدی سب کے لئے یہی ہے کہ فرض نماز کے بعد دوسری جگہ سنتیں پڑھیں۔ (انوارالمحمود ۶ ۱/۳۳)

حضرت عمرؓ کا شوروی مزاج ہونا

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفاء ۶۹ /۱ میں لکھا سورۂ شوریٰ میں قول باری تعالیٰ " فما اوتیتم من شیء فمتاع الحیوۃ الدنیا" سے لمن عزم الامور" تک صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے احوال بیان کئے گئے ہیں چنانچہ "جمله للذین آمنوا وعلی ربهم یتوکلون" سے مہاجرین اولین کے وصفِ ایمان وتوکل کی طرف اشارہ ہے، جملہ والذین یجتنبون کبائر الا ثم سے انصار وتابعین انصار ودیگر اہل صلاح وفلاح کا حال ذکر ہوا ہے، جملہ "والذین استجابوا لربھم" میں حضرت ابوبکرؓ کی جانب تعریض ہے کہ آپ کا مشہور ومعروف وصف تسلیم وانقیاد تھا کہ پہلی ہی دفعہ میں دعوتِ حق قبول کرلیا کرتے تھے، اور اقامتِ صلوٰۃ میں بھی آپ بلند پایہ رکھتے تھے، اسی لئے مرض وفات میں حضور علیہ السلام نے آپ ہی کو اپنا جانشین بنایا تھا جملہ" وامرھم شوریٰ بینھم " حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آپ کا نہایت[1] مشہور ومعروف وصفِ امتیاز شوریٰ تھا اور آپ اپنے زمانہ خلافت میں بھی کوئی امر بغیر مشورۂ علماءِ صحابہ کے نافذ نہیں کرتے تھے اور اسی لئے ملتِ اسلامیہ کے اعظم اجماعیات وہ امور ہیں جن پر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اجماع ہو چکا ہے، "جمله ومما رزقنا هم ینفقون " سے اشارہ حضرت عثمانؓ کی طرف ہے اور جملہ" والذین اذا اصابھم البغی ''الخ سے اشارہ حضرت علیؓ کی جانب ہے اور آیت وجزاء سیئۃ سے حضرت حسنؓ کے عفو وصلح پسندی کی طرف اشارہ ہوا ہے، جملہ ولمن انتصر الخ سے اشارہ حضرت معاویہؓ کی طرف ہے، جملہ انما السبیل الخ سے جوانانِ بنی امیہ کی طرف تعریض ہے جن کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری امت کی تباہی قریش کے چند جوانوں کے ہاتھ سے ہوگی، آخر میں جملہ ولمن صبر الخ سے علماءِ اخیار امت کی طرف اشارہ ہے، جن کے رئیس وسر دفتر حضرت حسینؓ تھے، آپ نے اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ حضور علیہ السلام نے خلیفہ وقت پر تلوار اٹھانے سے منع فرمایا ہے، سکوت وخاموشی اختیار کر کے باوجود کراہت کے اطاعت قبول کرلی۔

اذان کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے

بخاری شریف باب بدء الاذان (۸۵) اور ترمذی باب ماجاء فی بدء الاذان میں حضرت ابن عمرؓ سے حدیث مروی ہے کہ ابتداء جب مسلمان مدینہ طیبہ میں نماز کے لئے جمع ہوئے تو وقت کا اندازہ کر لیتے تھے، اذان وغیرہ کا طریقہ نہ تھا، پھر اس بارے میں مشورہ کیا تو بعض نے کہا کہ نصاریٰ کی طرح ناقوس بنالو، بعض نے کہا یہود کی طرح بوق لے لو، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم ایک شخص کو نماز کی ندا اور اعلان کے لئے کیوں نہ بھیج دیا کرو، حضور اکرم ﷺ نے اس رائے کو پسند فرما کر حضرت بلالؓ کو حکم کیا کہ جاؤ! تم نماز کا اعلان کردیا کرو۔

قاضی عیاضؒ نے کہا کہ بظاہر یہ حکم موجودہ اذان شرعی کا نہ تھا، بلکہ صرف اعلان تھا جمع ہونے کے لئے (الصلوۃ جامعہ الصلوۃ جامعه کہہ کر) علامہ نوویؒ نے کہا کہ قاضی عیاضؒ کی یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ ترمذی وابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث ہے کہ انھوں نے ایسا ہی خواب عرض کیا، تو وہ بعد کی دوسری مجلس کا واقعہ ہے، غرض پہلے صرف اعلانِ مذکور حضرت عمرؓ کی رائے سے اختیار کیا گیا، پھر اذانِ مشروع کا طریقہ ان دونوں حضرات کے خواب پر اختیار کیا گیا، حافظؒ نے کہا کہ پہلے اعلان میں صرف "الصلوۃ جامعۃ" کہا جاتا تھا (تحفۃ الاحوذی ۱۶۹)

---

[1] یہ ایسا ہی ہے جیسے مجتہدین وفقہاءِ امت میں سے سب سے بڑا وصفِ امتیازی حضرت امام اعظمؒ کا بھی شوریٰ ہی تھا کہ آپ نے چالیس محدثین وفقہاء کی مجلس بنا کر ان کے مشورہ سے فقہ کے مسائل مدون کرائے، اور آپ نے قرآن مجید، حدیث نبوی، آثار صحابہ وتابعین اجماع امت اور قیاس شرعی کی روشنی میں ''فقہ حنفی'' کو مرتب کرایا، جس کی پوری تفصیل مقدمہ انوارالباری جلد اول میں آچکی ہے ''مؤلف''

افادۂ انور! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ بناءِ مسجد نبوی کے بعد پہلے سال میں مشورہ ہوا تو بعض نے کہا کہ ایک جھنڈا نماز کے وقت بلند کیا جایا کرے، جس کو دیکھ کر سب نماز کے لئے جمع ہوں، بعض نے کہا یہود کا بوق، بعض نے نصاریٰ کا ناقوس تجویز کیا، پھر حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ انصاری اور حضرت عمرؓ نے اذان کے موجودہ کلمات خواب میں سنے، اور حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ سے پہلے خواب دیکھا تھا، مگر ذکر نہ کیا، کیونکہ حضرت عبداللہؓ نے پہلے جا کر خبر دے دی تھی، اس پر حضرت عمرؓ کو حیاءِ مانع ہوئی، یہ بات انھوں نے خود بیان کردی۔ (انوارالمحمود ۲۰۴/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اعلان اوّل اور اذان مشروع دونوں میں حضرت عمرؓ ہی سابق تھے، اور یہ اذان آپ ہی کے مبارک خواب کی یادگار ہے، اور بظاہر اوّل مشورہ کے بعد سے اذانِ مشروع کے نفاذ تک وہی اعلان کا طریقہ رائج رہا ہوگا جو حضرت عمرؓ کی رائے سے طے ہوا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم!

عورتوں کو حاضری مساجد سے روکنا

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت عمرؓ عورتوں کیلئے گھروں سے باہر نکلنا پسند نہ کرتے تھے، اور حجاب کے لئے زیادہ سخت احکام چاہتے تھے، لیکن حضور علیہ السلام کے زمانہ خیر وسعادت میں اگرچہ حجاب کے احکام آگئے تھے، مگر اتنی سختی لازم نہ تھی جتنی حضرت عمرؓ چاہتے تھے، حضور علیہ السلام کے زمانہ میں عورتیں مسجد نبوی میں جماعت کی شرکت بھی کرتی تھیں، اگرچہ بخاری وغیرہ کی احادیث میں ذکر شدہ وہ احتیاطیں بھی ملحوظ تھیں، جن سے فتنہ کا احتمال کم تھا، مثلاً آنے جانے میں مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہونا، دخولِ مسجد کے لئے دروازہ الگ ہونا، نماز کی جگہ تو عورتوں کے لئے سب سے پیچھے کی متعین ہی تھی، یہ بھی بخاری ۱۱۹ میں ہے کہ حضور اکرم علیہ السلام کے ساتھ نماز کا سلام پھیرتے ہی عورتیں گھروں کو روانہ ہو جاتی تھیں اور حضور علیہ السلام مع صحابہ کرام کے کچھ دیر ٹھیرتے تھے، پھر جب حضور اٹھتے تھے تو ان کے ساتھ دوسرے مرد اُٹھتے تھے،

حضور علیہ السلام نے عورتوں کی آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کی شدید خواہش کا لحاظ کرتے ہوئے مردوں کو فرمادیا تھا کہ تمہاری عورتیں جب رات کے وقت نمازِ مسجد کی اجازت چاہیں تو دیدیا کرو (بخاری ۱۱۹) اسی لئے علامہ محدث کرمانی نے لکھا کہ آپ کے ارشاد "لاتمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ" (اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ روکو) کا مطلب بھی یہی ہے کہ رات کے وقت حاضری مساجد سے نہ روکو، امام مالکؒ نے فرمایا کہ اجازت کی سب احادیث میں مراد بوڑھی عورتیں ہیں، کہ ان کیلئے دن کے وقت بھی حرج نہیں، پھر بھی علماء نے لکھا کہ یہ اس دور کے لئے تھا جس میں فتنہ کا ڈر نہ تھا، نہ ان سے تھا نہ ان کے لئے تھا، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ بخلاف ہمارے زمانہ کے کہ اس میں فساد وشر کا بہت غلبہ ہے (حاشیہ بخاری ۱۱۹) تاہم حضور علیہ السلام ہی نے اپنے زمانہ میں بھی یہ فرمادیا تھا کہ اگر ثواب کی زیادتی کا لالچ ہو تو میری مسجد سے زیادہ ثواب عورتوں کے لئے اپنے گھر کی قریبی مسجد میں ہے اور اس سے بھی زیادہ ثواب اپنے گھر کے اندر ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے تو بعد کے حالات کی وجہ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر رسول اللہ علیہ السلام کے زمانے میں وہ باتیں ہوتیں جو بعد کو عورتوں نے پیدا کردی ہیں تو ضرور ضرور ان کو مسجد کی حاضری سے روک دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی کو روک دیا گیا تھا، عورتوں نے نئی چیزیں کیا پیدا کیں؟ اس کی تشریح زینت، خوشبو، عمدہ لباس وغیرہ کی خواہش ورغبت ہے، اس میں حضور علیہ السلام کے بعد بہت ترقی ہوئی، (حاشیہ بخاری ۱۲۰ و مجمع البحار) اور اُس وقت سے اب تک تو اس قسم کی چیزوں میں کہیں زیادہ پیش رفت ہو چکی ہے اور ہر دم ترقی مزید ہے، پھر جب مساجد کے لئے اتنی شدت ہے تو دوسری جگہوں کے لئے بلاشدید ضرورت کے نکلنے کا حکم خود ظاہر ہے، اور جو رائے حضرت عمرؓ کی تھی وہی اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اکرم علیہ السلام اور تمام صالحین امت کو بھی محبوب ہے، اور اس کا خلاف مبغوض۔

عورتوں کی بالادستی وغلبہ کے خلاف رائے

حضرت عمرؓ پر یہ بات بہت ہی شاق تھی کہ مکی معاشرے کے خلاف مدنی معاشرے میں مردوں پر عورتوں کا غلبہ ہے، اور قریشی عورتیں

بھی انصاری عورتوں کے اثرات قبول کررہی ہیں، اس تمام صورتِ حال کو آپ "الرجال قوامون علی النساء" کے خلاف سمجھتے تھے، اور حضور علیہ السلام کو بھی اس امر کا احساس تھا، مگر آپ کی غیر معمولی رافت ورحمت اور حلم وشفقت عورتوں پر کسی سختی کو پسند نہ کرتی تھی، اور آپ چاہتے تھے کہ جتنی بھی اصلاح نرمی سے ہوسکے وہ زیادہ بہتر ہے تاہم آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ قوم فلاح نہیں پاسکتی جو اپنا والی اور سربراہ کسی عورت کو بنالے (بخاری ۶۳۷) باب کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ وقیصر)

ترمذی شریف میں ہے کہ جب امانت کی چیز کو مالِ غنیمت کی طرح سمجھ لیا جائے، زکوۃ کو بوجھ خیال کیا جائے، دین کا علم دنیا کے واسطے حاصل کیا جائے، اور مرد عورتوں کی اطاعت کرنے لگیں تو خدا کے عذاب اور قیامت کے قرب کو یقینی سمجھو (مشکوٰۃ ۴۷۰ باب اشراط السلعۃ) ترمذی شریف میں دوسری حدیث ہے کہ جب تمہارے امراء وحکام تم میں کے اچھے لوگ ہوں، مالدار سخی ہوں، اور تمہارے معاملات باہمی مشوروں سے طے ہوں تو تمہارے لئے زمین پر رہنا بسنا بہت اچھا ہے، لیکن اگر تمہارے امراء وحکام شر وفساد پسند کرتے ہوں، تمہارے مالدار بخیل ہوں، اور تمہارے معاملات عورتوں کی رائے سے طے ہونے لگیں تو تمہارے جینے کا کچھ لطف نہیں، اور زمین کے اندر پہنچ جانا اوپر رہنے سے بہتر ہے (مشکوٰۃ شریف ۴۵۹ باب تغیر الناس)

بیوتِ نبوی میں بغیر اذن آمد ورفت کی ممانعت

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور دیر تک بیٹھا رہا، حضور علیہ السلام کئی بار اُٹھے کہ وہ چلا جائے مگر وہ نہ گیا، حضرت عمرؓ آئے تو حضور علیہ السلام کی ناگواری کو محسوس کیا اور اس شخص سے کہا کہ تم نے حضور علیہ السلام کو تکلیف دی، اس پر وہ سمجھا اور اٹھ کر گیا، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ پردہ کا حکم فرماتے تو بہت اچھا ہوتا، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:۔

یٰایھاالذین امنوا لاتدخلوا بیوت النبی الآیہ (اے مومنو! بیوتِ نبویہ میں بلا اجازت مت جاؤ) اور حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کو بلا کر اس کے نزول سے مطلع فرمایا (ازالۃ الخفاء ۴۵۸/۱)

نوٹ! اس کے بعد ہم بطورِ مثال چند اہم امور وہ ذکر کرتے ہیں، جن میں معنوی اعتبار سے حضرت عمرؓ نے موافقتِ وحی کی یا جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا درست ہے کہ انھوں نے حق تعالیٰ اور اسکے رسول اکرم ﷺ کی پسندیدگی کا مرتبہ ضرور حاصل کیا ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم علمہ اتم واحکم!

صدیق اکبر کی خلافت کی تحریک

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو چار باتوں کی وجہ سے سب لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی (۱) اساریٰ بدر کے بارے میں قتل کا مشورہ دیا جس پر آیت اتری۔ (۲) ازواجِ مطہرات کو پردہ میں رکھنے کا مشورہ دیا، جس میں آیت اتری (۳) حضور علیہ السلام نے دعا کی کہ اسلام کو عمرؓ کے ذریعہ قوت دے۔ (۴) حضرت عمرؓ نے خلافتِ صدیقی کے لئے تحریک کی اور سب سے پہلے ان کی بیعت کی، رواہ الامام احمد (مشکوٰۃ شریف) حضرت ملا علی قاریؒ نے لکھا کہ اس وقت حضرت عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے یہ اہم فیصلہ کیا، اور سب نے اس میں آپ کی متابعت کی اور بیعت کی (مرقاۃ ۵۴۳/۵)

سیر وتاریخ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد سب سے زیادہ اہم کام آپ کے جانشین کا طے کرنا تھا، ورنہ اختلالِ عظیم رونما ہونے کا خطرہ تھا، چنانچہ آپ کی تجہیز وتکفین اور دفن سے بھی پہلے یہی مسئلہ سامنے رکھا گیا، اور تھوڑی دیر کے لئے یہ ناگوار صورت بھی پیش آگئی کہ مہاجرین وانصار میں اختلاف ہوگیا حالانکہ وہ دونوں قومیں حضور علیہ السلام کی زندگی میں اتفاق واتحاد کی بے نظیر مثال تھیں، اس وقت حضرات مہاجرین تو مسجد نبوی میں جمع تھے، اور انصار کا اجتماع ان سے الگ سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا، وہ چاہتے تھے کہ سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ چن لیں، یہ معلوم ہوکر حضرت ابوبکر وعمرؓ وہاں گئے، انصار نے کہا کہ ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکرِ جرار ہیں، اس لئے

مناسب ہے کہ ہم میں سے ہی کوئی خلیفہ منتخب ہو، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ آپ حضرات کے فضائل ناقابلِ انکار ہیں، مگر حکومت کے لئے قبیلہ قریش میں سے ہی کوئی چنا جائے تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ سارے عرب کے لوگ صرف ان ہی کو اپنا سردار مانتے چلے آئے ہیں، اور وہ قریش کے سوا کسی کی حکومت وسیادت کو تسلیم نہ کریں گے، پھر مہاجرین کو تقدمِ اسلام اور حضور علیہ السلام سے خاندانی ربط وقرب کی وجہ سے بھی ترجیح ہے، اس پر بھی بعض انصار نے کہا کہ ایک امیر تمہارا ہوگا، اور ایک ہمارا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا نہیں! اس سے بہتر یہ ہے کہ امراء ہماری جماعت سے ہوں اور وزراء تمہاری جماعت سے، پھر فرمایا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ اور ابوعبیدہؓ دونوں میں سے کسی کو پسند کرلو، اس پر حضرت عمرؓ فوراً اُٹھے اور حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرمایا:۔ ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، کیونکہ آپ ہم سب سے بہتر اور برگزیدہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ بھی آپ کو سب سے زیادہ محبوب وعزیز رکھتے تھے، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے بیعت کی اور پھر سب لوگوں نے بھی بیعت کرلی۔ (بخاری ۵۱۸ کتاب المناقب)

پھر حضور علیہ السلام کی وفات سے اگلے دن منگل کو جب صحابہ نماز کے لئے مسجد میں جمع ہوئے تو اس وقت بھی حضرت عمرؓ نے خلافتِ صدیقی کا اعلان کیا اور بتلایا کہ کل ہم سب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، آپ سب بھی بیعت کرلیں، اس پر وہاں بھی سب مہاجرین وانصار نے حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، گویا سقیفہ کی ''بیعتِ خاصہ'' کے بعد مسجد نبوی میں علی الاعلان ''بیعت عامہ'' بھی ہوگئی۔

اس اہم ترین کام سے فارغ ہوکر سب لوگ حضور اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین کی طرف متوجہ ہوگئے، اور آگے سب امور حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ کے امروارشاد سے انجام پاتے رہے، کسی بھی اختلاف وانتشار کی نوبت نہیں آسکی۔

سیرۃ النبی ۱۸۳/۲ میں تجہیز وتکفین کی تاخیر کے جو اسباب ذکر کئے ہیں، ان میں نہ معلوم کس لئے اس اہم ترین سبب کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ سبب سب سے زیادہ قابلِ ذکر تھا، اور اگر حضرت ابوبکر وعمرؓ نے بروقت مسئلہ خلافت کی طرف توجہ نہ کی ہوتی اور آئندہ فتنوں کی پیش بینی کر کے ان کا انسداد نہ سوچا ہوتا تو اسلامی دور کی ترقیات کا وہ شاندار نقشہ ہرگز نہ ہوتا جو رونما ہوا بلکہ آپس میں جنگ وجدال قائم ہوکر اسلام کی ساری قوت وشوکت خاک میں مل جاتی، اس لئے ہم حضرت عمرؓ کے بے مثال کارناموں میں سے خلافتِ صدیقی کی تحریک کو سب سے پہلا درجہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

جمع قرآن کی تحریک

اس کا ذکر حضرت عمرؓ کے مناقب میں آچکا ہے اور یہ ہمارے نزدیک آپ کا دوسرا عظیم الشان کارنامہ ہے، اگر آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس اہم ترین کام کے لئے آمادہ نہ کرتے تو ظاہر ہے یہ عظیم وجلیل نعمت ساری امت کو اس طرح محفوظ ومکمل حالت میں نہ پہنچ سکتی۔

طلقاتِ ثلاثہ کا مسئلہ

مسائل طلاق میں سے تین طلاق ایک جملہ کے ساتھ دینے کا مسئلہ نہایت اہم ہے، جس میں حافظ ابن قیم، حافظ ابن تیمیہ اور اہل ظاہر[۱] نے بہت کچھ بحث کی ہے، عہدِ نبوی میں اس کی پوری وضاحت ہر عام وخاص کے لئے نہ ہوسکی تھی، اس لئے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب یہ مسئلہ اٹھا تو آپ نے حضراتِ صحابہ کرام کے مشورہ سے اس کا واضح فیصلہ فرمادیا کہ شوہر اگر بیوی کو یہ کہہ دے کہ تجھے تین طلاق دیں، خواہ رخصتی سے قبل کہی یا بعد ہر صورت میں طلاق مغلظہ واقع ہوجائیگی، جس کا حکم یہ ہے کہ بغیر دوسرے[۲] سے نکاح وطلاق کے اس تین طلاق دینے والے شوہر کے نکاح میں نہیں آسکتی، حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ حضور علیہ السلام نے زمانہ میں لوگ

---

[۱] علامہ ابن رشد اور محقق عینیؒ وغیرہ نے اہل ظاہر کا خلاف نقل کیا ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ ایک بہت بڑے مشہور ومعروف ظاہری حافظ حدیث ابن حزم اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں اور انھوں نے اس مسئلہ میں جمہور کی تائید میں خوب دلائل دیئے ہیں، کما ذکرہ المحقق الکوثری فی رسالۃ ''الاشفاق علی احکام الطلاق''

بوقت ضرورت ومجبوری کے، حسبِ ہدایت شریعت ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق دیا کرتے تھے، لیکن اب لوگوں نے اُس احتیاط اور صبر وضبط کو کھودیا ہے، اس لئے جو کچھ ان کو حق حاصل ہے یعنی تین طلاق دینے کا اس کو عام طور پر ایک ہی وقت اور ایک ہی جملہ سے نافذ کرنے لگے ہیں، لہذا ہمارے نزدیک شریعت ہی کی روشنی میں تین طلاق کا واقع ونافذ ہونا ضروری قرار پایا، تمام ہی صحابہؓ نے اس مسئلہ پر اتفاق کیا، کسی ایک صحابی سے بھی اس کا خلاف یقین ووضاحت کے ساتھ نقل نہیں ہوا، کیونکہ مسلم شریف میں جو روایت حضرت ابن عباسؓ سے بواسطہ طاؤس نقل ہوئی ہے، اس کو امام احمدؒ نے ضعیف سمجھ کر رد کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ حضرت ابن عباسؓ سے طاؤس کے علاوہ دوسرے تلامذہ حدیث نے اس کے خلاف روایت کی ہے امام احمد کے اس رد کو خود حافظ ابن قیمؒ نے بھی اپنی کتاب اغاثۃ اللھفان میں ذکر کیا ہے، اور بستان الاحبار مختصر نیل الاوطار ۲/۲۴۳ میں بھی امام احمدؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "حضرت ابن عباسؓ کے تمام اصحاب نے طاؤس کے خلاف روایت کیا ہے، مثلاً سعید بن جبیر، مجاہد ونافع نے۔ بدایۃ المجتہد ۵۳ میں بھی ہے کہ طاؤس کے سوا تمام اصحاب ابن عباسؓ نے تین طلاق کا لزوم روایت کیا ہے بستان میں اسی صفحہ پر یہ بھی نقل کیا گیا کہ ایک وقت میں تین طلاق دینے سے تینوں کا واقع ہوجانا، یہی مذہب جمہور تابعین، کثیر صحابہ، ائمہ مذاہب اربعہ اور ایک گروہ اہل بیت کا ہے، جن میں امیر المومنین حضرت علیؓ بھی ہیں، اور اس سے صرف ایک طلاق واقع ہونے کا مذہب ایک جماعت متاخرین کا ہے، جن میں ابن تیمیہ، ابن قیم اور ایک جماعت محققین[۲] کی ہے، اسی بستان ۲۴۱ میں بواسطہ مجاہد حضرت ابن عباسؓ سے دو روایتیں اور بواسطہ سعید بن جبیر دو روایتیں نقل کی ہیں جن میں حضرت ابن عباسؓ نے تین طلاق کا حکم دیا ہے، پھر ۲۴۲ میں لکھا کہ ان سب روایات سے ثابت ہوا کہ ایک کلمہ سے تین طلاقیں واقع ہونے کی صحت پر اجماع ہو چکا ہے۔

یہ نہایت عجیب وغریب بات ہے کہ حافظ ابن تیمیہ وابن قیمؒ دونوں نے اس مسئلہ میں حضرت عمرؓ کے مذکورہ فیصلہ، اجماع صحابہ اور ائمہ مجتہدین سب ہی کے خلاف رائے قائم کر کے پورا زور ان سب کے خلاف لگا دیا ہے حالانکہ ان میں حضرت امام احمدؒ[۳] بھی ہیں جن کے وہ

---

[۱] بدایۃ المجتہد ۶۷ میں لکھا کہ حلالہ کرنے والے نے اگر نکاح دوسرے کے لئے حلال کرنے کی شرط پر کیا تو امام مالک کے نزدیک وہ نکاح فاسد ہے لیکن امام ابو حنیفہ وامام شافعیؒ کے نزدیک وہ نکاح جائز ہے اور شرط یا نیت مذکور کا نکاح پر کچھ اثر نہ ہوگا یہی قول داؤد ظاہری کا بھی ہے یہ سب کہتے ہیں کہ اس نکاح کے بعد طلاق ہونے پر پہلے (طلاق مغلظہ دینے والے) شوہر سے نکاح بھی مطلقہ مذکورہ کا صحیح ہوگا، گویا محلّل کی فاسد نیت اور محلّل لہ کے شرط لگانے کا گناہ موافق فرمانِ نبوی ان دونوں کو ضرور ہوگا، مگر اس کا اثر صحتِ نکاح پر کچھ نہ ہوگا جس طرح حلالہ والی آیت سے اگلی ہی آیت ۲۳۱ میں امساک ضراراً کو اعتداء وظلم قرار دیا گیا ہے اور ظالم بھی لعنت کا مستحق ہے تو کیا اس کا نکاح بھی امساک ضراراً کی وجہ سے ختم ہو جائے گا اور وہ بدکاری کا مرتکب کہا جائیگا، غرض مستحق لعنت ہونا اور صحت نکاح دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور اسی لئے حضرت عمر کے سامنے جب ایسا ہی معاملہ شرط والا پیش آیا تو آپ نے محلل کے نکاح کو درست قرار دیا اور اس کی مرضی دیکھ کر اس کو طلاق دینے سے بھی روک دیا تھا (کنز العمال ۷/۱۵۰ و نیل الاوطار ۶/۲۴۹) اگر وہ نکاح درست نہ ہوتا تو حضرت عمرؓ اس کو کیوں باقی رہنے دیتے کتب تفسیر وحدیث وفقہ میں اس مسئلہ کی پوری تفصیل دیکھی جاسکتی ہے، جس سے حدیث لعن اللّٰہ المحلل وغیرہ کے مطالب صحیح بھی معلوم ہو جائیں گے، اور اعلاء السنن ۱۴۷/۱۱ میں بھی اس کی قدرِ ضرورت بحث آگئی ہے لہذا تفہیم القرآن ۶ ۱۷۷ میں جو ایسے نکاح کو باطل کہا ہے وہ مذہب امام مالکؒ کا ہے، حنفیہ اور شافعیہ کا نہیں ہے، علامہ مودودی کہیں تو بہت سے اقوال نقل کر دیتے ہیں اور کہیں اپنی پسند کا کوئی قول کسی مذہب کا، بغیر تصریح اُس مذہب کے ذکر کرتے ہیں، گویا فقہی مسائل کی رو سے آپ کی تفسیر "اہل حدیث" کی تفسیر کہلائی جانے کی زیادہ مستحق ہوگئی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم! ھذا ما عندنا والعلم عند اللہ

[۲] حیرت ہے کہ صحابہ تابعین، وائمہ اربعہ مجتہدین کے مقابلہ میں متاخرین کو محققین سے تعبیر کیا گیا، ان حضرات کے محققین ہونے پر اعتراض نہیں، بلکہ اس موقع پر مقابلہ میں یہ لفظ ذرا غیر موزوں محسوس ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم! "مؤلف"

[۳] ان کے علاوہ خود حافظ ابن تیمیہؒ کے جد امجد ابو البرکات مجد الدین عبدالسلام بن تیمیہ حرانی حنبلیؒ مؤلف منتقی الاخبار نے اپنی کتاب المحرر میں لکھا کہ ایک طہر یا زیادہ میں، دو یا تین طلاق ایک کلمہ سے یا چند کلمات کے ذریعہ بغیر مراجعت کے دے گا تو وہ سب واقع اور مطابق سنت ہوں گی، لیکن حافظ ابن تیمیہؒ نے اس کے مقابلہ میں یہ نقل کیا کہ وہ فتویٰ میں تین کو ایک ہی بتلاتے تھے۔ (الاشفاق)

نہایت مداح اور ہزاروں مسائل میں متبع بھی ہیں، پھر صحابہ میں سے کچھ کی تائید ان کو ملی ہے تو حضرت ابن عباسؓ سے اور وہ بھی بروایت طاؤس جس کو امام احمد جیسے جلیل القدر امام حدیث و رجال نے رد کر دیا ہے، اور سب سے بہتر جواب اس کا یہ ہے کہ ابوداؤد میں یہی روایت طاؤس ہی کے ذریعہ سے دوسرے طریقہ پر مروی ہے اور اس میں سوال مطلق تین طلاقوں کا نہ تھا، بلکہ قبل رخصتی تین طلاق دینے کا تھا جس کے جواب میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک طلاق پڑے گی، باقی بیکار ہوں گی، کیونکہ رخصتی سے قبل شوہر کو صرف ایک ہی طلاق دینے کا حق ہے، پھر چونکہ اس مطلقہ پر عدت بھی نہیں ہے، اس لئے بعد کو بھی نہیں دے سکتا، اور اسی کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ سے عہد نبوت و عہد صدیقی وابتداءِ خلافت عمرؓ کے دستور کا بھی سوال کیا گیا تھا کہ کیا اس وقت بھی ایک ہی سمجھی جاتی تھی تو انھوں نے کہا کہ ہاں! اسی طرح تھا، گویا سوال بھی مقید تھا اور جواب بھی، جو روایتِ مسلم میں مطلق یا مختصر و نامکمل نقل ہوا ہے، اور اسی وجہ سے شبہات و وساوس، اور بحث و نظر کا دروازہ متاخرین کے لئے کھل گیا اور نہ جو بات حنفقدمین وسلف سے طے شدہ آ رہی تھی، اس کے اندر بحث و کلام کا کیا موقع تھا؟! ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس میں فرمایا تھا کہ اگر حافظ ابن تیمیہؒ امام طحاوی کی پیش کردہ بحث و تحقیق کی طرف توجہ فرماتے تو وہ بات نہ کہتے جو کہہ گئے (العرف ۱۱۱۲)

حضرتؒ نے حافظ ابن قیمؒ کا ذکر نہیں کیا، شاید اس لئے کہ ان سے انصاف کی توقع زیادہ نہ ہوگی، کیونکہ ہم نے پہلے لکھا بھی تھا کہ مسائل فقہیہ کی جانچ پرکھ کے لحاظ سے ان دونوں بڑوں میں بڑا فرق ہے اور اہل ظاہر کے شدید تعصب سے تو اتنی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس اہم ترین مسئلہ کی بحث تو اپنے موقع پر آئے گی، اتنا اور عرض کرتا ہوں کہ اس مسئلہ میں مذاہب کی تفصیل محقق عینی نے عمدہ ۲۳۳/۳۳ میں اچھی کی ہے حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۱۸۹/۹ تا ۲۹۳/۹ محققانہ محدثانہ طویل بحث کی ہے امام طحاویؒ نے اپنی طرز میں مدلل لکھا ہے اور آخر میں علاء السنن ۱۰۰/۱۱ تا ۱۲۳/۱۱ کی مکمل و مفصل بحث و تحقیق اور حافظ ابن قیم کے دلائل پر پورا نقد و تبصرہ قابل مطالعہ ہے، نیز اعلاء السنن جلد ۱۱ کے آخر میں علامہ کوثریؒ کے رسالہ ''الاشفاق علی احکام الطلاق'' کا معتدبہ حصہ نقل کر دیا گیا ہے، جس میں علامہ نے حسب عادت احقاقِ حق بطور ''حرف آخر'' کر دیا ہے۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء!

نساء اہل کتاب سے نکاح کا مسئلہ

حضرت حذیفہؓ نے مداین جا کر ایک یہودی عورت سے نکاح کیا، حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو انھیں لکھا کہ اسے علیحدہ کر دو، انھوں نے جواب دیا کہ اگر وہ میرے لئے حرام ہے تو میں علیحدہ کر دونگا آپ نے لکھا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تمہارے لئے حرام ہے لیکن میں تمہیں قسم دلاتا ہوں کہ تم اس کو میرا خط ملتے ہی فوراً علیحدہ کر دو، کیونکہ مجھے ڈر ہے مسلمان تمہاری تقلید کر کے اہل ذمہ کی عورتیں پسند کرنے لگیں گے، اور وہ حسین بھی ہیں، اس سے اندیشہ ہے کہ مسلمان فتنہ میں پڑ جائیں گے (ازالۃ الخفاء ۲۰۹) اس سے حضرت عمرؓ نے یہ اثر دیا کہ مسلمان کفار خصوصاً نساءِ کفار سے غیر معمولی تعلق و ارتباط پیدا نہ کریں، کیونکہ اس سے اسلام و شریعتِ مقدسہ کے بہت سے احکام مداہنت کی نذر ہو جاتے ہیں، گویا جواز کا درجہ وقت ضرورت و خاص حالات کے لئے ہونا چاہیے، جب کسی قسم کا بھی دینی ضرر کا اندیشہ نہ ہو، یہ ہر قسم کے دینی ضرر سے مسلمانوں کو بچانے کا بے پناہ جذبہ خاص طور سے حضرت عمرؓ کے اندر پایا جاتا تھا، کیونکہ آپ کا مزاج، مزاجِ نبوت سے بہت قریب تھا۔

بیع امہات الاولاد کو روکنا

ہدایۃ المجتہد ۳۳۸/۳ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ان باندیوں کی بیع کو حرام و ناجائز قرار دیدیا تھا، جن کے مالکوں سے اولاد ہوئی ہو، اور یہی حضرت عثمانؓ نے کیا، اور یہی قول اکثر تابعین و جمہور فقہائے امصار کا ہے، حضرت عمرؓ سے قبل بعض صحابہ کا اس بارے میں خیال جوازِ بیع کا تھا اور ظاہریہ کا مذہب بھی جواز ہی ہے۔

''رحمۃ الامہ فی اختلاف الائمہ'' ۳۲۲ میں ہے:۔ائمہ اربعہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ امہات الاولاد کی بیع جائز نہیں، اور یہی مذہب سلف وخلف فقہائے امصار کا ہے البتہ بعض صحابہ سے اس کے خلاف نقل ہوا ہے اور داؤد ظاہری نے بھی جائز کہا ہے۔

محقق عینیؒ نے لکھا:۔حضرت عمرؓ نے ایک جملہ میں تین طلاق کو نافذ قرار دیا ہے، اور یہ سارے صحابہ کی موجودگی میں کیا کسی نے آپ کے اس عمل پر اعتراض نہیں کیا، یہی سب سے بڑی دلیل اس امر کی ہے کہ اس سے پہلے جو کوئی دوسری صورت سمجھی جاتی تھی، اس کو سب ہی نے منسوخ اور نا قابلِ عمل سمجھا ہے، اسی طرح اور بھی بعض دوسری چیزیں تھیں، جن کو عہد نبوی میں دوسرے طریقہ پر سمجھا جاتا تھا اور حضور علیہ السلام کے بعد صحابہ کرام نے ایک خاص صورت طے کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے نافذ کر دیا، ان ہی چیزوں میں سے تدوین دواوین، عدم جواز بیع امہات الاولاد، اور توقیتِ حدخمر بھی ہے کہ اس سے قبل مقرر نہ تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہؓ کے سامنے ضرور کوئی ایسی نص آئی جس کی روشنی میں سب نے متفق ہو کر حضرت عمرؓ کی بات قبول کی اور اجماع کی صورت منعقد ہوئی، اور اجماعِ صحابہ کا درجہ خبرِ مشہور سے بھی زیادہ قوی ہے، کیونکہ کسی ایک صحابی جلیل القدر سے بھی نصوصِ شرعیہ کی مخالفت متصور نہیں چہ جائیکہ سارے صحابہ کسی امر پر متفق ہوں اس سے یہی بات واضح ہے کہ انھوں نے کسی سنتِ رسول اللہ علیہ کے اتباع میں ایسا کیا ہوگا الخ (عمدہ ۲۳۳،۲۳۳) اور اسی لئے تمام ائمہ مجتہدین نے بھی حضرت عمرؓ کے ایسے اجماعی فیصلوں کو قابلِ عمل قرار دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

حدِ شرب خمر اسی کوڑے مقرر کرنا

ہدایۃ المجتہد ۱/۳۸۱ میں ہے:۔جمہور کے نزدیک شراب پینے کی سزا اسّی کوڑے ہیں، صرف امام شافعی، ابوثور، اور داؤد ظاہری نے چالیس کا قول کیا ہے، جمہور کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کے مشورہ سے اسی کوڑوں کی حد مقرر فرمادی تھی، اس سے پہلے عہد نبوی یا عہدِ صدیق اکبرؓ میں چالیس کوڑے لگے تھے۔

رحمۃ الامہ ۲۸۷ میں ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمدؒ کے راجح قول میں ۸۰ کوڑوں کی سزا ہے امام احمد سے دوسری مرجوح روایت اور امام شافعیؒ کی رائے چالیس کوڑوں کی ہے موافقات مذکورہ کے علاوہ قیاس کا اصول مقرر کرنا، فرائض میں عول کا مسئلہ بتلانا، اذان فجر کے لئے ''الصلوۃ خیر من النوم'' کی تعیین کرانا، وقف کا طریقہ تلقین کرنا، نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرانا، وغیرہ بھی ہیں، اب ہم حسبِ وعدہ حضرت عمرؓ کے ملفوظاتِ مبارکہ نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں اور شاید اسی ذکرِ مبارک پر یہ جلد ختم بھی ہوجائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ وبہ نستعین!

ارشادات امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ!

(۱) فرمایا:۔جو شخص مسلمانوں کے کام میں کچھ بھی اختیار رکھتا ہو، اسے اللہ کے دین کے متعلق حق بات کہنے میں کسی کی ملامت سے نہیں ڈرنا چاہیے، اور جو شخص مسلمانوں کے کام اور ان کی حکومت سے بالکل بے تعلق ہو، اسے لازم ہے کہ بس اپنے نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو اور اپنے حاکم کی خیر خواہی کرتا رہے۔ (ازالۃ الخفاء ۱/۱۳۸)

(۲) فرمایا:۔اللہ تعالیٰ کے حکم کو وہی شخص قائم کر سکتا ہے، جو نہ مزارعت (کھیتی باڑی) کا کام کرتا ہو، نہ مصانعت (صنعت وحرفت کا پیشہ) کرتا ہو، نہ وہ جو طمعِ مال وجاہ کے درپے ہو، اور اللہ کے حکم کو وہی قائم کر سکتا ہے جس کی ہمت پست نہ ہوئی ہو اور امرِ حق میں اپنی جماعت کے لوگوں کی رعایت نہ کرے۔

(۳) فرمایا:۔کسی حق دار کا حق اس درجہ تک نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں بھی اس کا لحاظ کیا جائے، اور بیت المال میں تین امور کی رعایت ضروری ہے، حق کے موافق لیا جائے، حق کے ساتھ خرچ کیا جائے اور ناحق خرچ سے بچایا جائے۔

(۴) فرمایا:۔ یہ امر (خلافت کا) درست نہ ہوگا مگر ایسی شدت وسختی کے ساتھ جو بغیر جبر وظلم کے ہو اور ایسی نرمی کے ساتھ جو بغیر ضعف کے ہو، (ازالۃ الخفاء ۱۴۴/۱) حکام کو خطاب فرمایا: تم پر حق ہے کہ غائبانہ ہمیں نصیحت کرو اور کار خیر میں ہماری معاونت کرو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم سے زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں ہے اور امام عادل کی حلم ونرمی سے زیادہ رعایا کو نفع پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہے، اسی طرح جہالت سے زیادہ مبغوض اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ رعایا کو امام کے جہل وبے وقوفی سے زیادہ ضرور نقصان پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔
یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ خلافت وہ شخص نہیں کرسکتا جس کے فعل سودخواروں کے افعال کے مشابہ ہوں یا جو شخص نیکی معاوضہ کے لئے کرتا ہو یا جو طامع وحریص ہو اور خلافت وہی شخص کرسکتا ہے جو تیز مزاج بھی ہو کہ امر حق میں اپنے گروہ پر بھی مؤاخذہ کرنے سے نہ چوکے (ازالۃ الخفاء ۱۶۹/۱)

(۵) حضرت عمرؓ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو آپ کے استقبال کے لئے امیر مکہ حضرت نافع بن علقمہؓ اپنی جگہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیؓ کو قائم مقام کرکے مکہ معظمہ سے باہر آئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ تم نے ایک غلام کو اتنا بڑا رتبہ کیسے دے دیا کہ اسے اہل مکہ قریش اور اصحاب رسول علیہ السلام پر حاکم کردیا؟ حضرت نافع نے کہا کہ ان کو میں نے کتاب اللہ کا پڑھنے والا سب سے اچھا اور دین کی سمجھ زیادہ رکھنے والا پایا، اس لئے ترجیح دی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم نے ایسا کیا تو تمہاری رائے صحیح ہے، بیشک اللہ تعالیٰ قرآن مجید اور دینی برتری کی وجہ سے کچھ لوگوں کو بلند کریگا، اور کچھ کو اس کی تعظیم نہ کرنے اور دین سے غفلت برتنے کی وجہ سے پست کرے گا۔ (ازالۃ الخفاء ۱۴۱/۱)

(۶) حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے آگے بڑھنے والوں کو طلب کیا تو سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے آپ کو پیش کیا، اور پھر حضرت سعد وسلیط آگے آئے تو آپ نے ابوعبیدہ کو ہی امیر لشکر بنادیا، لوگوں نے کہا کہ آپ نے صحابہ کو چھوڑ کر ابو عبیدہ کو امیر بنادیا تو آپ نے فرمایا:۔ میں کیا کروں، جب تم لوگ سوچتے ہی رہے اور انھوں نے پہل کی، میں تو سبقت والے کو ہی امیر بناؤں گا، پھر ابوعبیدہ کو حکم فرمایا کہ صحابہ کی بات سُنیں اور ان کے مشورہ سے کام کریں، کسی معاملہ میں جلد بازی بھی نہ کریں، لڑائی کوئی کھیل نہیں ہے، اس کا بہتر انتظام وہی کرسکتا ہے جو بہت ٹھنڈے مزاج کا ہو، موقع شناس اور محتاط بھی ہو (طبرانی ۱۶۱/۴)

(۷) فرمایا:۔ مجھے حضرت ابوبکرؓ کی کبھی کوئی بات اس کے سوا ناپسند نہیں ہوئی کہ وہ حضور علیہ السلام کے بعد مجھے خلیفہ بنانا چاہتے تھے، خدا کی قسم اگر میں بلاقصور قتل کردیا جاؤں تو وہ میرے نزدیک اس سے اچھا ہے کہ ایسی قوم پر سردار بنایا جاؤں جس میں ابوبکرؓ موجود ہوں (ازالہ ۱۴۲/۱)

(۸) حضور علیہ السلام کی وفات سے اگلے روز منبر پر بیٹھ کر فرمایا:۔ میری آرزو تھی کہ رسول خدا علیہ السلام کچھ دن اور زندہ رہتے اور ہم سب ان کے سامنے وفات پاتے، تاہم آپ کے تشریف لے جانے سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اس نور کو باقی رکھا، جس سے حضور علیہ السلام نے بھی تمہیں روشنی وہدایت پہنچائی تھی، دوسرا فضل خدا کا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر حضور علیہ السلام کے یار، اور ثانی اثنین، تم میں موجود ہیں، لہٰذا تم سب اٹھو اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرو۔ (ازالہ ۱۴۲/۱)

(۹) فرمایا:۔ کاش! میرے سارے اعمال عمر بھر کے حضرت ابوبکرؓ کی ایک رات اور ایک دن کے برابر ہوسکتے، رات تو وہ جو انھوں نے حضور علیہ السلام کی رفاقت میں غار ثور کے اندر گزاری، اور دن وہ جس میں حضور علیہ السلام کے بعد مرتدین سے قتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ (ازالۃ الخفاء ۱۴۳/۱)

(۱۰) حضرت عمرؓ نے خود خلیفہ ہوکر فرمایا:۔ اگر میں جانتا کہ اس موقع پر دوسرا شخص مجھ سے زیادہ اس بار خلافت کو اٹھانے کی قوت رکھتا ہے تو میرے نزدیک یہ آسان تھا کہ میری گردن ماردی جاتی لیکن اس کی موجودگی میں خلافت کو قبول نہ کرتا۔ (ازالۃ الخفاء ۱۴۶/۱)

(۱۱) مقام جابیہ میں فرمایا:۔ جس طرح میں اب تمہارے سامنے کھڑا ہوں، اسی طرح حضور نے ہمیں خطاب کرکے فرمایا تھا کہ میرے

صحابہ کی تعظیم کرنا، پھران لوگوں کی جو صحابہ کے بعد ہوں، پھران کی جوان کے بعد ہوں، اس کے بعد جھوٹ کا رواج عام ہوگا۔

جس کو جنت کی خواہش ہو وہ جماعت کے ساتھ رہے کیونکہ شیطان تنہا آدمی پر قابو پالیتا ہے جو کوئی مرد غیر عورت کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے گا تو وہاں تیسرا شیطان ہوگا، جس شخص کو نیک کام کرنے میں خوشی ہو اور بُرے کام سے رنج ہو تو وہ مومن ہے (ازالۃ الخفاء ۲۶۳/۱)

(۱۲) وفات سے قبل بطور وصیت حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: مجھ پر بیت المال کا اسی ہزار درم قرض ہے، اس کو میری جائداد[1] فروخت کر کے ادا کر دینا، اگر اس سے پورا نہ ہو تو بنی عدی سے لینا، یا پھر قریش سے، ان کے سوا کسی سے مدد نہ لینا حضرت ابن عمرؓ نے اداءِ قرض کی ذمہ داری لی اور اس پر اہل شوریٰ اور انصار کو گواہ بنایا، پھر دفنِ حضرت عمرؓ کے بعد ایک ہفتہ کے اندر ہی قرضہ کی رقم ادا کر کے بے باقی کی سند حاصل کرلی۔ (کنز العمال ۳۶۳/۲)

ازالۃ الخفاء ۱۵۱/۳ میں ہے کہ یہ رقم وہ تھی جو اپنی اور اولاد کی کفالت کے سلسلہ میں بیت المال سے لی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کو بھی گوارہ نہ کیا اور وصیت کے ذریعہ بیت المال کو واپس کردی، اور دنیا سے پاک وصاف مثل اپنے صاحبین کے رخصت ہوئے۔ خلاصۃ الوفا و حاشیہ موطا امام محمدؒ میں ہے کہ آپ کے قرضہ کی یہ رقم مذکور آپ کا وہ مکان فروخت کر کے ادا کی گئی جو مسجد نبوی کے باب السلام اور باب الرحمۃ کے درمیان تھا، پھر مدت تک یہ مکان دار القضاء کے نام سے مشہور رہا (الفاروق ۱۴۴/۱)

یہ بھی صحیح بخاری اور خلاصۃ الوفاء میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خیبر کی آراضی، ثمغ نامی اور یہودِ بنی وارثہ والی آراضی، دونوں خدا کے نام پر وقف کردی تھیں، شروطِ وقف میں لکھ دیا تھا کہ ان آراضی کو نہ فروخت کیا جائے گا نہ ہبہ کیا جائے، نہ وراثت میں منتقل ہوں گی اور ان کی آمدنی فقراءِ، ذوی القربیٰ، غلاموں، مسافروں، اور مہمانوں پر صرف[2] ہوا کرے گی۔ (الفاروق ۱۴۴/۱)

(۱۳) فرمایا:۔ پرہیزگاری کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی روشنی بناؤ، اور جان لو کہ بغیر نیت کے عمل کا کوئی ثمرہ نہیں اور جس کی نیکی نہیں، اس کے پاس اجر نہیں، جو شخص نرمی نہیں کرتا وہ مفلس ہے اور جس کے پاس اخلاق نہیں وہ بے نصیب ہے۔ (ازالہ ۲۷۳/۱)

(۱۴) آیت ایود احدکم ان تکون لہ جنۃ من نخیل کی تفسیر میں فرمایا:۔ جس طرح انسان بحالتِ کبرسنی وکثیر العیالی جنت وباغ جائداد کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح وہ قیامت کے دن عمل کا محتاج ہوگا (کہ وہی اس کے جنتِ اُخروی کے باغ و بہار بنیں گے (ازالہ ۲۷۴/۱)

(۱۵) فرمایا:۔ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ (۱) وہ عورت جو مسلمہ، عفیفہ، نرم مزاج، صاحب محبت و دردمند، اور صاحب اولاد ہو، اہل خانہ کو زمانہ کے مقابلہ میں مدد دے، نہ کہ زمانہ کو مدد دے اہل خانہ کے خلاف، مگر ایسی عورتیں کم ہیں۔ (۲) وہ جو صرف صاحب اولاد ہو، دوسری مذکورہ خوبیاں اس میں نہ ہوں۔ (۳) وہ عورت ہے جو صرف طوق گردن کا حکم رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی گردن میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔ (ازالہ ۲۸۶/۱)

---

[1] حضرت ابوبکر صدیقؓ پر بھی بیت المال کا چھ ہزار درم وظیفہ خلافت لینے کی وجہ سے قرض ہوگیا تھا، اور آپ نے بھی وصیت کی تھی کہ جائداد فروخت کر کے ادا کردیا جائے، نیز فرمایا تھا کہ خلافت کے بعد جو مال میرے پاس زائد ہوا ہو وہ بھی بیت المال کو دیدیا جائے، چنانچہ ایک غلام، ایک لونڈی اور دو اونٹنیاں دیدی گئیں (خلفائے راشدین ۸۳ بحوالہ طبقات ابن سعد و خلافت راشدہ ۹۴ بحوالہ محاضرات الخضری)

[2] ہمارے اس دور میں چونکہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں غیر محتاط باتیں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس سے حضرت عمرؓ ایسے جلیل القدر صحابی بھی نہ بچ سکے، چنانچہ ایک پروفیسر صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ حضرت عمرؓ کی آمدنی باغات اور فارموں اور مفت راشن کی ملا کر چالیس ہزار سالانہ تھی، پھر یہ عظیم آمدنی وہ کہاں خرچ کرتے تھے، اس کا قطعی جواب دینا مشکل ہے، ہمیں شرح نہج البلاغہ سے معلوم ہوا کہ وہ یہ آمدنی اپنے لڑکے لڑکیوں کے شادی بیاہ اتفاقی اخراجات (جائدادوں کی دیکھ بھال کے مصارف) اور رشتہ داروں کی ضرورت مندوں پر صرف کرتے تھے اوّل تو نہج البلاغہ یا اس کی شرح کو پیش کرنا ہی پروفیسر صاحب کی علمی پرواز کو بتلا رہا ہے کہ ساری کتب احادیث وسیر وتواریخ چھوڑ کر صرف یہ کتاب ان کو ملی، پھر جو عبارت اس کی نقل کی ہے اس میں نوائب وحقوق کا ترجمہ وہ شادی بیاہ سمجھے اور آگے فقراءٗ، ارامل وایتام کا ترجمہ بالکل ہی اڑا دیا، اسی طرح اور بھی کئی باتیں انھوں نے بہت مغالطہ آمیز اور مضرت رساں لکھی ہیں۔ واللہ المستعان! "مؤلف"

(۱۶)فرمایا:۔سورۂ براءت پڑھواور پڑھایا کرو،اوراپنی عورتوں کوسورۂ نور پڑھاؤ۔(ازالہ ۴۰۸)

(۱۷)فرمایا:۔میرے نزدیک اس شخص جیسا بدنصیب کوئی نہیں جو نکاح کے ذریعہ فضل خداوندی کا طالب نہ ہو،کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ان یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله (۳۲ نور)''اگروہ(نکاح کرنے والے مرد)فقیر ہونگے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کوغنی کردے گا۔''(ازالہ ۴۴۷/۱)

(۱۸)فرمایا:۔اکڑ کراوراترا کر چلنا بجزوقت جہاد کےاورکسی وقت بھی جائز نہیں،قال تعالیٰ وعباد الرحمن الذین یمشون الآیه۔(ازالہ ۴۵۰/۱)

(۱۹)فرمایا:۔عورتوں کولباس فاخرہ نہ پہناؤ،کیونکہ اس سے انھیں باہر نکلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔(ازالہ ۴۵۸/۱)(ازالہ ۲۰۳/۲)

(۲۰)فرمایا:۔لڑکیوں کو بدشکل اور حقیر مردوں سے نکاح کرنے پر مجبور نہ کرو،اس لئے کہ وہ بھی وہی چاہتی ہیں جو تم چاہتے ہو۔

(۲۱)فرمایا:۔باکرہ عورتوں سے شادی کیا کرو،ان کا جسم صاف ہوتا ہے،حمل جلد قبول کرتی ہیں،اورتھوڑے پر قناعت کرتی ہیں(ازالہ ۲۰۳/۲)

(۲۲)فرمایا:۔ایمان باللہ کے بعد کسی کے لئے اچھے اخلاق اور محبت کرنے والی بیوی سے بہتر کوئی خیر و بھلائی نہیں ہے،جس طرح کفر کے بعد بد اخلاق وتیز زبان عورت سے بدتر کوئی شرنہیں،نیز فرمایا کہ بعض عورتیں بہت غنیمت ہوتی ہیں کہ کوئی دنیا کی نعمت ان کا عوض نہیں بن سکتی اور بعض عورتیں اُس طوق کا حکم رکھتی ہیں جو کسی فدیہ سے جدا نہیں ہوسکتا۔(ازالہ ۲۰۳/۲)

(۲۳)فرمایا:۔جو شخص ساری عمر عبادت کرتا رہے لیکن اس کے دل میں اولیاء اللہ کی دوستی اور دشمنانِ خدا کی دشمنی نہ ہو تو اس کی عبادت کچھ نفع نہ دے گی۔(ازالہ ۳۵۶/۲)

(۲۴)فرمایا:۔اہل عرب!تم دنیا میں سب سے کم تر اور سب سے زیادہ ذلیل وحقیر تھے،پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت وسربلندی عطا کی،لہذا جب کبھی بھی تم اصولِ اسلام سے ہٹ کر عزت حاصل کرنے کی کوشش کروگے اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کرے گا۔(حیاۃ الصحابہ ۶۸۷/۳)

(۲۵)حضرت شریح کولکھا:۔جب کوئی امر پیش آئے تو کتاب اللہ سے فیصلہ کرو،پھر حدیث سے،پھر اجماع سے،اس کے بعد اپنی رائے سے(ابن عبدالبر فی العلم ۵۶/۲)

حضرت عمرؓ کی ہدایات ووصایا بہ کثرت ہیں جو ازالۃ الخفاء اور حیاۃ الصحابہ مولفہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ وغیرہ میں بہ کثرت ذکر ہوئی ہیں،ان کو ایک جگہ کرکے شائع کردیا جائے تو نفع عظیم حاصل ہو،افسوس ہے ہم قلتِ گنجائش کی وجہ سے زیادہ نقل نہ کرسکے۔

(ضروری فائدہ!) حضرت اقدس مولانا تھانویؒ نے فرمایا:۔صحابہ کرامؓ بلا واسطہ رسول اللہ ﷺ حق تعالیٰ کے فیوض حاصل نہیں کرسکتے تھے،اسی طرح بعد کے لوگ صحابہ کرام تک واسطوں کے محتاج ہیں،رہا حضرت عمرؓ کی رائے کا توافق بالوحی ہونا،جس سے تلقی فیض بلاواسطہ رسول علیہ السلام متوہم ہوتی ہے،تو یہ بڑا اشکال ہے کہ جو بات رسول کے ذہن میں بھی نہ تھی اس کو حضرت عمرؓ نے بتلادیا،اس کا جواب اہل ظاہر نے تو یہ دیا کہ غیر نبی کو بھی نبی پر فضل جزوی ہوسکتا ہے،لیکن اصل جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی وہ علم حضور علیہ السلام ہی کے واسطے سے حاصل ہوا تھا،اور وہ شق بھی حضور کے ذہن میں تھی،مگر بعض دفعہ! اقتضاءِ وقت کے لحاظ سے حضور علیہ السلام کی نظر ایک طرف زیادہ ہوتی تھی،اور دوسری طرف نہ ہوتی تھی حضرت عمرؓ کے اندر مشکوٰۃ نبوت ہی کے انوار وبرکات تھے،جن کی وجہ سے وہ شق حاضر ہوگئی،جس کو توافق بالوحی ہوگیا،لہذا وہ بھی حضور علیہ السلام ہی کی رائے تھی،فافہم وتذکر(ملحوظات وملفوظات ۱۱/۶)!

والحمدالله اولاوآخرا،ربه قدتم القسط الثانی عشر من انوارالباری شرح صحیح البخاری،
سبحانک اللهم وبحمدک اشهدان لا اله الا انت استغفرک واتوب الیک

چند تبصرے

''دارالعلوم'' دیوبند! مولانا احمد رضا صاحب بجنوری جو رئیس المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں، کئی سال سے بخاری شریف کی اردو شرح لکھ رہے ہیں اور بڑی محنت وکاوش اور پوری دیدہ ریزی کے ساتھ یہ عظیم خدمت انجام دے رہی ہیں، آپ نے اپنی اس شرح میں متقدمین ومتاخرین تمام محدثین کے اقوال اور مباحث کی تحقیق سمودینے کی کوشش کی ہے اور بحمداللہ اس میں کامیاب بھی ہیں، فتح الباری، عمدۃ القاری، کرمانی، تیسیر الباری، ارشادالساری، لامع الدراری، فیض الباری اور دوسری شروحِ حدیث کا عطر کشید کر کے آپ نے اس شرح میں بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے، علماءِ دیوبند جو سوسال سے علم حدیث میں پوری دنیا میں اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں اور کہنا چاہیے کہ علم حدیث کا درس اس شان کا سوسال سے دنیا کے کسی خطہ میں موجود نہیں، مولانا احمد رضا صاحب نے ان تمام اکابر علماءِ دیوبند کی درسی تقریروں کا خلاصہ بھی اس شرح میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت کشمیری، حضرت مدنی اور دوسرے علماءِ عصر کی تحقیقات بھی آپ کے سامنے ہیں اور دورانِ تصنیف میں آپ نے سب سے استفادہ کیا ہے خیال ہے کہ مستقبل میں بخاری کی یہ اردو شرح وہی حیثیت اختیار کرے گی جو کسی زمانہ میں فتح الباری وعمدۃ القاری کو حاصل تھی، اس لئے کہ نوجوان علماءِ سہل پسندی، ضعفِ استعداد اور ذوقِ مطالعہ سے محرومی کی وجہ سے عربی تصنیفات کے مطالعہ سے دور ہوتے جارہے ہیں بلکہ گریز کرنے لگے ہیں، مؤلف اپنی اس علمی خدمت پر مستحق مبارکباد ہیں، اور اردو حلقہ اس سلسلہ میں مولانا کا جس قدر بھی شکریہ ادا کرے کم ہے۔

''بینات'' کراچی! مؤلف انوارالباری کی یہ سعادت ہے کہ انھیں نہ صرف امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ حاصل ہے بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ ہے اور ان ہی افادات کی روشنی میں ''انوارالباری'' کی تدوین فرما رہے ہیں، کتاب میں مندرجہ ذیل امور کا التزام کیا گیا ہے (۱) تراجم بخاری کی تشریح (۲) حدیث سے متعلقہ تمام مباحث کی تفصیل (۳) شروح حدیث بالخصوص فتح الباری وعمدۃ القاری کی تلخیص (۴) بدر وشہاب کے درمیان محاکمہ (۵) معاصر شروح حواشی وتعلیقات پر نقد (۶) دلائل حنفیہ کا استقصاء (۷) حضرت شاہ صاحبؒ کے حدیثی، فقہی، کلامی، ادبی وتاریخی افادات کا حسب موقع اہتمام وغیرہ، یہ عظیم کتاب جس شغف ومحنت سے لکھی جارہی ہے خدا کرے اسی نہج پر پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو یہ اردو شروحِ حدیث میں سب سے جامع اور مفصل کتاب ہوگی، واللہ الموفق!

''صدق جدید'' لکھنو! اس شرح (انوارالباری) کے سابق حصوں کا تعارف ان صفحات میں آچکا ہے۔

جدید دونوں حصے (۸و۹) بھی اُسی شان اور اُسی معیار کے ہیں، حدیث کا اردو ترجمہ اور تمام متعلقہ بحثیں بھی اردو میں ملیں گی، کتاب محض حدیث پر نہیں، حدیث پر فقہ حنفی کی روشنی میں ہے، خدا معلوم جزئیات اور پھر جزئیات در جزئیات کتنے نکلتے چلے آئے ہیں، اور ہر بحث تحقیق کیا معنی حدِ تدقیق تک پہنچ کر رہی ہے، مولانا احمد رضا قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے استاد علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے علوم کو وقف عام کر دیا ہے (دوسری جگہ لکھا):۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب تھے کہ انھیں شاگرد بڑے سعید ملے، ہندوستان میں مولانا سید احمد رضا بجنوری اور پاکستان میں مولانا یوسف بنوری کے نام تو نمایاں ترین ہیں اور باقی دوسرے اور حضرات اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔